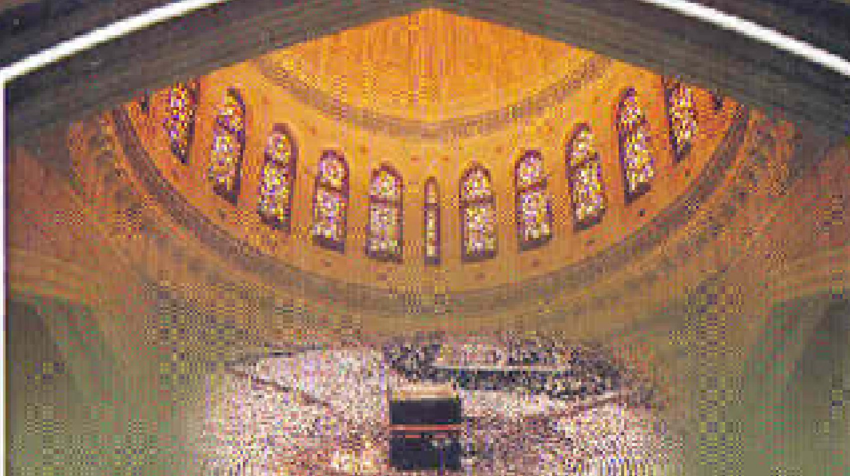


اسلام کا قانونِ زکوٰۃ و عشر

اور

نظامِ مالیات پر شبہات کا جواب

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ

مکتبہ لدھیانوی

اسلام کا قانون زکوٰۃ و عشر

اور

نظامِ مالیات پر شبہات کا جواب

شہیدِ اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ

مکتبہ لدھیانوی

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جس میں عبادات، معاملات، قومی اور نجی امور و معاملات کو نہایت واضح اور خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

بلاشبہ اسلام میں پیدائش سے موت اور مابعد الموت تک کے تمام احکام کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کی گئی ہے، اور واضح کیا گیا ہے کہ بچے کی ولادت کے بعد اس کے داہنے کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہی جائے، کسی نیک، صالح اور بزرگ سے اس کی تحنیک کرائی جائے، اس کا اچھا سا نام رکھا جائے، جب بولنے لگے تو اس کو کلمہ اسلام سکھلایا جائے، اس کی اچھی تربیت کی جائے، اسے کھانے اور پینے کے آداب سکھلائے جائیں اور بتلایا جائے کہ داہنے ہاتھ سے، اپنے سامنے سے اور بسم اللہ پڑھ کر کھائے، بیٹھ کر اور تین سانس میں پانی پیئے، اس کو حق اور سچ کی تلقین کی جائے، سات سال کا ہو جائے تو اس کو نماز کا حکم کیا جائے، اگر دس سال کا ہو جائے اور نماز نہ پڑھے تو تنبیہاً اسے مارا بھی جا سکتا ہے، جب دس سال کا ہو جائے تو اس کا بستر الگ کر دیا جائے، اسے بڑوں اور چھوٹوں کے حقوق و آداب سکھلائے جائیں، اسے خوب دینی تعلیم سے آراستہ کیا جائے، خالق و مخلوق کے حقوق کی تعلیم کے علاوہ عبادات و معاملات پر بھی تمام احکام سکھلائے جائیں، پانچ وقتہ نماز، رمضان

کے روزوں، حج و زکوٰۃ اور صدقات کے احکام سے روشناس کرایا جائے، اسے والدین، بہن بھائیوں، عزیز و اقارب کے علاوہ پڑوسیوں، حتیٰ کہ جانوروں کے حقوق سے بھی آگاہ کیا جائے، اور جب بالغ ہوجائے تو اچھی جگہ اس کا نکاح کردیا جائے۔

اس کی روح کی بالیدگی کے لئے اسے اہل حق کی مجالس میں لے جاکر اس کی عادات و اطوار کو اسوۂ حسنہ کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔

اسے طمع، لالچ، حرص، آز، بخل، بغض، حسد، کینہ، غرور، تکبر اور ریأ وغیرہ ایسے مہلک امراض و عادات اور اخلاقِ ذمیمہ سے بچنے کی تلقین کی جائے، اسے بتلایا جائے کہ جس طرح انسان اپنے جسم و جان کو طاعات و عبادات میں مشغول رکھ کر قربِ الٰہی حاصل کرسکتا ہے، ٹھیک اسی طرح اپنے مال و اسباب کو حکمِ الٰہی اور منشأ ایزدی میں صرف کرکے مقربِ بارگاہِ الٰہی بن سکتا ہے۔

اس کے دل و دماغ میں یہ بات بٹھادی جائے کہ جس طرح ہمارا جسم و روح عطیۂ الٰہی ہے، ایسے ہی ہمارا مال و اسباب اور دوسری تمام صلاحیتیں بھی اسی کی عطا کردہ ہیں، اگر ان کو منشأ خداوندی کے مطابق استعمال نہ کیا گیا تو نہ صرف اس کا اندیشہ ہے کہ وہ چھینی جاسکتی ہیں، بلکہ وبالِ آخرت کا ذریعہ بھی بن سکتی ہیں۔

اس کو جود و سخا کی عادت ڈالی جائے، صدقات و زکوٰۃ کی ادائیگی اور اس کی اہمیت سے اسے آگاہ کیا جائے، زکوٰۃ کی ادائیگی کے فوائد و منافع سے روشناس کراتے ہوئے ارتکازِ دولت کے نقصانات سے بھی اسے باخبر کیا جائے۔ سب سے بڑھ کر اس کے دل میں مال کی محبت کے بجائے آخرت کی جوابدہی کا احساس و شعور بیدار کیا جائے، اگر کسی مسلمان کی اس طرح تربیت کی جائے تو وہ نہ صرف زکوٰۃ و صدقات کو خوش دلی سے ادا کرے گا بلکہ اپنا پورا مال و اسباب خرچ کرکے بھی نجاتِ آخرت اور رضائے الٰہی کے حصول کو سعادت سمجھے گا۔

لیکن افسوس کہ جن لوگوں کی اس طرح تربیت نہیں کی جاسکی اور بدقسمتی سے

انہوں نے مال و زر کو ہی سب کچھ سمجھ لیا، یا پھر ان کی آخرت کی بجائے دنیا ہی پر نظر تھی تو انہوں نے قارونی سرشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے زکوٰۃ سے جان چھڑانے کے لئے طرح طرح کے حیلے بہانے کئے، کہیں انہوں نے زکوٰۃ کو ٹیکس اور تاوان کا نام دیا، تو کہیں اس کے مقادیر اور نصاب میں شکوک و شبہات پیدا کئے، بلکہ سچ پوچھئے تو ایسے لوگوں نے اسلام کے پورے نظامِ مالیات کو ختم کرنے کی منصوبہ بندی شروع کردی۔ اسی قماش کے لوگوں نے مقالات و مضامین لکھ کر مسلمانوں کو اور اربابِ اقتدار کو نظامِ زکوٰۃ کے نفاذ سے برگشتہ کرنے کی سعیٔ لاحاصل کی۔

اسی طرح جب صدر ضیاءالحق مرحوم نے زکوٰۃ و عشر کے نفاذ کا آرڈی ننس جاری کیا تو اس آرڈی ننس میں موجود خامیوں کے علاوہ، جب دورِ حاضر کے بزرجمہروں نے اسلام کے اس نظام کا حلیہ بگاڑنے کی کوشش کی تو حضرت شہیدؒ نے ان سب کا قرآن و سنت کی روشنی میں بھرپور تنقیدی جائزہ لیا۔

پیش نظر کتاب حضرت شہیدؒ کے انہیں مقالات کا مجموعہ ہے، جس میں زکوٰۃ سے متعلق اس قسم کے لکھے گئے مقالات کا بھرپور جواب اور بہترین تنقیدی تجزیہ ہے، خاص طور پر امام ابوعبید قاسم بن سلامؒ کی ”کتاب الاموال“ کے اردو ترجمہ کے ذیل میں، مترجم جناب عبدالرحمٰن سورتی صاحب نے جو جو موشگافیاں کی ہیں، ان کا خوبصورت انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کو ہمارے حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ کی مغفرت اور رفع درجات اور اس کے مرتب کارکنان کی نجاتِ آخرت اور قارئین کرام کی ہدایت و راہ نمائی کا ذریعہ بنائے، آمین!

خاکپائے حضرت لدھیانوی شہیدؒ

سعید احمد جلال پوری

۵/۱/۱۴۲۲ھ

کے روزوں، حج و زکوٰۃ اور صدقات کے احکام سے روشناس کرایا جائے، اسے والدین، بہن بھائیوں، عزیز و اقارب کے علاوہ پڑوسیوں، حتیٰ کہ جانوروں کے حقوق سے بھی آگاہ کیا جائے، اور جب بالغ ہوجائے تو اچھی جگہ اس کا نکاح کردیا جائے۔

اس کی روح کی بالیدگی کے لئے اسے اہل حق کی مجالس میں لے جاکر اس کی عادات و اطوار کو اسوۂ حسنہ کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔

اسے طمع، لالچ، حرص، آز، بخل، بغض، حسد، کینہ، غرور، تکبر اور ریاؑ وغیرہ ایسے مہلک امراض و عادات اور اخلاقِ ذمیمہ سے بچنے کی تلقین کی جائے، اسے بتلایا جائے کہ جس طرح انسان اپنے جسم و جان کو طاعات و عبادات میں مشغول رکھ کر قربِ الٰہی حاصل کرسکتا ہے، ٹھیک اسی طرح اپنے مال و اسباب کو حکمِ الٰہی اور منشاؑ ایزدی میں صرف کرکے مقربِ بارگاہِ الٰہی بن سکتا ہے۔

اس کے دل و دماغ میں یہ بات بٹھادی جائے کہ جس طرح ہمارا جسم و روح عطیۂ الٰہی ہے، ایسے ہی ہمارا مال و اسباب اور دوسری تمام صلاحیتیں بھی اسی کی عطا کردہ ہیں، اگر ان کو منشاؑ خداوندی کے مطابق استعمال نہ کیا گیا تو نہ صرف اس کا اندیشہ ہے کہ وہ چھینی جاسکتی ہیں، بلکہ وبالِ آخرت کا ذریعہ بھی بن سکتی ہیں۔

اس کو جود و سخا کی عادت ڈالی جائے، صدقات و زکوٰۃ کی ادائیگی اور اس کی اہمیت سے اسے آگاہ کیا جائے، زکوٰۃ کی ادائیگی کے فوائد و منافع سے روشناس کراتے ہوئے ارتکازِ دولت کے نقصانات سے بھی اسے باخبر کیا جائے۔ سب سے بڑھ کر اس کے دل میں مال کی محبت کے بجائے آخرت کی جوابدہی کا احساس و شعور بیدار کیا جائے، اگر کسی مسلمان کی اس طرح تربیت کی جائے تو وہ نہ صرف زکوٰۃ و صدقات کو خوش دلی سے ادا کرے گا بلکہ اپنا پورا مال و اسباب خرچ کرکے بھی نجاتِ آخرت اور رضائے الٰہی کے حصول کو سعادت سمجھے گا۔

لیکن افسوس کہ جن لوگوں کی اس طرح تربیت نہیں کی جاسکی اور بدقسمتی سے

انہوں نے مال و زر کو ہی سب کچھ سمجھ لیا، یا پھر ان کی آخرت کی بجائے دنیا ہی پر نظر تھی تو انہوں نے قارونی سرشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے زکوٰۃ سے جان چھڑانے کے لئے طرح طرح کے حیلے بہانے کئے، کہیں انہوں نے زکوٰۃ کو ٹیکس اور تاوان کا نام دیا، تو کہیں اس کے مقادیر اور نصاب میں شکوک و شبہات پیدا کئے، بلکہ سچ پوچھئے تو ایسے لوگوں نے اسلام کے پورے نظامِ مالیات کو ختم کرنے کی منصوبہ بندی شروع کردی۔ اسی قماش کے لوگوں نے مقالات و مضامین لکھ کر مسلمانوں کو اور اربابِ اقتدار کو نظامِ زکوٰۃ کے نفاذ سے برگشتہ کرنے کی سعیٔ لاحاصل کی۔

اسی طرح جب صدر ضیاؑ الحق مرحوم نے زکوٰۃ و عشر کے نفاذ کا آرڈی نینس جاری کیا تو اس آرڈی نینس میں موجود خامیوں کے علاوہ، جب دورِ حاضر کے بزرجمہروں نے اسلام کے اس نظام کا حلیہ بگاڑنے کی کوشش کی تو حضرت شہیدؒ نے ان سب کا قرآن و سنت کی روشنی میں بھرپور تنقیدی جائزہ لیا۔

پیشِ نظر کتاب حضرت شہیدؒ کے انہیں مقالات کا مجموعہ ہے جس میں زکوٰۃ سے متعلق اس قسم کے لکھے گئے مقالات کا بھرپور جواب اور بہترین تنقیدی تجزیہ ہے، خاص طور پر امام ابوعبید قاسم بن سلامؒ کی "کتاب الاموال" کے اردو ترجمہ کے ذیل میں، مترجم جناب عبدالرحمٰن سورتی صاحب نے جو جو موشگافیاں کی ہیں، ان کا خوبصورت انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کو ہمارے حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ کی مغفرت اور رفعِ درجات اور اس کے مرتب کارکنان کی نجاتِ آخرت اور قارئین کرام کی ہدایت و راہ نمائی کا ذریعہ بنائے، آمین!

خاکپائے حضرت لدھیانوی شہیدؒ

سعید احمد جلال پوری

۱۴۲۲/۱/۵ھ

فہرست

زکوٰۃ ٹیکس نہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کا ایک مراسلہ ۸رجون کے ''مشرق'' لاہور میں شائع ہوا ہے، جس میں انہوں نے زکوٰۃ کی شرح میں اضافہ کی تجویز اپنے مخصوص ''مستشرقانہ'' انداز میں پیش کی ہے، ان کا یہ تمام مضمون بے ربط مغالطوں کا مجموعہ ہے، موصوف کا مفروضہ یہ ہے کہ:

''قرآن کریم یا رسول اللہ (بغیر صلوٰۃ وسلام کے) نے زکوٰۃ کے سوا اور کوئی ٹیکس عائد نہیں کیا، اس لئے زکوٰۃ کے علاوہ اگر اور کوئی ٹیکس عائد کرنے کی ضرورت ہو تو وہ زکوٰۃ ہی میں مدغم کرنا پڑے گا۔''

موصوف کا یہ نظریہ سراسر غلط ہے کہ زکوٰۃ کی حیثیت صرف ایک ٹیکس کی ہے، کون نہیں جانتا کہ زکوٰۃ اسلام کی ایک پاکیزہ عبادت اور ایمان اور نماز کے بعد اسلام کا تیسرا بڑا رکن ہے، صحیحین کی مشہور حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے:

۱:..... کلمہ توحید ورسالت کی شہادت دینا۔

۲:..... نماز قائم کرنا۔

۳:..... زکوٰۃ ادا کرنا۔

۴:..... حج کرنا۔

۵:……رمضان کے روزے رکھنا۔

اس کے علاوہ قرآن وحدیث کے بے شمار نصوص میں اس کی فرضیت، رکنیت اور عبادت ہونے کا اعلان صراحتاً موجود ہے۔

پھر جس طرح نفس زکوٰۃ کی رکنیت ضروریاتِ دین میں سے قرار دی گئی ہے، اسی طرح اس کی مقدار بھی قطعی اور یقینی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آج تک پوری امت کے نزدیک ضروریاتِ دین میں سے کسی کا انکار خواہ تاویل ہی کے رنگ میں کیوں نہ ہو موجب کفر ہے، چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جب منع زکوٰۃ کا فتنہ کھڑا ہوا تو آپؓ نے ان کے خلاف جہاد کا حکم فرمایا، اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر سوال کیا کہ آپؓ ان لوگوں سے جہاد کیسے کرسکتے ہیں جب کہ وہ کلمہ اسلام کے قائل ہیں؟ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پوری بلند آہنگی سے اعلان فرمایا:

> "بخدا! میں ان لوگوں سے لڑوں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کرتے ہیں، اس لئے کہ زکوٰۃ حق مال ہے۔ خدا کی قسم! اگر وہ ایک رسّی بھی روک لیں گے جسے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے تب بھی میں ان سے لڑوں گا۔" (صحیحین بحوالہ مشکوٰۃ شریف ص:۱۵۷)

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے آج تک پوری امت زکوٰۃ کو ایک غیر متبدل فریضہ خداوندی کی حیثیت سے مانتی چلی آئی ہے، اس لئے زکوٰۃ کو ٹیکس قرار دے کر اس میں ترمیم کی سفارش کرنا اسلام کے خلاف کھلی بغاوت اور گہری سازش ہے۔

پھر موصوف نے اس پر بھی غور نہیں فرمایا کہ زکوٰۃ ایک آسمانی فریضہ ہے جو وحی الٰہی سے نافذ کیا گیا، اس کے برعکس ٹیکس مسلم وغیر مسلم حکومتیں محض اپنی رائے سے

نافذ کرتی ہیں، زکوٰۃ کا فریضہ صرف اہل اسلام پر عائد ہوتا ہے جبکہ ٹیکس بلاتخصیص مذہب وملت ہر کافر ومسلم پر ٹھونسا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ فریضہ خداوندی کو انسانوں کے عائد کردہ ٹیکس کے ساتھ گڈمڈ کرنا کسی طرح بھی قرین عقل ودانش نہیں ہوسکتا۔ کیا موصوف سے سوال کیا جاسکتا ہے کہ یہ جامع ٹیکس بنام زکوٰۃ پاکستان کے غیر مسلم باشندوں پر عائد کیا جاسکے گا؟ اور کیا وہ یہ کہہ کر اس کے ادا کرنے سے انکار نہ کریں گے کہ یہ تمہارا مذہبی فریضہ ہے؟ نعوذ باللّٰہ من سوء الفہم!

اسی طرح موصوف کا یہ نظریہ ان کی جہالت یا کم از کم تجاہل کا معصومانہ انداز ہے کہ اسلامی حکومت میں زکوٰۃ کے علاوہ آمدنی کی کوئی مد نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ عشر، خراج، جزیہ، صدقات واجبہ، صدقات نافلہ، فئے، خمس، سرکاری زمینوں کے محاصل، غیر مسلم مال تجارت کے محصول، اوقاف، اموال فاضلہ اور وقتی چندوں کے مختلف عنوانات سے اسلام نے آمدنی کی مدات تجویز کی ہیں جن کے جدا جدا مصارف کتب فقہ میں ملاحظہ فرمائے جاسکتے ہیں، اب اس کا کیا علاج ہے کہ نام نہاد "ادارہ تحقیقاتِ اسلامیہ" کا ڈائریکٹر اسلام کے ان بنیادی حقائق سے بے خبر ہونے کے باوصف مجتہد مطلق کے منصب پر بزعم خود فائز ہے: "برعکس نہند نام زنگی کافور۔"

موصوف نے اپنے نظریہ کی تائید میں صرف ایک واقعہ کا حوالہ دینے کی زحمت گوارا فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

> "رسول اللہ (بغیر صلوٰۃ وسلام کے) کے زمانہ میں گھوڑوں پر زکوٰۃ وصول نہیں کی جاتی تھی (کیونکہ اس زمانہ میں گھوڑوں کی تعداد بہت کم تھی)، لیکن جب عمر بن خطاب کے دورِ خلافت میں گھوڑوں کی فراوانی ہوگئی تو آپ نے ان پر زکوٰۃ وصول کی۔"

(اس مختصر مضمون میں چار جگہ موصوف کے قلم سے "رسول اللہ" کا لفظ نکلا

ہے، لیکن بھول کر بھی وہ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کے لفظ کا اضافہ نہیں کرسکے، اسی سے موصوف کی حسِ ایمان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔)

اس عبارت کو مکرر پڑھئے اور موصوف کے حسن استدلال کی داد دیجئے! وہ صرف اتنی سی بات سے حسب عادت حیرت انگیز نتیجہ نکالتے ہیں:

''گویا حضرت عمر نے ایک چیز زکوٰۃ کے زمرہ میں شامل کرلی جو رسول اللہ کے زمانہ میں اس سے خارج تھی۔''

مزید یہ کہ:

''اس واقعہ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ کوئی اور ٹیکس عائد کرنے کی ضرورت ہو تو اسے بھی زکوٰۃ ہی میں مدغم کرنا پڑے گا۔''

اس سے قطع نظر کہ واقعہ کی اصل نوعیت کیا ہے سوال یہ ہے کہ جب ڈاکٹر صاحب خود ہمیں بتلاتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں گھوڑوں پر زکوٰۃ اس لئے وصول نہ کی جاتی تھی کہ ان کی تعداد کم تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اس لئے وصول کی جاتی تھی کہ ان کی فراوانی تھی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک وقت میں نصابِ زکوٰۃ نہیں پایا جاتا تھا، اور دوسرے وقت میں نصاب زکوٰۃ پایا جانے لگا، اب انہیں خود سوچنا چاہئے کہ ان کا پیدا کردہ نتیجہ کہاں تک صحیح ہے؟ کسی ادنیٰ عقل وفہم کے آدمی سے دریافت کرلیجئے کہ ایک وقت میں کسی چیز کی قلت کی وجہ سے قابل زکوٰۃ نہ ہونے اور دوسرے وقت میں اس کی کثرت کی وجہ سے اس پر زکوٰۃ وصول کئے جانے کا یہ مطلب لیا جاسکتا ہے کہ: ''دوسرے وقت میں ایک ایسی چیز زکوٰۃ کے زمرہ میں داخل کرلی گئی جو پہلے وقت اس سے خارج تھی۔''؟ اب اسے موصوف کی قوتِ حافظہ کا کمال قرار دیا جائے کہ وہ ایک سطر پہلے اپنے ہی قلم سے نکلے ہوئے الفاظ یاد رکھنے سے معذور ہیں، یا ان کی کمالِ ذہانت کا کرشمہ قرار دیا جائے کہ

وہ اپنی عبارت کا بالکل سادہ مفہوم سمجھنے سے بھی قاصر ہیں:

''ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند''

ہمیں حیرت ہے کہ اگر اسی فہم وشعور کے بل بوتے پر ماڈرن اسلام کی تعمیر کے شوق میں بے چارے قدیم اسلام پر مشق فرمائی جاتی ہے، تو خدا ہی حافظ ہے:

گر ہمیں مسٹر وہمیں ریسرچ
کارِ مذہب تمام خواہد شد

اس ضمن میں موصوف نے تفسیری مشق کا ایک نمونہ بھی پیش فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

''۱:......غربا ومساکین کی بہبود۔
۲:......ٹیکس وصول کرنے والوں کی اجرت (یعنی سول سروس)۔
۳:......سیاسی مقاصد کے فنڈ۔
۴:......قوم کی معاشی حالت کو مستحکم کرنا۔
۵:......مواصلات اور ذرائع آمد ورفت۔
۶:......تعلیم کے اخراجات اور دفاع۔''

یہ قرآن کے آٹھ مصارف کی شرح ہے جو آیت: ''اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ ... الخ۔'' میں بیان ہوئے ہیں، موصوف نے دورِ حاضر کے ضعف حافظہ کی رعایت فرماتے ہوئے آٹھ کو چھ میں سمو دیا ہے، ''فی سبیل اللہ'' میں موصوف کے نزدیک حاضر الوقت تعلیم کے کل اخراجات، نیز دفاعی سرگرمیاں شامل ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ماضی قریب میں نغمہ سرائی کے صلہ میں ڈومنیوں کو جو اعزازی تمغے دیئے گئے وہ موصوف کے نزدیک ''فی سبیل اللہ'' کی عملی تفسیریں ہیں۔ لیکن یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ آرٹ اور ثقافت کے نام پر جو اخراجات کئے جاتے ہیں، یا خاندانی منصوبہ بندی

پر جو سرمایہ لگایا جاتا ہے، یا بیرونی ملک کے زائرین کو شراب و کباب اور چنگ و رباب پیش کرنے کے لئے جو رقم درکار ہوگی، اور اسی قسم کے جائز و ناجائز مصارف کے لئے جس روپیہ کی ضرورت ہوگی، نہ جانے موصوف کے نزدیک اسے کس مد میں شامل اور قرآن کے کس لفظ کے تحت داخل کیا جائے گا...؟؟

''کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمہ را''

خدا جزائے خیر دے، خوب کہا اقبال مرحوم نے:

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں!

موصوف کو شدید رنج اور صدمہ ہے کہ:

''فقہ اسلامی کی کتابوں میں شروع سے زکوٰۃ کو معاملات سے ممتاز کرکے عبادات میں کیوں شمار کیا گیا ہے۔''

اور انہیں تعجب ہے کہ:

''یہ امتیاز نہ جانے کہاں سے آیا ہے کیونکہ اس کا ذکر (ان کے بقول) نہ قرآن میں ملتا ہے، نہ سنت نبوی میں۔''

ان کا خیال ہے کہ:

''مسلمان کی پوری زندگی بشرطیکہ وہ اسلامی قدروں کے تابع ہو عبادت ہے۔''

گویا موصوف کے تمام عمر کے مطالعہ قرآن وسنت کا نچوڑ یہ ہے کہ خالص عبادت نام کی کوئی چیز اسلام میں سرے سے موجود ہی نہیں۔ کیا موصوف سے گزارش کی جاسکتی ہے کہ انسانی حاجات (بول و براز وغیرہ) بھی بلاشک عبادت کی اضافی حیثیت اختیار کرلیتی ہیں جبکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی تعلیم کے موافق ہوں، لیکن کیا شرعاً وعقلاً وعرفاً ان کو تلاوت قرآن، نماز، ذکر الٰہی جیسی خالص عبادات کے ہم سنگ قرار دیا جاسکتا ہے؟ معاملات کے اعمال عبادت بن جانے سے

یہ کیسے نکل آیا کہ اسلام میں خالص عبادت کا کوئی شعبہ ہی نہیں؟ موصوف کا یہ فقرہ بڑا اہم ہے، اس سے اس امر کی صاف غمازی ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک نہ صرف یہ کہ زکوٰۃ معاملات سے بالاتر عبادت نہیں بلکہ وہ نماز، روزہ، حج، قربانی اور جہاد وغیرہ کو بھی عبادت تسلیم نہیں کرتے، فالی اللہ المشتکی وھو المستعان!

آخر میں موصوف نے تملیک یا عدم تملیک، محل زکوٰۃ اور نصاب زکوٰۃ میں شاذ قسم کے فقہی اختلاف کی طرف اشارات کرکے شاید یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح ان مسائل میں اختلاف پایا جاتا ہے اسی طرح مقدارِ زکوٰۃ میں اختلاف کیا جاسکتا ہے، اور اسے بھی ہوس کاریوں کا نشانہ بنایا جاسکتا ہے، موصوف کو یہ واضح ہونا چاہئے کہ اس خلط مبحث سے ان کو کوئی فائدہ نہ ہوگا، اول تو یہ اختلاف شاذ نوعیت کے ہیں، پھر وہ ظنی مسائل جن میں قرآن وحدیث یا اجماع سے حکم کا قطعی تعین نہیں ہوا، ان میں مجتہدین کا، جو واقعتاً اجتہاد کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں، فروعی اختلاف ایک فطری امر ہے۔ لیکن مقدارِ زکوٰۃ کا مسئلہ اس نوعیت کا نہیں، اس لئے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آج تک بلا کسی اختلاف کے تواتر کے ساتھ نقل ہوتا چلا آیا ہے اور اس کا ثبوت ایسا قطعی، یقینی اور واضح ہے کہ ہر دور میں امت کے ہر طبقہ نے اسے ضروریاتِ دین کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے۔ جس طرح قرآن مجید نقل متواتر کی وجہ سے ایسا قطعی ہے کہ اس میں ادنیٰ درجہ کے شک وارتیاب کی گنجائش نہیں، اسی طرح مقدارِ زکوٰۃ کی قطعیت میں شک کرنا یا اس میں کمی بیشی کا وسوسہ پیدا کرنا بھی صریح کفر اور ملت اسلامیہ سے خروج کا موجب ہے۔ اس لئے موصوف کو مشورہ دوں گا کہ اپنے ان کفریاتی وساوس سے توبہ کریں اور شریعت مستقیمہ کو اہوا وخواہشات کا نشانہ بنا کر اکبر کا ''دین الٰہی'' تصنیف کرنے کی جرأت نہ کریں اور اپنی عاقبت کی فکر کریں۔ وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون!

انہیں بھول کر بھی یہ خیال نہ لانا چاہئے کہ ملت اسلامیہ ان کی ان دسیسہ

کاریوں کو صبر و تحمل سے برداشت کیے جائے گی، اسلام ایک مضبوط چٹان ہے جو اس سے ٹکرائے گا وہ خود پاش پاش ہوجائے گا، لیکن اسے اپنی جگہ سے ہلا دینے میں کامیاب نہ ہوگا:

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا!

آخر میں صدرِ مملکت سے بصد احترام درخواست کروں گا کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب اپنے خیالات سے توبہ کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو ان کو "ادارہ تحقیقات اسلامیہ" کی صدارت اور "اسلامی مشاورتی کونسل" کی رکنیت سے الگ کیا جائے، ڈاکٹر صاحب جیسے لوگوں سے نہ صرف یہ کہ ملت اسلامیہ کی نظر میں دونوں ادارے مشکوک ہوجاتے ہیں، بلکہ صدرِ محترم کی ذاتی مقبولیت بھی اس سے بری طرح مجروح ہوتی ہے۔ نیز علمائے کرام سے عرض کروں گا کہ جس دین قیم کی حفاظت کے لئے ہمارے اسلاف نے جسم و جان کی تمام صلاحیتیں وقف کردیں، عزت و آبرو کی تمام قربانیاں دے ڈالیں، اسلام پر جب بھی کوئی مشکل وقت آیا وہ: "اینقص فی الدین وانا حی؟" (کیا میرے جیتے جی اسلام میں کمی بیشی کی جاتی رہے گی؟) کا نعرہ لگا کر اپنی تمام بے سروسامانی کے باوجود میدانِ جہاد میں نکل آئے، قید ہوئے، جلا وطن ہوئے، جلادوں کے درّوں کی ضرب سے لہولہان ہوئے، لیکن اسلام کو ہر قیمت پر محفوظ رکھا۔ آج اسلام پھر ایک دفعہ ایثار و قربانی کی دعوت دے کر محافظین اسلام کا امتحان کرنا چاہتا ہے، کیا ہمیں اسے بے یار و مددگار چھوڑ دینا چاہئے؟ ڈاکٹر صاحب کے عقائد، تاویل کی حد سے خارج ہیں، اگر ان کو توبہ کی توفیق نہ ہو تو ان کی شرعی حیثیت واضح فرما کر اسلام کو ان کے وجود سے پاک کیا جائے:

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں!

(ہفت روزہ ترجمان اسلام یکم جولائی ۱۹۶۶ء)

زکوٰۃ کی شرعی حیثیت

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

"مشرق" کے صفحات میں خالد مسعود صاحب کا مراسلہ زکوٰۃ کے موضوع پر نظر سے گزرا، معلوم ہوتا ہے کہ شرح زکوٰۃ میں اضافہ کے مجوزین صرف سطحی دلائل یا سطحی دعووں پر کفایت کرنے لگے ہیں، خالد صاحب لکھتے ہیں:

"مدینہ منورہ میں جب اسلامی معاشرے کی تشکیل ہوئی تو مالیاتی ضرورتوں کے لئے ٹیکس لگانے کی ضرورت پیش آئی، چنانچہ مختلف اشیا پر ٹیکس لگائے گئے، لیکن ان سب ٹیکسوں کے لئے اوائل اسلام کی اصطلاح صدقہ اور زکوٰۃ تھی۔"

زکوٰۃ کو مالیاتی ضرورتوں کے لئے معاشرہ کا نافذ کردہ ٹیکس قرار دینا محض خوش گپی ہے جس کی پشت پر کوئی دلیل نہیں، بلکہ قرآن و حدیث کے نصوص میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے متعلق "ٹیکسی تصور" یا تو دورِ نبوت کے منافقین کا عقیدہ تھا، یا پھر امت جب جاہلیت کی طرف لوٹ جائے گی اور قلوب ایمانی دولت سے بے بہرہ ہونے لگیں گے تو اس وقت یہ نظریہ "جدید تکنیک" کے ساتھ پیش کیا

جائے گا۔

چنانچہ سورہ توبہ میں اس منافق کا تذکرہ موجود ہے جو ثعلبہ کے نام سے مشہور تھا اور اس نے سب سے پہلے زکوٰۃ کو ٹیکس کا نام دیا۔ اس بدبخت کا جو انجام ہوا، اسے تفسیر کی کتابوں میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ (ابن جریر ج:۱۰ ص:۱۸۸)

نیز اسی سورہ میں ان بدوی منافقین کا ذکر بھی آیا ہے، جن کی طرف سے خالد صاحب کا یہی خوبصورت نظریہ دہرایا گیا تھا: "وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا." کی شرح کرتے ہوئے امام ابن جریرؒ رقم طراز ہیں:

"يعني غرما لزمه لا يرجو له ثوابا ولا يدفع به عن نفسه عقابا." (ج:۱۱ ص:۴)

ترجمہ:... "یعنی وہ اسے صرف لازم شدہ ٹیکس قرار دیتا ہے، نہ کہ اس کے ذریعہ حصولِ ثواب کی امید، نہ عذاب ٹل جانے کا یقین۔"

اسی ذیل میں امام ابن جریرؒ نے ان لوگوں کے منافق ہونے کی تصریح ابن زید سے نقل کی ہے: "هولاء المنافقون من الاعراب." نیز حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب امت میں من جملہ دیگر امور کے زکوٰۃ کے ٹیکس ہونے کا نظریہ پیش کیا جانے لگے گا، اس وقت خسف و مسخ اور دیگر پے در پے فتنوں کا انتظار کرنا چاہیے۔ (ترمذی شریف ج:۲ ص:۴۴)

الغرض زکوٰۃ کے متعلق "ٹیکسی نظریہ" یا تو پہلے منافقین کی جانب سے پیش کیا گیا یا آئندہ آنے والے ایمان و عقل سے عاری لوگوں کے متعلق اطلاع دی گئی کہ وہ یہ نظریہ پیش کریں گے، ورنہ ان بدقسمت لوگوں کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر صحابہ کرامؓ، تابعین عظامؒ، ائمہ دینؒ، فقہاؒ اور محدثینؒ کروڑوں کی تعداد میں گزرے ہیں، لیکن کبھی کسی کی زبان و قلم پر یہ نظریہ نہیں آیا۔

خالد صاحب لکھتے ہیں:

"اور تمام فقہی کتابوں میں یہ مختلف ٹیکس ارکانِ اسلام کے ایک رکن زکوٰۃ کے ذیل میں آتے ہیں۔"

جب ان کو بھی بقلم خود یہ اقرار ہے کہ اسلام کا تمام علمی ذخیرہ زکوٰۃ کو رکنِ اسلام قرار دینے پر متفق ہے تو اس "اسلامی رکن" کو ٹیکس کا نام دینا صریح ظلم اور الٹی منطق نہیں تو اور کیا ہے؟

وہ مزید لکھتے ہیں:

"اسلامی معاشرے میں ان ٹیکسوں کو بنیادی ... رکن اور عبادات کا درجہ حاصل تھا۔"

سوال یہی ہے کہ جب زکوٰۃ کو اسلام میں بنیادی رکن کا درجہ حاصل ہے تو خالد صاحب اور ان کے ٹیکسی رفقا اسے ٹیکس کے درجہ علیا پر فائز فرما کر اسلامی بنیادوں کی بیخ کنی پر زور اجتہاد کیوں صرف کرتے ہیں؟ اور جب دینِ قیم میں زکوٰۃ کو بنیادی عبادت کا درجہ حاصل ہے تو پھر اس میں ترمیم و تنسیخ کی تجویز پیش فرما کر خدائی عبادت کو سلاطین کا کھلونا بنا ڈالنے پر کیوں اصرار کیا جاتا ہے؟ کیا انسانی ہوس کاریوں کا تختۂ مشق بننے کے بعد عبادت، عبادت رہ جائے گی؟

اس کے بعد خالد صاحب رقم طراز ہیں:

"ان کی اس منزلت کی وجہ یہ تھی کہ جب تک ادا کرنے والا اپنے ضمیر کے سامنے جوابدہ نہ ہو اور ایک اندرونی طاقت اسے ان ٹیکسوں کی ادائیگی پر مجبور نہ کرے، معاشرہ کا اقتصادی ڈھانچہ قائم نہیں رہ سکتا۔"

ان کا یہ "ٹیکسی فلسفہ" زکوٰۃ کے بارے میں واقعہ کی بالکل غلط تصویر کشی ہے۔ وہ بار بار یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ زکوٰۃ کا نفاذ صرف معاشرے کی

جانب سے تھا، حالانکہ زکوٰۃ کی رکنیت اور فرضیت کی منزلت معاشرے کی جانب سے حاصل شدہ نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی جانب سے ہے اور اس منزلت کی وجہ زکوٰۃ ادا کرنے والے کی اپنے ضمیر کے سامنے جوابدہی نہیں بلکہ خدائے علیم وخبیر کے سامنے جوابدہی کا یقین ہے اور زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے ادا کرنے والے کی مجبوری بلفظ صحیح اس کی طوع و رغبت، کسی اندرونی طاقت کی مرہون منت نہیں بلکہ خدائے غفار وقہار کی ہستی کی بالادستی کا عقیدہ اس کا باعث ہے۔ پھر زکوٰۃ کی غایت صرف معاشرے کا اقتصادی ڈھانچہ قائم کرنا نہیں بلکہ اس کی اصلی غایت حضرت حق جل مجدہ کی رضا طلبی (اِبْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللهِ) اور آخرت کی سرخروئی حاصل کرنا ہے۔ زکوٰۃ کا یہ کتنا گھٹیا اور موہوم تصور ہے جو زکوٰۃ کو ٹیکس قرار دینے والوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد خالد صاحب نے ایک عجیب نقطہ پیش فرما کر گویا اسلام کی روح نکال کر لوگوں کے سامنے رکھ دی ہے، فرماتے ہیں:

> ''اسلامی معاشرے میں دین و دنیا کی دوئی کا تصور سرے سے موجود نہیں، دوئی کا تصور اس وقت اور زیادہ مضبوط ہوجاتا ہے جب قیصر اور خدا کے واجبات کو دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کردیا جائے۔''

اگر اسلام میں دین و دنیا کی دوئی کا تصور موجود نہیں تو سوال یہ ہے کہ اسلام میں دین کو دنیا کے تابع کر کے تمام دینی اعمال کو دنیا کی اغراض وخواہشات کے مطابق ڈھال دینے کا تصور کب موجود ہے؟ اسلام نے یہ تعلیم تو بلاشبہ دی ہے کہ جس طرح خالص دینی اعمال کو خدا طلبی اور ثوابِ آخرت کے لئے کیا جائے، اسی طرح دنیوی معاملات بھی شرعی ہدایات کے موافق، رضائے خداوندی اور وسیلۂ آخرت کی حیثیت سے بجا لائے جائیں تاکہ دنیا کے معاملات بھی ذریعۂ دین ہونے کی وجہ سے دینی رنگ میں رنگین ہوجائیں، لیکن یہ تعلیم اسلام نے کب دی کہ دین و دنیا کی تمام

امتیازی لکیریں مٹا کر دین و دنیا کو خلط کر ڈالو؟ اور دین کو دنیا کے خادم اور آلہ کار کی حیثیت دے ڈالو؟ پھر اگر قیصر اور خدا کے واجبات الگ الگ حصوں میں تقسیم کرنے کی اجازت اسلام نہیں دیتا تو وہ یہ اجازت کب دیتا ہے کہ قیصر وکسریٰ کے خودتراشیدہ جاہلی قسم کے ظالمانہ ٹیکسوں کو فریضۂ خداوندی میں گڈمڈ کر ڈالو؟ اور اس معجون مرکب سے روس اور امریکہ کے خطوط پر اسلامی معاشرے کے نقشے مرتب کرو؟ کیا اسلام کا نام لے کر، دین و دنیا کے ''ون یونٹ'' کا نعرہ لگانے والوں کی نظر سے، قرآن مجید کی وہ بیسیوں آیات نہیں گزریں، جن میں دنیا کے غرور اور فریب کو اجاگر کیا گیا ہے؟ اور ''ذَالِکَ مَبْلَغُهُم مِّنَ الْعِلْمِ.'' فرما کر دنیا پرستوں کے عقل وعلم کا ماتم کیا گیا ہے، الیس منکم رجل رشید؟

اس کے بعد خالد صاحب رقم طراز ہیں:

> ''معاشرے کی تمام ضروریات کے لئے جو ٹیکس لگایا جائے اسے حکومت کے علاوہ کسی کو وصول کرنے کا حق نہیں۔''

موصوف حکومت کی رضاجوئی کے لئے غریب اسلام پر جو مشق بھی فرمائیں انہیں کون روک سکتا ہے؟ بقول اکبر مرحوم:

گورنمنٹ کی یارو خیر مناؤ!
انا الحق کہو اور سولی نہ پاؤ!

لیکن زکوٰۃ کے بارے میں ان کا یہ بیان سو فیصد غلط ہے، شریعت اسلامیہ میں حکومت کو صرف اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق حاصل ہے کہ وہ از خود غربا ومساکین پر خرچ کرے، یا کسی کو اس کے لئے وکیل بنادے۔

اس کے بعد موصوف نے زکوٰۃ کے اہم اوصاف کا ذکرِ خیر بھی کیا ہے، فرماتے ہیں:

> ''زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے قرآن کریم حکم دیتا ہے،

اور عدم ادائیگی پر اس کی وعید نہایت شدید ہے۔ اکتناز پر جہنم کی آگ سے داغنے کی سزا سنائی گئی ہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کو خیر اور عدم ادائیگی کو شر قرار دیا گیا ہے۔"

مقام شکر ہے کہ ایک صحیح جملہ بھی ان کی نوکِ قلم پر جاری ہوگیا۔ لیکن قابل دریافت امر یہ ہے کہ زکوٰۃ کے ان تمام اوصاف کا بقلم خود اقرار کرنے کے باوصف اس کی ٹیکسی حیثیت پر اصرار کرنا ٹیڑھی ترچھی ذہنیت اور ناقابل فہم منطق کا مظاہرہ نہیں؟ کیا حکومتی ٹیکس، جن کو زکوٰۃ کی ماہیت میں داخل کرنے کے لئے قسم قسم کے فلسفے گھڑے جارہے ہیں، ان اوصاف کو اپنے اندر پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جو اوصاف خالد صاحب نے زکوٰۃ کے بیان فرمائے ہیں؟ زرِ خالص اور مسِ خام (کچا تانبہ) کو رنگ کی مشابہت کی وجہ سے ایک ہی حکم دے ڈالنے پر اصرار کرنا اور ابوبکرؓ و ابوجہل کو ظاہری مناسبت کے دھوکے سے ایک ہی ترازو میں تولنا، اور اس کے جواز کے لئے نوع درنوع فلسفے اختراع کرنا کتنی بڑی نادانی ہے، لیکن آج یہی حماقت پوری دانائی کے ساتھ اخبارات و رسائل کی زینت بنائی جارہی ہے۔

اس کے بعد خالد صاحب نے زکوٰۃ کو ٹیکس ثابت کرنے کے لئے "صدیقی جہاد" کا ذکر بھی کیا ہے، جسے ان کے دوسرے رفقا بھی بیان کرچکے ہیں، فرماتے ہیں:

> "اسلامی حکومت نے اس کی عدم ادائیگی کو باقاعدہ بغاوت قرار دے کر ایسے لوگوں کے خلاف جہاد کو ضروری قرار دیا۔"

خلافتِ راشدہ میں جن منکرین زکوٰۃ کے ساتھ جہاد کیا گیا، وہ صرف ٹیکس کی عدم ادائیگی کی وجہ سے باغی قرار نہیں دیئے گئے تھے بلکہ زکوٰۃ کو فریضۂ خداوندی کی بجائے ٹیکس قرار دینے کی وجہ سے مرتد قرار دیئے گئے تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے "باب من ابی قبول الفرائض وما نسبوا الی الردۃ" کا عنوان قائم فرماکر ان

کے مرتد ہونے کی تصریح کی ہے، اور اسی کے ساتھ اس کی علت یعنی عدم قبول فرض بھی بیان فرمائی، پھر اس باب میں شیخینؓ کا مناظرہ جو نقل کیا گیا ہے، اس میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد: "واللہ! لاقاتلنّ من فرّق بین الصلوۃ والزکوۃ۔" صاف صاف اعلان کرتا ہے کہ مانعین زکوٰۃ، نماز و زکوٰۃ میں تفریق کے قائل تھے۔ یعنی نماز تو ان کے نزدیک فریضۂ خداوندی تھا، اور نماز کی اس حیثیت کو وہ بھی تسلیم کرتے تھے، لیکن زکوٰۃ کو وہ فریضۂ خداوندی تسلیم نہیں کرتے تھے بلکہ ان کا خیال تھا کہ یہ ایک ٹیکس ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں معاشرے کی مالیاتی ضرورتوں کے لئے لگایا گیا ہوگا۔ الغرض اس جہاد میں جس کا حوالہ خالد صاحب نے دیا ہے ان منکرین زکوٰۃ کا موقف اصولی طور پر وہی تھا جو دورِ حاضر کے منکرین زکوٰۃ کا ہے، اور اس کے برعکس حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ تمام صحابہ کرامؓ کا موقف یہ تھا کہ زکوٰۃ معاشرتی ٹیکس نہیں بلکہ فریضۂ خداوندی ہے، جو شخص اس کی اس حیثیت کا انکار کرے گا، خواہ اس کے لئے کتنے ہی خوبصورت فلسفے پیش کرے، خلیفۂ اسلام کے ذمہ فرض ہوگا کہ ایسے مرتدین سے جہاد کرے۔ کیا ہمارے دور کے ٹیکسی حضرات اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے والے خلفائے اسلام کے لئے، اس صدیقی اسوہ میں کوئی سامان غیرت موجود ہے؟

(ہفت روزہ ترجمان اسلام ۲۹؍جولائی ۱۹۶۶ء)

مقادیر زکوٰۃ

پر اعتراضات کے جوابات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

''مشرق'' کے کالموں میں شرح زکوٰۃ میں اضافہ کی جس بحث کا آغاز ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے مراسلہ سے ہوا تھا اس سلسلہ میں ۲۶ رجون کے ''مشرق'' میں جناب رفیع اللہ صاحب کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے، جس میں موصوف نے ڈاکٹر صاحب کی تائید میں بزعم خود کچھ مزید ''دلائل'' اہل علم حضرات کے غور و فکر کے لئے فراہم کئے ہیں۔ چونکہ موصوف فہم و بصیرت اور قوتِ اجتہاد میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن سے بھی چند قدم آگے معلوم ہوتے ہیں، اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ ان کے ''دلائل'' کو واقعات کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔

موضوعِ بحث کی تعیین:

موضوعِ بحث یہ تھا کہ مختلف اموالِ زکوٰۃ کی جو شرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے اور حدیث و فقہ کے ذخیرہ میں قرناً بعد قرنٍ پے در پے نقل ہوتی چلی آرہی ہے اور امت کا ہر پچھلا طبقہ، پہلے طبقہ سے اس امانت کو بلا کم و کاست قبول کرتا رہا ہے، کیا آج چودہ سو سال بعد اس میں ترمیم و تنسیخ کا عمل جراحی

ممکن ہے؟ کیا زکوٰۃ کی منقولہ مقادیر میں ردوبدل جائز ہے؟ مثلاً سونے چاندی کی شرح اڑھائی فیصد، اموالِ تجارت کے لئے اڑھائی فیصد، پیداوار کے لئے دس فیصد یا بیس فیصد، اونٹ، گائے، بکری کے لئے خاص مقدار جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرمادی ہے، اس میں کمی بیشی صحیح ہے یا غلط؟

لیکن ہمارے مقالہ نگار جناب رفیع اللہ صاحب کے علم وفہم کی داد دیجئے کہ وہ ابھی تک موضوع بحث کو نہیں سمجھ پائے، ان کا خیال ہے کہ بحث شاید صرف اڑھائی فیصد میں ہو رہی ہے، آپ لکھتے ہیں:

> ''اب مسئلہ یہ ہے کہ آیا زکوٰۃ کی اڑھائی فیصد شرح یا مقدار قطعی شرعی حکم ہے اور کیا اس میں کمی بیشی خلاف اسلام ہوگی۔''

موصوف کی خدمت میں اس کے سوا اور کیا عرض کیا جاسکتا ہے کہ وہ ازراہِ کرم موضوع بحث کو سمجھیں پھر ''دلائل'' کی فراہمی کا شوق فرمائیں۔ بحث اڑھائی فیصد کی نہیں بلکہ بحث ان مختلف مقادیر کی ہے جو چودہ صدیوں میں بغیر کسی شک وشبہ کے محفوظ ہیں۔ بلاشک نقدی اور مالِ تجارت کی زکوٰۃ اڑھائی فیصد ہے، لیکن یہ تصور پیش کرنا نادانی ہے کہ ہر مال کی زکوٰۃ اڑھائی فیصد ہے، اسی غلط مفروضہ کا نتیجہ ہے کہ آگے چل کر موصوف نے تمام زورِ قلم اس پر صرف کردیا کہ دیکھو اونٹ، گائے، بکری کی زکوٰۃ اڑھائی فیصد نہیں بنتی، پیداوار کی زکوٰۃ یہ نہیں، لہٰذا اڑھائی فیصد کا دعویٰ غلط ہے۔

موضوع متعین کرنے کے بعد موصوف استدلال میں عجیب وغریب انکشافات فرماتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

> ''صحابہؓ کے زمانے میں ہمیں ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تعین میں بھی اختلاف رہا ہے

> اور تبدیلی بھی ہوتی رہی ہے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے......''

جن مقادیر کا اوپر تذکرہ کرچکا ہوں، انہیں سامنے رکھ کر موصوف واقعات نہیں بلکہ صرف ایک صحیح واقعہ کا حوالہ بھی پیش کرسکیں تو یہ ایک بڑا علمی کام ہوگا اور ہم سب ان کے ممنون ہوں گے۔ لیکن اگر وہ ''جن کی تفصیل حسب ذیل ہے'' ہی پر قناعت کرتے ہوئے امت کے اجماعی عقیدہ کو کھلونا بنانا چاہتے ہوں تو اس سے بڑھ کر خوش فہمی کی عمدہ مثال کیا پیش کی جاسکتی ہے؟ اب تفصیل سنئے! ارشاد فرماتے ہیں:

> ''حضورؐ کی ایک صحیح حدیث کے مطابق تو یہ ہے کہ زکوٰۃ کی شرح تو اونٹوں اور دوسری چیزوں کے لئے ہے، جہاں تک نقدی یا سونے کا تعلق ہے وہ سب کی سب زکوٰۃ ہے۔ (بحوالہ احکام القرآن ابوبکر جصاص ج:۳ ص:۱۳۰)۔''

موصوف نے یہاں جس حدیث کے حوالہ سے کمیونزم کے نظریہ اشتراکیہ کو اسلام کے سر منڈھنے کی کوشش فرمائی ہے، نہ اس کی سند ذکر کی، نہ متن کو چھوا اور نہ اس کے ترجمہ ہی کی زحمت گوارا فرمائی، لیکن ''صحیح حدیث'' کا فتویٰ صادر فرمادیا۔ لطف یہ کہ امام ابوبکر جصاصؒ نے اس پر جو تبصرہ فرمایا، نشۂ اجتہاد میں آپ اسے بھی ہضم کرگئے، اس لئے موصوف کی علمی دیانت کی وضاحت کے لئے یہاں وہ حدیث مع تبصرہ کے نقل کی جاتی ہے:

> ''روی موسیٰ بن عبیدة قال حدثنی عمران بن ابی انس بن مالک بن اوس بن الحدثان عن ابی ذر رضی اللہ عنہ قال: سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول: فی الابل صدقتها من جمع دینارا او درهما او تبرا او فضة لا یعده لغریم ولا ینفقه فی سبیل اللہ فهی

کی یکوی لہا یوم القیامۃ، قال: قلت: انظر ما یجیء عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فان وھذہ الاموال قد فشت فی الناس. فقال: اما تقرأ القرآن: (وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ. الآیۃ)۔"

ترجمہ:......"موسیٰ بن عبیدہ نے روایت کیا ہے کہ مجھ سے عمران بن ابی انس نے بیان کیا، انہوں نے مالک بن اوس بن حدثان سے، انہوں نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ: اونٹوں میں ان کا صدقہ (واجب ہے) اور جس نے دینار، درہم یا سونا چاندی جمع کیا، نہ تو قرض خواہ کے لئے اسے تیار رکھتا ہے اور نہ اس کو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرتا ہے، پس وہ داغ ہے جس کے ساتھ قیامت کے دن اسے داغا جائے گا۔

راوی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوذرؓ سے عرض کیا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے غور وفکر سے روایت کیجئے (کہیں اس میں فروگزاشت نہ ہونے پائے) کیونکہ یہ مال لوگوں میں عام طور پر پائے جاتے ہیں (اور کسی نے تمام مال خرچ کرنے کا فتویٰ نہیں دیا)۔ اس پر آپ نے فرمایا: کیا تم قرآن پاک نہیں پڑھتے؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: جو لوگ سونے چاندی کا ذخیرہ جمع کرتے اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔"

پوری حدیث آپ کے سامنے ہے جس میں موسیٰ بن عبیدہ سے نیچے کا سلسلہ سند موصوف کے ماخذ میں بھی مذکور نہیں، نہ اس میں اس کے صحیح ہونے کا ادنیٰ اشارہ پایا جاتا ہے، اس صورت میں موصوف کا اسے حدیث صحیح قرار دینا محض رجماً بالغیب نہیں تو اور کیا ہے؟ بلکہ اس کے برعکس امام ابوبکر جصاصؒ بظاہر اس کے سنت متواترہ اور اجماع امت کے خلاف ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"قال ابوبکرٍ قد ثبت عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالنقل المستفیض ایجابہ فی مائتی درھم خمسۃ دراھم وفی عشرین دینارًا نصف دینار کما اوجب فرائض المواشی ولم یوجب الکل فلو کان اخراج الکل واجبا من الذھب والفضۃ لما کان للتقدیر وجہ وایضًا فقد کان فی الصحابۃ قوم ذو یسارٍ ظاھرٍ واموالٍ جمۃٍ مثل عثمان وعبدالرحمن بن عوف وعلم النبی صلی اللہ علیہ وسلم ذالک منھم فلم یامرھم باخراج الجمیع فثبت ان اخراج جمیع الذھب والفضۃ غیر واجب وان المفروض اخراجہ ھو الزکوٰۃ الا ان تحدث امور توجب المواساۃ والاعطاء۔"

(احکام القرآن ج:۳ ص:۱۳۱)

ترجمہ:......"امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مواشی کے صدقات کی معین مقدار واجب فرمائی ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو سو درہم چاندی میں پانچ درہم اور بیس مثقال سونے میں نصف مثقال کی تعیین بھی نقل متواتر سے ثابت ہے اور یہ کہ آپ

نے کل واجب نہیں فرمایا۔ اب اگر کل سونے یا چاندی کا خرچ کرنا ہی واجب ہوتا تو ایک خاص مقدار مقرر فرمانے کا کیا مطلب ہوسکتا تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ صحابہ کرامؓ میں خاصی تعداد اچھے خاصے مالداروں کی بھی تھی، جن میں حضرت عثمان اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی مالداری کا علم بھی تھا لیکن آپؐ نے ان کو تمام مال خرچ کرنے کا حکم نہیں فرمایا۔ اس سے واضح ہوا کہ تمام سونے چاندی کا خرچ کرنا واجب نہیں اور یہ کہ صرف زکوۃ کی مقدار (اڑھائی فیصد) خرچ کرنا واجب ہے، الّا یہ کہ کوئی ہنگامی حالت پیش آجائے، جس میں خرچ کرنا ضروری ہوجائے تو دوسری بات ہے۔"

اس کے بعد امام موصوفؒ نے اس پر کئی شواہد پیش فرمائے ہیں جو اصل کتاب میں ملاحظہ فرمائے جاسکتے ہیں۔ امام ابوبکر جصاصؒ کا یہ بیان بھی جناب رفیع اللہ صاحب کی نظر سے گزرا ہوگا، لیکن موصوف ان تمام امور کو نظر انداز کرتے ہوئے کتنی سادگی سے فرماتے ہیں:

"یاد رہے کہ اس کی (حدیث مذکور کی) مخالفت میں کوئی حدیث نہیں۔"

کیا میں ان سے دریافت کرسکتا ہوں کہ آپ نے ایک مبہم حدیث کی نقل میں تو امام جصاصؒ پر اعتماد کرلیا، لیکن اسی کے بالکل متصل امام موصوفؒ نے اس کے خلاف سنت متواترہ اور اجماع کا حوالہ دیتے ہوئے متعدد احادیث نقل کیں تو آپ ان سب کو گول کر گئے کیا اسے علمی تحقیق کا نام دیا جائے گا؟ آپ نے کئی جگہ بلاسوچے سمجھے حجۃ اللہ کے حوالے بھی دیئے ہیں، جناب کی مزید بصیرت کے لئے حجۃ اللہ کا

حوالہ بھی حاضر ہے، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

"ثم مست الحاجة الى تعيين مقادير الزكوة، اذ لو لا التقدير لفرط المفرط ولاعتدیٰ المعتدی."

(حجۃ اللہ البالغہ ج:۲ ص:۳۹)

پھر یہ بھی ناگزیر تھا کہ شارع علیہ السلام کی طرف سے مقادیر زکوۃ کو متعین کردیا جائے، اس لئے کہ اگر ایک مقدار خاص معین نہ کی جاتی تو ظالم ظلم پر اتر آتے اور نکلنے والے حد سے نکل جاتے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"قد استفاض من رواية ابى بكر الصديق وعمرو بن الخطاب وعلى بن ابى طالب وابن مسعود وعمر بن حزم وغيرهم رضى الله عنهم بل صار متواترًا بين المسلمين ان زكوة الابل .... الخ." (ایضاً ص:۴۳)

حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمرؓ، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت عمرو بن حزم وغیرہم رضی اللہ عنہم کی روایت حد شہرت کو پہنچی ہوئی ہے بلکہ مسلمانوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے اونٹوں کی زکوۃ (اس کے بعد اونٹوں کی معروف زکوۃ مذکور ہے)۔

"وقد استفاض من روايتهم ايضًا فى زكوة الغنم الخ..... واستفاض ايضًا ان زكوة الرقة ربع العشر فان لم يكن الا تسعون ومائة فليس فيها شيءٌ...... والذهب محمولٌ على الفضة." (ایضاً ص:۴۴)

ترجمہ:...... "اور ان ہی حضرات کی روایت بکریوں کی زکوۃ کے بارے میں بھی متواتر ہے، اور یہ بھی تواتر سے ثابت

ہے کہ چاندی کی زکوٰۃ اڑھائی فیصد ہے، پھر اگر ایک سونے
درہم ہوں تو ان میں کچھ واجب نہیں ہوگا، اور سونے کا حکم بھی
چاندی ہی کا ہے۔"

تعجب ہے کہ امام جصاصؒ اور امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ مقادیر زکوٰۃ کو قطعی، متواتر اور خلفائے راشدینؓ کی مشہور روایات سے ثابت شدہ بتلاتے ہیں اور محترم رفیع اللہ صاحب احکام القرآن اور حجۃ اللہ البالغہ کے حوالے دے دے کر لوگوں کو یہ بتلاتے ہیں کہ خلفائے راشدینؓ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مقرر فرمودہ مقادیر میں ترمیم کرلیا کرتے تھے:

چہ دلاور است وزدے کہ بکف چراغ دارد

شاہ ولی اللہ صاحبؒ مقادیر زکوٰۃ میں ردوبدل کرنے والوں کو ظالم اور معتدی (حد سے نکلنے والا) قرار دیتے ہیں، لیکن ہمارے کرم فرما اس ظلم و اعتداء کو حضرات خلفائے راشدینؓ کی طرف منسوب کرنا، علمی تحقیق تصور کرتے ہیں۔ بہرحال اول تو ان کی نقل کردہ روایت کا سند کے اعتبار سے حال معلوم نہیں، دوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت متواترہ اور اجماع امت کے یہ خلاف ہے، اس لئے اصول کے قاعدہ سے جو عقلی قاعدہ بھی ہے، خود اس روایت میں تو تاویل کی جائے گی، لیکن اس کو بلا فہم و تدبر سامنے رکھ کر سنتِ متواترہ اور امت کے اجماعی عقیدہ کو ٹھکرا دینا عقلاً ونقلاً کوئی وجہ جواز نہیں رکھتا، "فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ."

ان بیرونی امور سے قطع نظر اگر اس روایت کے الفاظ پر ہی غور کرلیا جاتا تو شاید استدلال اور جواب کی ضرورت نہ ہوتی، روایت کا ظاہری مفہوم بلاشبہ یہی نظر آتا ہے کہ سونا چاندی حوائج ضروریہ کے لئے یا انفاق فی سبیل اللہ کے لئے، اس لئے جو مال زائد از حاجت ہوگا اس کا صرف کرنا ضروری ہوگا۔ اور یہی حضرت ابوذرؓ کا مذہب

بھی تھا، لیکن اسی روایت میں یہ بھی بیان ہوا کہ راوی حدیث اسے ظاہری معنی پر حمل کرنے سے حضرت ابوذرؓ کو باز رکھنا چاہتا ہے، کیونکہ لوگوں میں ان اموال کی کثرت ہے، چنانچہ قریب قریب سبھی مسلمان حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں اس قدر متمول ہوچکے ہیں کہ ان پر زکوٰۃ فرض ہوسکتی ہے، پس اگر یہ روایت اپنے ظاہری معنی ہی کے اعتبار سے مراد ہوتی تو آخر یہ کیونکر ممکن ہوا کہ تمام صحابہؓ اس حدیث کو بھول گئے؟ میں پوچھتا ہوں کہ راوی کے الفاظ:

"انظر ما يجيء عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فان هذه الاموال قد فشت في الناس."

ترجمہ:...... "دیکھو! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے غور وفکر کرنے کے بعد روایت کرو (کہیں کوئی فروگزاشت نہ ہونے پائے) کیونکہ یہ اموال عام طور پر لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔" (کل مال خرچ کرنے کا فتویٰ آج تک کسی نے نہیں دیا)۔

کا مطلب اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا ہے؟ الغرض راوی کے اس معقول سوال پر حضرت ابوذرؓ نے اس کی تائید میں قرآن مجید کی آیت پیش فرمائی:

"وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ ....."

جس کا حاصل یہ ہوا کہ خود حضرت ابوذرؓ کے نزدیک بھی حدیث کا مفہوم قریب قریب وہی ہے جو اس آیت کا مفہوم ہے۔

اب دیکھئے! آیت کا مفہوم خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا بیان فرمایا؟ اسی کی روشنی میں ہمارے لئے اس حدیث کے مفہوم تک رسائی آسان ہوگی، احکام القرآن میں جہاں سے محترم رفیع اللہ صاحب نے یہ روایت نقل کی ہے، اس سے اگلے صفحہ (ج:۳ ص:۲) پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی صحیح حدیث سند

متصل کے ساتھ موجود ہے کہ جب یہ آیت: "وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ ...الخ." نازل ہوئی تو مسلمانوں پر بہت شاق گزری، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "میں آپ حضرات کے اشکال کو رفع کئے دیتا ہوں، چنانچہ آپؓ بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے، اور عرض کی: یا رسول اللہ! اس آیت کی وجہ سے آپؐ کے صحابہ گرانی میں مبتلا ہیں۔ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"ان اللہ (تعالیٰ) لم یفرض الزکوۃ الّا لیطیب ما بقیٰ من اموالکم وانما فرض المواریث لتکون لمن بعدکم."

(ابوداؤد ص:۲۳۴)

ترجمہ:......"اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اسی لئے تو فرض فرمائی تاکہ تمہارے باقی ماندہ مال پاک ہوجائیں اور حق تعالیٰ نے قانونِ میراث اس لئے تو مقرر فرمایا تاکہ وہ مال تمہارے بعد والوں کے لئے باقی رہے۔"

اس حدیث سے نہ صرف یہ کہ صحابہؓ کا اشکال رفع ہوگیا، بلکہ ہمیشہ کے لئے آیت کی مراد بھی واضح ہوگئی، یعنی آیت میں تذکرہ صرف انہی لوگوں کا ہے جو زکوٰۃ فرض کی ادائیگی میں بخل کرتے ہیں، اسی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (کی فصاحت کے قربان جایئے کہ آپؐ) نے اس کی عقلی دلیل بھی بیان فرمادی، یعنی اگر آیت کا مطلب یہی ہو کہ تمام مال کا خرچ کرنا واجب اور ضروری ہے تو حق تعالیٰ کا قانونِ میراث معطل ہوکر رہ جائے گا۔

الغرض جب یہ معلوم ہوچکا کہ حدیث ابی ذرؓ کا مفہوم وہی ہے جو اس آیت کا ہے، اور پر آیت کا مفہوم خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرمادیا کہ اس سے مراد انفاقِ مفروض ہے، انفاق کل نہیں، تو یقیناً اس حدیث کا مطلب بھی یہی ہوگا، اس لئے محترم رفیع اللہ صاحب کا اس حدیث کو "سو فیصد زکوٰۃ شرح زکوٰۃ" کے اشتراکی

نظریہ کی تائید کے لئے پیش کرنا محض خوش فہمی ہے۔

پھر اس غلط نظریہ سے زکوٰۃ کی شرح میں ردوبدل کے جواز کا سراغ لگانا محض ایک خیالی چیز تو ہوسکتی ہے، لیکن امورِ واقعیہ میں اس کا وزن شیخ کے فرضی کنبے سے زائد نہیں، اللہ تعالیٰ صحیح فہم نصیب فرمائے!

موصوف نے یہاں دو آیتیں بھی بغیر سوچے سمجھے نقل کرڈالیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

"قرآن مجید سے اسی کی تائید ہوتی ہے، مثلاً: "یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو." یعنی اپنی ضرورت سے جو بچے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔ اور "کی لا یکون دولة بین الاغنیاء منکم." تاکہ یہ دولت مندوں کے درمیان ہی گردش نہ کرتی رہے۔"

اس حساب سے تو وافر بچت پر شرح زکوٰۃ سو فیصد بنتی ہے۔

اگر وہ ان آیات کو یہاں بے محل نقل کرنے سے پہلے کسی چھوٹی بڑی تفسیر کا مطالعہ فرمالیتے تو انہیں معلوم ہوجاتا کہ پہلی آیت کا مفہوم ان کی مراد کے بالکل برعکس ہے۔ چنانچہ اس سے مراد زکوٰۃ اور وہ صدقہ نافلہ ہے جو حد استطاعت سے زائد نہ ہو، تفسیر کی عام کتابوں کے علاوہ ابن جریر (ج:۲ ص:۳۶۴ تا ۳۶۸) کا مطالعہ فرمالیا جائے، اور دوسری آیت کا تعلق تقسیم غنائم سے ہے زکوٰۃ اور صدقہ سے اس کا دور کا تعلق بھی نہیں۔

البتہ یہاں ایک نکتہ قابل غور ہے کہ حدیث وقرآن میں ذہنی تخیلات ٹھونس ٹھونس کر جو آنجناب نے "وافر بچت پر سو فیصد شرح زکوٰۃ" کا نظریہ اختراع کیا ہے، اس کی تشریح کے لئے ذرا اس "وافر بچت" کا معیار بھی بتایا ہوتا کہ وہ ہر شخص کی صوابدید پر منحصر ہے یا جناب کے ذہن میں اس کا کوئی خاص نصاب بھی متعین ہے؟

آج کروڑپتی ساہوکاروں سے لے کر دس دس ہزار تنخواہ پانے والے ملازموں سے پوچھ کر دیکھئے، ان کی ہوسِ دولت آپ کو ''وافر بچت'' کا کہیں پتہ نشان نہیں بتلائے گی، اور اگر آپ اس کے لئے کوئی خاص مقدار تجویز فرمائیں گے تو سوال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان فرمودہ نصاب اور مقدارِ زکوٰۃ میں معاذاللہ! کیا نقص تھا کہ آپ نئے سرے سے تحدید نصاب کی دردِسری میں مشغول ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحدید سے برگشتہ ہوکر ایمانی بصیرت سے بھی محروم ہوئے؟

اس کے بعد موصوف نے ایسا نادر انکشاف فرمایا ہے جو اسلام کے چہاردہ صد سالہ دور میں کسی عالم اور فقیہ کے ذہن میں نہ آیا ہوگا، فرماتے ہیں:

''حضرت عمرؓ نے ایسی زکوٰۃ، مالِ تجارت کی زکوٰۃ اکٹھی کرنے کا یہ فرمان جاری کیا تھا کہ مسلمانوں سے اڑھائی فیصدی لو، اور اہل زر سے پانچ فیصدی اور دارالحرب کے باشندوں سے چاہے وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں، دس فیصدی۔ یہ دس فیصدی زکوٰۃ ان کی زکوٰۃ واجب کے قائم مقام ہوگی۔ (بحوالہ ایضاً ص:۱۹۱)۔''

ان کی اس عبارت کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ یا تو اسلامی لٹریچر کے صحیح مطالعہ کی اہلیت نہیں رکھتے، یا پھر وہ دیدہ و دانستہ تحریف کرکے غلط نتائج پیدا کرنے میں خاص ذوق رکھتے ہیں، عربی شاعر کے بقول:

ان کنت لا تدری فتلک مصیبة
وان کنت تدری فالمصیبة اعظم!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جس فرمان کا یہاں حوالہ دیا گیا ہے، احکام القرآن میں اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

''کتب عمر الیٰ عمّاله: ان یأخذوا من المسلمین ربع العشر، ومن اهل الذمة نصف العشر، ومن الحربی العشر، وما یؤخذ من المسلم من ذالک فهو الزکوة المفروضة.''

ترجمہ:...... ''حضرت عمرؓ نے اپنے گورنروں کے نام لکھا کہ: مسلمانوں سے اڑھائی فیصد لیں اور اہل ذمہ سے پانچ فیصد اور حربی کافروں سے دس فیصد، اور اس سلسلہ میں مسلمانوں سے جو کچھ لیا جائے گا وہ بعینہٖ فرض زکوٰۃ ہوگی، جس میں زکوٰۃ کے تمام شرائط معتبر ہوں گے۔''

موصوف نے یہاں حربی کا ترجمہ: ''دارالحرب کے باشندے چاہے وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔'' کے ساتھ کر ڈالا، حالانکہ اسلامی ادب کا ابجد خواں بھی جانتا ہوگا کہ حربی ''دارالحرب کے باشندے خواہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں'' کو نہیں کہا جاتا بلکہ ایسے کافروں کو کہا جاتا ہے جو اسلامی سلطنت کے شہری نہ ہوں، ہمارے مقالہ نگار کو جلدی میں کسی عربی دان سے پوچھ لینے یا کسی عربی لغات کے مطالعہ کی فرصت نہ تھی تو کم از کم وہ اس روایت پر ہی غور فرمالیتے کہ اگر یہاں حربی کے مفہوم میں وہ بدقسمت مسلمان بھی داخل ہیں جن سے آنجناب کے بقول دارالحرب کے باشندے ہونے کے جرم میں کافروں ہی کا معاملہ کیا جائے گا اور ان سے وہی ٹیکس وصول کیا جائے گا جو کافروں سے وصول کیا جاتا ہے تو اسی روایت میں پہلے جو مسلم کا لفظ آیا تھا اس میں ''دارالسلام کے باشندہ'' کی قید لگانا بھی تو ضروری تھا۔ یعنی جب اس روایت میں مسلم اور حربی کا تقابل ہے تو آپ کس منطق سے حربی کے مفہوم میں مسلمانوں کو ٹھونستے ہیں؟ اور اگر انہیں اتنی موٹی بات پر بھی غور وفکر کی فرصت نہ تھی تو اتنا تو سوچ ہی لیا ہوتا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ایسے مسلمانوں کا وجود ہی

کہاں تھا جو دارالحرب میں باقاعدہ رہائش پذیر ہوں؟ اور وہاں سے بغرض تجارت دارالسلام میں آیا کرتے ہوں تاکہ ان سے دس فیصد وصول کئے جانے کا فرمان جاری کیا جاتا، پھر آنجناب نے "وما یؤخذ من المسلم من ذالک." کا مختصر ترجمہ: "دس فیصدی کرڈالا۔" اگر اتنی لمبی عبارت کا مفہوم یہی "دس فیصدی" ہے تو سوال یہ ہے کہ اسی روایت میں جو مسلمانوں سے اڑھائی فیصدی لینے کا حکم ذکر کیا گیا ہے، کیا وہ زکوٰۃ کے قائم مقام نہ ہوگا اور کیا وہ ذمی کے جزیہ کا حکم رکھے گا؟

اس تنقیح سے واضح ہوگیا ہوگا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فرمان کا صاف صاف مفہوم یہ ہے کہ مالِ تجارت پر مسلمانوں سے زکوٰۃ فرض وصول کی جائے اور ذمی اور حربی کافر سے علی الترتیب پانچ فیصد اور دس فیصد جزیہ وصول کیا جائے، اس لئے مسلمانوں سے دس فیصد وصول کرنے کا الزام رفیع اللہ صاحب کی غلط فہمی کی پیداوار ہے:

سخن شناس نہ دلبرا خطا ایں جاست

عجب نہیں کہ رفیع اللہ صاحب کی اس چابکدستی پر حضرت عمرؓ کی روح یوں شکوہ کناں ہو:

ہم دعا لکھتے رہے وہ دغا پڑھتے رہے!
ایک نقطے نے ہمیں محرم سے مجرم بنادیا!

اس پر بس نہیں، موصوف کی کوشش یہ ہے کہ کسی طرح صحیح یا غلط ثبوت فراہم کردیا جائے کہ حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی تھی، چنانچہ پہلے آپ نے یہ غلط مفروضہ گھڑا کہ حضرت عمرؓ مسلمانوں سے دس فیصد وصول کیا کرتے تھے، اس کے بعد اس سلسلہ میں فرمانِ نبوی کیا تھا؟ اس کی وضاحت فرمائی جاتی ہے، وہ کہتے ہیں:

"حالانکہ اس بارے میں فرمانِ نبوی یہ تھا کہ

مسلمانوں پر دس فیصد نہیں بلکہ یہ اہل ذمہ پر ہے۔ (بحوالہ ایضاً)

لیکن حضرت عمرؓ نے اہل ذمہ سے تو پانچ فیصد لیا اور دارالحرب کے مسلمانوں سے دس فیصد کے حساب سے زکوٰۃ لی۔"

یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو آپ نے نقل کیا کہ: "مسلمانوں پر دس فیصد نہیں بلکہ یہ اہل ذمہ پر ہے۔" یہ، چشم بددور! آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد:

"لیس علی المسلمین عشور، انما العشور علی اهل الذمة."

پر نوازش فرمائی ہے، موصوف لفظ "عشور" کا ترجمہ، جس کے معنی جزیہ کے ہیں، "دس فیصد" فرماگئے۔

حدیث پاک کا مفہوم یہ ہے کہ جزیہ اور ٹیکس مسلمانوں سے نہیں لیا جائے گا بلکہ یہ صرف اہل ذمہ پر ہے، چنانچہ اسی معنی کی دوسری روایت امام جصاصؒ نے ان الفاظ میں نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"یا معشر العرب! احمدوا الله اذ دفع عنکم العشور."

ترجمہ:...... "اے جماعت عرب! اللہ کا شکریہ بجا لاؤ! اس نے تم سے جزیہ کو دفع کردیا۔"

ان روایات کو نقل کرنے کے بعد امام جصاصؒ فرماتے ہیں:

"لیس المراد بذکر هذه العشور الزکوة، وانما هو ما کان یأخذه اهل الجاهلية من المکس."

ترجمہ:...... "ان روایات میں لفظ "عشور" سے مراد زکوٰۃ نہیں بلکہ اس سے مراد وہ ٹیکس ہیں جو اہل جاہلیت وصول

کیا کرتے تھے۔"

مگر ہمارے مقالہ نگار کی بلا جانے کہ "عشور" کیا ہوتا ہے، عربی لغات میں "عشور" کے کیا کیا معنی آتے ہیں؟ اور ائمہ فن نے ان احادیث میں لفظ "عشور" کی کیا تفسیر فرمائی ہے؟ ان کا جذبہ اجتہاد اسی کا مقتضی ہے کہ لفظ "عشور" کا ترجمہ "دس فیصد" کر کے لوگوں کو بتادیا جائے کہ حضرت عمرؓ نے فرمانِ نبویؐ کے علی الرغم معاذ اللہ! "اہل ذمہ سے تو پانچ فیصد وصول کیا اور دارالحرب کے مسلمانوں سے دس فیصد زکوٰۃ وصول کی۔" اس لئے ثابت ہوگیا کہ زکوٰۃ کی مقدار قطعی نہیں۔ نعوذ باللہ من الغباوۃ والغوایۃ!

موصوف کو جلدی میں شاید اتنے غور وفکر کی مہلت نہیں مل سکی کہ "دس فیصد" لفظ "عشر" کا ترجمہ تو ہوسکتا ہے، مگر یہاں تو لفظ "عشور" بلفظ جمع ہے، اس کا ترجمہ "دس فیصد" کیسے ہوسکے گا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "دس فیصد" کا مفہوم ادا کرنے کے لئے "عشر" ہی کا مشہور لفظ کیوں نہ استعمال فرمالیا؟ "عشر" کا لفظ چھوڑ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "عشور" کا لفظ جو استعمال فرمایا، اس میں کوئی حکمت تو ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ ان دو روایتوں کے یعنی فرمانِ نبویؐ اور فرمانِ فاروقیؓ کے الفاظ ہی پر غور وفکر کا موقع اگر رفیع اللہ صاحب کو مل جاتا تو بعید نہیں کہ وہ حضرت عمرؓ پر صریح الزام تراشی کی جرأت نہ فرماتے۔

بہرحال اس تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ موصوف کے اس حیرت انگیز انکشاف کی تمام تر بنیاد "حربی" اور "عشور" دو لفظوں کو غلط معنی پہنا کر اٹھائی گئی ہے، اس کے بعد موصوف نے مواشی کی زکوٰۃ پیداوار کے عشر کان یا دفینہ کے خمس کا ذکر کرتے ہوئے حساب لگانا شروع کردیا کہ دیکھو یہ چیز اڑھائی فیصد نہیں بنتی اس لئے اڑھائی فیصد زکوٰۃ کا تصور ہی غلط ہوا، مجھے حیرت ہے کہ یہ حضرات ایسی پادر ہوا اور کچی باتیں لکھتے ہوئے کیوں نہیں جھجکتے؟ جن کو نقل کرتے بھی شرم آتی ہے، آخر کس

عقلمند نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اسلام میں ہر مال کی زکوٰۃ اڑھائی فیصد ہے، جسے دور کرنے کے لئے جناب نے حساب دانی کے کمالات کا مظاہرہ فرمایا؟ دعویٰ یہ ہے کہ مختلف اموال کی مقادیر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائیں اور جو حدیث و فقہ کے ذخیرہ میں قیامت تک کے لئے محفوظ ہیں، ان میں ردوبدل ناجائز، حرام بلکہ موجب کفر ہے، فرمایا جائے کہ آنجناب کی اس حساب دانی سے اصل مدعیٰ پر کیا اثر ہوا؟ کیا اسلام کے اجماعی اور قطعی مسائل کو اسی قسم کے مشاغبات سے چیلنج کیا جاتا ہے؟

محترم رفیع اللہ صاحب کے "دلائل" کا تجزیہ اہل علم کے سامنے ہے، آخر میں ان سے گزارش ہے کہ آپ پوری اسلامی تاریخ میں ایک بھی صحیح واقعہ کا حوالہ انشاء اللہ نہیں دے سکیں گے کہ کسی فقیہ اور قابل اعتماد عالم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ مقادیر کو قابل ردوبدل قرار دیا ہو. اس لئے خدارا! امت مرحومہ کے حال پر رحم کرو! امت کے اجماعی مسائل کو بحث وجدال کا موضوع نہ بناؤ! اس طرزِ عمل سے اکبر کا "دین الٰہی" ایجاد نہ کرو! اسلام کے مسلم قواعد واصول اور مسائل وفروع آپ کی محنت سے بدل نہیں سکیں گے، البتہ یہ خطرہ ضرور ہے کہ اسلام کا محافظ (اللہ تعالیٰ) خود تمہارے بدل دینے کا فیصلہ نہ فرمالیں، بڑے اخلاص کے ساتھ اسلام میں ردوبدل کی کوشش کرنے والے یہاں بیسیوں آئے مگر اسلام کے احکام بدستور باقی ہیں اور انشاء اللہ تا قیامت انہیں باقی رہنا ہے، اس لئے وہ اسلام کو کیا بدلتے؟ بے چارے خود بدل دیئے گئے اور ایسے بدلے گئے کہ آج روسیاہی کے علاوہ ان کا کوئی نشان آپ نہ پائیں گے۔

فقطع دابر القوم الذین ظلموا، والحمد للہ رب العالمین!

(ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور ۲۲ر جولائی ۱۹۶۶ء)

زکوٰۃ وعشر کے قانون کا نفاذ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

"اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ." (الحج:۴۱)

بتاریخ ۶ رشعبان ۱۴۰۰ھ (۲۰ رجون ۱۹۸۰ء) کو اسلام آباد کی مرکزی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے بعد صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے ملک میں زکوٰۃ وعشر کے قانون کے نفاذ کا اعلان فرمایا۔ اور صدر کی اس موقع پر کی گئی تقریر کو ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے براہ راست مسجد سے نشر اور ٹیلی کاسٹ کیا۔

نظام زکوٰۃ کا نفاذ۔۔۔ بشرطیکہ وہ اصول شرعیہ کے مطابق واقعتاً نافذ بھی ہو۔۔۔ اسلامی اقتصادیات کے لئے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ پورے معاشرے کے لئے موجب صد رحمت وبرکت ہے۔ اس کے لئے جنابِ صدر اور ان کے معاونین کو جتنی مبارک باد دی جائے کم ہے، البتہ اس سلسلہ میں چند گزارشات ضروری ہیں:

۱:۔۔۔۔۔۔ زکوٰۃ وعشر کے قانون کا مسودہ گزشتہ سال ۵ر جولائی کو جب شائع کیا

گیا تھا تو شرعی نقطہ نظر سے اس میں متعدد سقم موجود تھے، اور ہم نے کافی تفصیل سے ان غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی اصلاح کی درخواست کی تھی۔ اب جو "زکوٰۃ وعشر کا قانون" سامنے آیا ہے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کہ بعض غلطیوں کو نہ صرف جوں کا توں باقی رکھا گیا ہے بلکہ ابتدائی مسودۂ قانون سے بڑھ کر ان غلطیوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک ایسا قانون جسے قانونِ خداوندی کہہ کر نافذ کیا جارہا ہو، اور جس کے نفاذ کا اعلان بھی مسجد سے ہوا ہو، اس میں شریعت اسلامی کی ادنیٰ خلاف ورزی بھی بڑی ہولناک ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ان غلطیوں کی سفارش اسلامی نظریاتی کونسل کے فاضل ارکان نے کی تھی، یا وزارت قانون کے مجتہدین نے ان کی آمیزش ضروری سمجھی...؟

۲:.....زکوٰۃ آرڈی نینس میں ان گیارہ اثاثوں کی تفصیل دی گئی ہے جن سے زکوٰۃ لازمی وصول کی جائے گی۔ ان کا بغور جائزہ لیا جائے تو نظر آئے گا کہ ان میں سے اکثر اثاثے وہ ہیں جن پر رائج الوقت نظامِ زر کے مطابق ارباب مال کو سود ملتا ہے، چنانچہ جو اثاثے سود سے مستثنیٰ ہیں ان میں اکثر زکوٰۃ سے بھی مستثنیٰ رکھے گئے ہیں۔ اول الذکر اثاثوں پر زکوٰۃ کی لازمی کٹوتی کی تعبیر شرح سود میں تخفیف سے کی جاسکتی ہے۔ فرض کیجئے کسی صاحب کے سرمایہ پر دس فیصد سالانہ کی شرح سے سود ملتا ہے، اب زکوٰۃ کی مد میں اڑھائی فیصد کٹوتی کے بعد سود کی شرح ساڑھے سات فیصد رہ جائے گی، یا زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جائے کہ دس فیصد سود میں سے ساڑھے سات فیصد سود، صاحبِ سرمایہ کو ملے گا، اور اڑھائی فیصد سود حکومت بمد زکوٰۃ جمع کرکے غربا پر خرچ کیا کرے گی۔ یہاں سے واضح ہوجاتا ہے کہ اسلام کے نظامِ زکوٰۃ اور جاہلیت کے نظامِ ربوا (سود) کے درمیان تضاد ہے، جب تک ملک کے اندر سود کا نظام نافذ ہے زکوٰۃ کا نفاذ بڑی حد تک لفظی ہے۔

۳:.....قرآن کریم نے زکوٰۃ کے مصارف کی آٹھ مدیں ذکر فرمائی ہیں۔

ان آٹھوں مدوں میں دو چیزوں کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، ایک یہ کہ جس شخص کو زکوٰۃ دی جائے وہ محتاج ہو، اگر وہ شخص غنی ہوگا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی (البتہ عاملین زکوٰۃ اس شرط سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان کو جو کچھ دیا جاتا ہے وہ فقراً کی طرف سے کارندے ہونے کی حیثیت سے دیا جاتا ہے، اور وہ ان کا حق الخدمت ہے)۔ دوسری شرط یہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقم کا کسی فقیر محتاج کو مالک بنادیا جائے ورنہ اگر زکوٰۃ کا اس کو مالک نہیں بنایا گیا، بلکہ اسے اس سے منتفع ہونے کی اجازت دے دی گئی تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ مثال کے طور پر ایک شخص زکوٰۃ کی رقم سے کھانا پکواکر فقراً کو کھانے کی اجازت دے دیتا ہے کہ جو شخص جتنا چاہے کھا کر چلا جائے، مگر ساتھ نہیں لے جاسکتا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، اور اگر وہی کھانا فقراً پر تقسیم کرکے انہیں اس کا مالک بنادیتا ہے تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی، لیکن زکوٰۃ کے حکم نامہ کی دفعہ: ۸ میں کہا گیا ہے:

"زکوٰۃ فنڈ کا استعمال:

"زکوٰۃ فنڈ میں جمع شدہ رقوم مندرجہ ذیل مقاصد کے لئے استعمال کی جائیں گی: ضرورت مند، محتاج اور غریب افراد۔ خصوصاً یتامیٰ، بیوائیں، معذور اور کام نہ کرسکنے والے افراد کے لئے۔ شریعت کی رو سے زکوٰۃ کے مستحق افراد کے لئے، ان کے گزارہ اور آبادکاری کے لئے، دینی مدارس یا پیشہ ورانہ تعلیمی اداروں یا عوامی ہسپتالوں، دواخانوں یا ہیلتھ لیبارٹریوں کی بالواسطہ یا بلاواسطہ امداد"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کی رقم اس قسم کے رفاہی اداروں کی تعمیرات وضروریات پر بھی خرچ کی جائے گی اور بعض ذمہ دار افراد کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ سڑکوں اور کنووں اور پلوں کی تعمیر پر بھی خرچ کی جائے گی۔ مگر شرعی نقطۂ نظر سے یہ قطعاً غلط ہے، ان مدات پر خرچ کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی اور ارباب مال

کو اپنی زکوٰۃ بطور خود ادا کرنی ہوگی۔ شاید یہ اجتہاد "فی سبیل اللہ" اور "ابن السبیل" کے لفظ سے کیا گیا ہے، لیکن اس لفظ کا یہ مفہوم لینا صحیح نہیں۔ مسٹر ایوب خان کے زمانے میں ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب اور ان کے رفقا ایسے بے ہنگم اجتہاد کیا کرتے تھے:

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی!
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی؟

ہم درخواست کریں گے کہ زکوٰۃ کی رقم، سڑکوں، پلوں، کنوؤں اور ہسپتالوں وغیرہ پر خرچ نہ کی جائے ورنہ مسلمانوں کا اس نظام پر اعتماد مجروح ہوگا۔

۴:...... قرآن کریم نے سب سے اولیت وفوقیت نماز کو دی ہے، اور زکوٰۃ کو اسلام کے نظام عبادت میں دوسرے نمبر پر رکھا ہے۔ قرآن کریم میں تقریباً اسی (۸۰) مواقع پر نماز اور زکوٰۃ کو ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ایک نہایت ہی لطیف پیرائے میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ نظامِ زکوٰۃ اسی معاشرے میں پنپ سکتا ہے جو اس سے پہلے نماز پر کاربند ہو، بے نماز معاشرہ جو اللہ تعالیٰ کے سب سے پہلے قانون کو توڑ رہا ہو، وہ نظامِ زکوٰۃ کو کسی طرح بھی منشائے الٰہی کے مطابق قائم نہیں کرسکتا۔

اگر حکومت نے زکوٰۃ کا قانون نافذ کیا ہے اور اس کی جبری وصولی کے احکامات جاری کئے ہیں تو سب سے پہلے اس کا فرض یہ ہے کہ قانونِ نماز بھی ملک میں نافذ کرے۔ نماز کو ایک انفرادی اور اختیاری عمل باور کرانا اور زکوٰۃ کو اجتماعی اور قانونی فریضہ قرار دینا، اسلام کی روح کے منافی ہے۔ اور جو لوگ خدا تعالیٰ کے سب سے پہلے فریضہ کو ہی ادا کرنے پر آمادہ نہ ہوں، خدا کو ان کے اموال کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان سے جبری زکوٰۃ وصول کرکے حکومت کا زکوٰۃ فنڈ تو ضرور مضبوط ہوجائے گا لیکن اسلام کے نظامِ زکوٰۃ کی جو برکات مطلوب ہیں وہ کبھی حاصل نہیں ہوں گی۔

"اقامت صلوٰۃ" کے سلسلہ میں اسلامی قانون موجود ہے اور اس کو نافذ بھی

کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر اس قانون کے نفاذ میں کچھ دشواریاں حائل تھیں تو کم از کم درجے میں یہ قانون تو نافذ کیا جاسکتا تھا کہ جو شخص فریضۂ نماز کا تارک ہو وہ حکومت کے کسی عہدے کے لئے اہل نہیں ہے۔

اگر حکومت ملک میں اسلامی نظام کی بسم اللہ کرنا چاہتی ہے تو یہ بسم اللہ اقامت صلوٰۃ کے قانون سے ہونی چاہئے اور اس کے پہلے مرحلے میں حکومت کے عہدوں کی دیگر شرائط کے ساتھ ایک شرط اقامت صلوٰۃ کی بھی رکھی جاسکتی ہے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

"واللہ! لاقاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ۔"

ترجمہ:...... "اللہ کی قسم! میں ان لوگوں سے ضرور قتال کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ کے درمیان تفریق کرتے ہیں۔"

اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کے درمیان تفریق ممکن نہیں، اور یہ کہ جس معاشرے میں اقامت صلوٰۃ نہ ہو رہی ہو وہاں ایتاءِ زکوٰۃ کا تصور نہیں کیا جاسکتا، جہاں نماز قائم کرنے کے لئے کوئی قانون موجود نہ ہو، وہاں قانونِ زکوٰۃ کی کامیابی از بس دشوار ہے۔

۵:...... زکوٰۃ کی انتظامیہ کے لئے کسی مرحلہ پر بھی یہ شرط نہیں رکھی گئی کہ اس کی رکنیت کے اہل صرف مسلمان ہوں گے۔ غالباً اس شرط کی ضرورت اس لئے محسوس نہیں کی گئی کہ جب یہ نظام ہے ہی مسلمانوں کے لئے تو اس میں اسلام کی شرط رکھنا غیرضروری ہے، لیکن زکوٰۃ کے لئے جو انتظامی ڈھانچہ تجویز کیا گیا ہے اس کے مطابق یہ عجیب وغریب صورت بھی پیش آسکتی ہے کہ اس انتظامیہ میں کوئی غیرمسلم بھی شامل ہوجائے۔

مثلاً زکوٰۃ کی مرکزی کونسل میں حسب ذیل سولہ ارکان ہوں گے: ایک چیئرمین، جو سپریم کورٹ کے جج ہوں گے۔ تین علماء، پانچ مختلف شعبوں سے تعلق

رکھنے والے افراد جو صوبوں سے نامزد کئے جائیں گے۔ چار صوبوں کے ایڈمنسٹریٹر، وفاقی وزارتِ خزانہ اور وزارتِ مذہبی امور کے سیکریٹری صاحبان اور چیف ایڈمنسٹریٹر۔

صوبائی کونسل دس افراد پر مشتمل ہوگی۔ صدر، ہائی کورٹ کے جج، تین علمائے کرام، دو افراد عوامی نمائندے، صوبائی چیف ایڈمنسٹریٹر، صوبائی محکمہ مالیات، معاشرتی بہبود اور لوکل گورنمنٹ کے سیکریٹری صاحبان۔

ضلعی کونسل مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل ہوگی: ایک غیر سرکاری چیئرمین، ڈپٹی کمشنر، ضلعی کونسل کا ایک نامزد ممبر اور ہر تحصیل کا ایک ایک نمائندہ۔

اس انتظامی ڈھانچہ کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ اگر متعلقہ جج صاحبان یا سیکریٹری صاحبان، یا ڈپٹی کمشنر صاحبان کسی غیر مسلم اقلیتی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں تو اس قانون کے مطابق وہ بھی زکوٰۃ کونسل میں شامل ہوں گے، قانونی طور پر نہ تو اس سے تحفظ کی کوئی ضمانت دی گئی ہے، اور نہ ارکان کے لئے سوائے ان کے عہدہ کے کوئی اور شرط رکھی گئی ہے، وہ نظام جس کے چلانے والوں میں غیر مسلم بھی شامل ہوں، مسلمانوں کو اس پر کس حد تک اعتماد کی گنجائش ہے؟

اس نوعیت کی بعض اور چیزیں بھی قابل غور ہیں، ہم حکومت سے اپیل کریں گے کہ ان کی اصلاح کی طرف توجہ فرمائی جائے اور اسلام کے ایک اہم ترین شعار میں کسی ادنیٰ سے ادنیٰ سقم کو بھی گوارا نہ کیا جائے۔

۶:...... جناب صدر نے نفاذِ زکوٰۃ کا اعلان مسجد سے فرمایا، بلاشبہ یہ ایک لائق تحسین روایت ہے، لیکن مسجد میں جو اس کو ٹیلی کاسٹ کیا گیا یہ حرمت مسجد کے منافی ہے۔ اب تک مساجد میں تصویریں لیتے ہوئے لوگ جھجکتے تھے مگر اب مسجد میں بلاتکلف فلم سازی ہوا کرے گی، اور اس پر کوئی روک ٹوک نہیں کر سکے گا۔ کاش! اس موقع پر صدرِ مملکت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی سامنے رکھتے:

”من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها

واجر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اجورهم شئ. ومن سن فی الاسلام سنة سيئة فعليه وزرها ووزر من عمل بها من بعده غير ان ينقص من اوزارهم شيئا.“

۷:...... حکومت کی طرف سے جن اثاثوں پر نفاذ زکوٰۃ کا اعلان ہوا ہے ان میں سے بعض شرعاً مالِ حرام کی مد میں آتے ہیں اور مالِ حرام پر زکوٰۃ نہیں ہوتی، بلکہ وہ واجب الرد یا واجب التصدق ہوتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ زکوٰۃ کے حکم نامہ میں اس کی رعایت نہیں کی گئی کہ کسی شخص کے اکاؤنٹ میں جو روپیہ جمع ہے، وہ کس ذریعے سے حاصل کیا گیا ہے، بلکہ حلال وحرام کی تمیز کئے بغیر اس پر زکوٰۃ لاگو کردی گئی ہے۔

۸:...... بتاریخ ۲۰؍جون کو بروز جمعہ نفاذِ زکوٰۃ کا اعلان ہوا، اور ۲۱؍جون کو بروز ہفتہ زکوٰۃ کی کٹوتی کے لئے تمام بینک بند رہے، اور جن جن لوگوں کا بینک میں ایک ہزار روپیہ یا اس سے زیادہ جمع تھا اس کا اڑھائی فیصد بمد زکوٰۃ کاٹ لیا گیا۔ ان میں سے بہت سے لوگ ایسے بھی ہوں گے جن پر زکوٰۃ فرض ہی نہیں۔ بہت سے مقروض ہوں گے، بہت سے یتیم اور نابالغ ہوں گے، بہت سے ایسے ہوں گے جن کے نصاب پر سال نہیں گزرا، لیکن حکومت نے بغیر کسی تمیز کے سب سے زکوٰۃ وصول کرڈالی۔ یہ صریحاً ظلم ہے اور افسوس ہے کہ اسے نفاذِ زکوٰۃ کے پہلے دن روا رکھا گیا، اگر حکومت کا مقصد صرف زکوٰۃ فنڈ کے نام سے روپیہ جمع کرنا ہے تو دوسری بات ہے، اور اگر وصولیٔ زکوٰۃ میں شرعی احکام کی رعایت بھی ضروری ہے تو ہم درخواست کریں گے کہ اس کے لئے کوئی ایسا طریقہ کار وضع کیا جائے جو شرعی احکام کے مطابق ہو۔

(ماہنامہ بینات کراچی رمضان ۱۴۰۰ھ)

زکوٰۃ اور ضروریاتِ دین کے بارے میں غلط پروپیگنڈا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

”عن ابی ہریرة رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اذا اتخذ الفیٔ دولا، والامانة مغنمًا، والزکوة مغرمًا، وتعلم لغیر الدین، واطاع الرجل امرأتہ وعق امہ، وادنیٰ صدیقہ واقصیٰ اباہ، وظہرت الاصوات فی المساجد، وساد القبیلة فاسقہم، وکان زعیم القوم ارذلہم، واکرم الرجل مخافة شرہ، وظہرت القینات والمعازف، وشرب الخمور، ولعن آخر ہذہ الامة اولہا، فلیرتقبوا عند ذالک ریحًا حمراء، وزلزلة، وخسفًا، ومسخًا، وقذفًا، وآیات تتابع کنظام بال قطع سلکہ فتتابع.“ (جامع الترمذی ج:۲ ص:۴۴)

ترجمہ:......”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب فئے کو دولت، امانت کو غنیمت اور زکوٰۃ کو ٹیکس قرار دیا جائے، غیردین کے لئے

علم سیکھا جائے، آدمی اپنی بیوی کی فرمانبرداری اور ماں کی نافرمانی کرنے لگے، دوست کو قریب اور باپ کو دور کرنے لگے، مسجدوں میں آوازیں بلند ہونے لگیں، بدکار آدمی اپنے قبیلہ کا سردار ہوجائے، اور قوم کا چودھری سب سے رذیل آدمی بن جائے، آدمی کی عزت اس کے شر کے خوف سے کی جائے، گانے والی عورتیں اور گانے بجانے کا سامان پھیل جائے، شرابیں (بے دھڑک) پی جانے لگیں اور امت کا پچھلا حصہ، پہلے حصہ (سلف صالحین) پر لعن طعن کرنے لگے تو اس وقت ان امور کا انتظار کرو: سرخ آندھی، زلزلہ، زمین میں دھنس جانا، شکل بگڑ جانا، آسمان سے پتھر برسنا اور ان کے علاوہ دیگر نشان جو اس طرح پے در پے واقع ہوں گے جیسے کسی تسبیح (ہار) کا دھاگہ ٹوٹ جانے سے اس کے دانے پے در پے گرنے لگتے ہیں۔"

آج سے کوئی چودہ پندرہ سال پہلے کی بات ہے کہ حضرت استاذ دام ظلہم کی خدمت میں مشکوٰۃ شریف پڑھتے وقت پہلی دفعہ حدیث مندرجہ بالا نظر کے سامنے آئی تو میرا وہمی ذہن فوراً یہ سوچنے لگا کہ یا اللہ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان پتھر کی لکیر ہے، اپنا ایمان ہے کہ جو کچھ فرمایا ہو کر رہے گا، لیکن یہ آخر کیسے ہوجائے گا کہ مسلمان کہلانے والے زکوٰۃ کو ٹیکس قرار دے دیں؟ تاہم دل کو یوں تسلی مل گئی کہ یہاں زکوٰۃ کو ٹیکس قرار دینے سے مراد ضروری نہیں کہ واقعتاً اسے ٹیکس ہی کہا جائے، بلکہ یہ مطلب بھی مراد لیا جاسکتا ہے کہ لوگ زکوٰۃ سے ٹیکس کا سا معاملہ کرنے لگیں اور اس کی ادائیگی میں گرانی محسوس کرنے لگیں۔ مگر زمانہ کی بوقلمونی ملاحظہ کیجئے کہ چند سال کی معمولی مدت نے انسانی مزاج میں کتنا تغیر، کتنا فساد اور کتنا فتور برپا کردیا کہ چند ہی سال پہلے جس امر کو میری سادہ مزاجی کسی صاحبِ ایمان کی طرف منسوب

کرنے پر آمادہ نہ ہوتی تھی، آج بعض نام نہاد مسلمان پوری توانائی سے بار بار اسی کی رٹ لگا رہے ہیں کہ زکوٰۃ ٹیکس ہے، ٹیکس ہے، نعوذ باللہ من النفاق والشقاق!

سب سے پہلے آسمانِ مغرب کا یہ الہام، ادارۂ تحقیقات اسلامی کے ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب بالقابہ کے قلب پر میک گل یونیورسٹی میں القا ہوا، اور انہوں نے رسائل اور اخبارات میں اس "الہامی علم" کی اشاعت فرمائی۔

اس کے بعد ان کے کئی مسترشدین نے اس پر خامہ فرسائی کے جوہر دکھائے، نئے نئے نکتے پیدا کئے اور ادراک وفہم، تعبیر وتاویل اور تحقیق وتفتیش کا دریا بہا ڈالا، اسی سلسلہ کی ایک کڑی جناب پروفیسر محمد عثمان کا وہ مضمون ہے جو ہفت روزہ چٹان ۱۵، ۲۲، ۲۹ راگست ۱۹۶۶ء کی زینت بنا اور ان سطور میں یہی مضمون ہماری بحث کا موضوع ہے۔

ہمارے لئے یہ معمہ ابھی تک ناقابل فہم ہے (اور ہمارے خیال میں ہر وہ شخص جس کے دل میں کسی حد تک ایمانی رمق موجود ہے اس کے نزدیک بھی یہ امر کبھی قرین عقل نہیں ہوسکتا) کہ اسلام کے حقائق جو میرے اور زید وعمرو کے باپ دادا پر نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے تھے، انہیں محض لفظی گورکھ دھندے سے کیونکر مسخ کیا جاسکتا ہے؟ یعنی زکوٰۃ کا نام اگر ٹیکس رکھ دیا جائے، سود کو منافع کہہ دیا جائے، شراب کو آب طہور سے موسوم کردیا جائے تو محض کسی کے یہ نام رکھ لینے سے زکوٰۃ ٹیکس کیسے بن جائے گی؟ اور ٹیکس کو زکوٰۃ کا مرتبۂ بلند کیونکر مل جائے گا؟ سود منافع میں داخل ہوکر حلال اور طیب کیسے ہوجائے گا؟ اور شراب شربت کا حکم کیونکر حاصل کرلے گی؟ یا اگر خام عقل، کج فہم اور کوتاہ اندیش لوگوں کے رسم ورواج کو "سنت جاریہ" کا اسم شریف دے دیا جائے تو وہ "سنت نبوی" میں داخل ہوکر دین اسلام کی بنیاد کیسے بن جائے گی؟ یا اگر چند ملکوں یا ایک ملک کے چند ڈاکٹروں کی اجتماعی خواہشات اور ہوا وہوس پر "اجماع" کا لقب چسپاں کردیا جائے تو وہ واقعتاً

دینی سند کی حیثیت کیونکر حاصل کر لے گا؟ یا اگر کسی پڑھے لکھے آدمی کی قرآن کریم پر آزادانہ مشق ستم کے ساتھ اجتہاد کا دم چھلہ لگادیا جائے تو کیا وہ سچ مچ قابل اعتبار قرار پائے گا؟ اور اس نئے مجتہد صاحب میں امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ سے آنکھیں ملانے اور ان کے ہم پلہ ہونے کی صلاحیت اس نام نہاد اجتہاد سے پیدا ہوجائے گی؟ کافی غور وفکر کے بعد بھی ہم یہ سمجھنے سے معذور رہے ہیں کہ اسلام اور اسلامی حقائق کو اس مسخرہ پن کی بازی گری کی نذر کرکے انہیں تحریفی تیشوں سے تراشنے اور لفظی گورکھ دھندوں سے الجھانے کی گنجائش کب سے اور کیونکر پیدا ہوگئی؟

زکوٰۃ ہی کو لیجئے! ہر مسلم وغیر مسلم جانتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اسلام میں زکوٰۃ نہ صرف یہ کہ اہم ترین عبادت ہے بلکہ دین اسلام کا بنیادی رکن بھی ہے۔ صحیحین کی روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے:

۱:......کلمہ طیبہ کی (دل وزبان سے) شہادت دینا۔

۲:......نماز قائم کرنا۔

۳:......زکوٰۃ دینا۔

۴:......حج کرنا۔

۵:......رمضان کے روزے رکھنا۔"

اور اہل علم جانتے ہیں کہ نماز اور زکوٰۃ کے مابین خاص ربط اور تعلق ہے۔ ان کے اسی خاص تعلق کے پیش نظر قرآن حکیم نے چالیس سے زائد اور بقول بعض اسی (۸۰) مقامات میں ان دونوں کو یکجا ذکر کیا۔ قرآن مجید میں کئی جگہ آپ ان پانچ ارکان میں سے صرف زکوٰۃ کا ذکر پائیں گے، زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے اجر وثواب اور زکوٰۃ کے بارے میں تساہل پسندوں کی تہدید اور عذاب کا بیان بھی جگہ جگہ ملے گا۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متواتر، مشہور اور صحیح احادیث مقدسہ میں زکوٰۃ کے فضائل، زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر دنیوی، برزخی اور اخروی ذلت اور رسوائی کی تفصیلات، اس کے نصاب، اس کی مقدار اور اس کے مصارف کا تفصیلی بیان پوری شرح وبسط کے ساتھ موجود ہے۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے لے کر آج تک علماء، صلحاء، فقہاء ومحدثین اس کی عباداتی حیثیت، اس کے خاص نصاب اور خاص مقدار کو، جو ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے متعین فرمادی گئی، بغیر کسی ردوبدل اور کمی بیشی کے مانتے چلے آئے، کیا اس پاکیزہ عبادت اور دین اسلام کے رکن اعظم کو ٹیکس قرار دے کر اس میں تبدیلی اور اضافہ کے مشورے دینا نرا مسخرہ پن نہیں؟ پھر اس سلسلہ میں پیش کردہ لفظی گورکھ دھندے اپنے اندر کوئی وزن رکھتے ہیں؟ اور "رکن اسلام" میں "عمل جراحی" کا مشورہ دینے والے "دانایانِ تیز ہوش" کیا خود دین محمدیؐ کا حلیہ بگاڑ دینے کی خدمت سرانجام دینے میں مصروف نہیں ہیں؟ کیا ان کا طرزِ عمل اور اندازِ تحقیق، اسلام کے ہاتھ پاؤں، ناک، کان، ہونٹ اور زبان کاٹ کر اور اسے تڑپا تڑپا کر کند چھری سے ذبح کرنے کے مترادف نہیں ہے؟ اور جب آج کی مہذب دنیا میں کسی چوہڑے چمار کے ساتھ بھی اس کے اعضا کاٹ کر مثلہ (بدشکل) بنانے کا یہ ناروا سلوک ناقابل برداشت تصور کیا جاتا ہے، تو "اسلامِ مظلوم" کے ساتھ یہ بدسلوکی کیسے برداشت کرلی جاتی ہے؟ اور اسلام کی مرمت کرنے والے بے رحم قصابوں کے ہاتھ میں نام نہاد "تحقیقات" اور "آزاد اجتہاد" کی یہ کند چھریاں کیوں دی جاتی ہیں؟ جن سے وہ آئے دن اسلام کے کسی نہ کسی جوڑ بند کو کاٹ کر لطف اندوز ہوتے ہیں، اور کٹے ہوئے اعضا کی تصویریں، رسائل اور اخبارات میں شائع کرتے ہیں، اور اپنے اجتہادی کارناموں پر دادِ تحسین کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

اب ذرا بحث کے دوسرے رخ پر نظر کیجئے! قرآن مجید کی کسی آیت، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد، اسلامی تاریخ کی چودہ صدیوں میں کسی صحابی،

کسی تابعی، کسی امام، کسی مجتہد، کسی فقیہ اور کسی معتبر عالم کے فتویٰ میں یہ ذکر کبھی آپ کی نظر سے گزرا کہ ”زکوٰۃ بھی ایک ٹیکس ہے“ اور اسے نام نہاد ضروریات کی آڑ لے کر تبدیل کیا جاسکتا ہے؟ اور یہ کہ اگر اسے تبدیل نہ کیا گیا تو یہ ہوجائے گا، وہ ہوجائے گا، آسمان ٹوٹ پڑے گا، زمین ہل جائے گی اور دنیا تہہ و بالا ہوجائے گی؟ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ قرآن میں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مقدسہ میں اور امت محمدیہ کے قابل اعتماد علماءؒ کے اقوال میں یہ افسانہ کہیں نہیں ملتا، تو آج چودہ سو سال بعد کون سا قرآن نازل ہوگیا، جس کی روشنی میں ”نیا اسلام“ پیش کرنے والے محقق، لوگوں کو یہ بتلاتے ہیں کہ: ”زکوٰۃ بھی ایک ٹیکس ہے اور اس کی شرح میں ترمیم کی جاسکتی ہے۔“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ قرآن تو زکوٰۃ کے بارے میں ٹیکس کا نظریہ پیش کرنے والوں کو ”صریح منافق“ قرار دیتا ہے، چنانچہ سورہ توبہ میں اس منافق کا مفصل تذکرہ موجود ہے، جس نے اپنے خبث باطن کا مظاہرہ کرتے ہوئے زکوٰۃ کے بارے میں کہا تھا: ”یہ تو محض ٹیکس ہے، یہ تو ٹیکس ہی کی بہن معلوم ہوتی ہے، اچھا تم جاؤ میں غور کروں گا۔“ جانتے ہو! کہ اس ”ٹیکسی مجتہد“ میں غور کروں گا کی منطق الاپنے والے پر قرآن نے کیا فتویٰ عائد کیا؟ سنو اور گوش ہوش سے سنو...!!

”فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ.“ (التوبہ:۷۷)

ترجمہ:...... ”سو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس فعل کی سزا میں ان کے دلوں میں نفاق قائم کردیا جو خدا کے پاس جانے کے دن تک (دم مرگ تک) رہے گا، اس سبب سے کہ انہوں نے خدا تعالیٰ سے اپنے وعدہ میں خلاف کیا اور اس سبب سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔“

پھر قرآن مجید کی اسی سورت میں یہ نظریہ ان لوگوں کی طرف منسوب فرمایا گیا ہے جن کے کفر و نفاق کی شدت پر نفرین کرتے ہوئے قرآن نے کہا:

”اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا یَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ. وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یَّتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّیَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ... الخ.“ (التوبہ:۹۷، ۹۸)

ترجمہ:...... ”(ان منافقین میں) دیہاتی لوگ کفر و نفاق میں بہت سخت ہیں اور ان کو ایسا ہونا ہی چاہئے کہ ان کو ان احکام کا علم نہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں۔ اور ان (مذکورہ منافقین) دیہاتیوں میں سے بعض بعض ایسا ہے کہ جو کچھ خرچ کرتا ہے، اس کو (مثل جرمانہ) سمجھتا ہے اور تم مسلمانوں کے واسطے گردشوں کا منتظر رہتا ہے۔“

پہلی آیت میں ”زکوٰۃ ٹیکس ہے“ کے نعرہ کو دروغ بافی (صریح جھوٹ) اور دائمی نفاق کا موجب قرار دیا گیا ہے، اور دوسری آیت میں انفاق فی سبیل اللہ، جس کا اہم فرد زکوٰۃ ہے، تاوان، ٹیکس، جزیہ اور جرمانہ قرار دینے کا منشا بدترین درجہ کا کفر و نفاق اور احکام الٰہیہ کے حقائق سے فطری ناواقفی اور جہالت بتلایا گیا ہے۔

ارشادات نبوت میں سے ایک ارشاد آغاز کلام میں نقل کرچکا ہوں، جس میں زکوٰۃ کو ٹیکس قرار دینے پر من جملہ دیگر امور کے پے در پے عذاب و عتاب نازل ہونے کے خطرہ سے آگاہ فرمایا گیا ہے، اور اس میں یہ اشارہ بھی دیا گیا ہے کہ یہ نظریہ مسلمانوں کے دور انحطاط، مسخ شدہ عقلیت اور بہیمانہ خواہشات کے ”جذبہ بے جا“ کی پیداوار ہوگا، اس لئے کہ اس نظریہ کا تذکرہ جن امور کے ساتھ فرمایا گیا، اور

ان پر جس قسم کے بدترین مصائب کے خطرہ کی نشاندہی اس حدیث میں فرمائی گئی ہے وہ کسی طرح بھی مسلمانوں کے زمانہ عروج، صحیح عقلیت اور صالح جذبات کے ماحول میں پیدا نہیں ہوسکتے، میرا خیال ہے کہ ٹیکسی نظریہ کی قباحت کے لئے یہی حدیث کافی ہے، جس کی صداقت پر دورِ حاضر کی نام نہاد ترقی اور اس کے مہیب عواقب نے مہر تصدیق ثبت کردی ہے۔

علاوہ ازیں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ کے بارے میں جو موقف اختیار کیا اس سے ٹیکس، ٹیکس کا بر خود غلط پروپیگنڈا کرنے والوں کا شرعی حکم ہمیشہ کے لئے واضح ہوگیا۔ صدیقی دورِ خلافت میں منع زکوٰۃ کا جو فتنہ اٹھا تھا اس میں ان فتنہ پردازوں کا نظریہ یہ نہیں تھا کہ اسلام میں زکوٰۃ کا سرے سے وجود ہی نہیں، بلکہ ان کا خیال یہ تھا کہ زکوٰۃ میں اگرچہ کسی درجہ میں عبادتی پہلو بھی پایا جاتا ہے لیکن وہ دراصل ایک ٹیکس ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قومی ضروریات کے لئے نافذ کیا تھا، حافظ العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں:

"ان کا خیال یہ تھا کہ زکوٰۃ دراصل ایک مالی ٹیکس ہے، جس طرح بادشاہ اپنی رعایا سے مختلف قسم کے مالی ٹیکس وصول کیا کرتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کی وصولی آپؐ کے دائرۂ اختیار میں تھی، اور اب جبکہ ہم نے اپنے میں سے والی چن لئے ہیں تو زکوٰۃ ہم سے ساقط ہوگئی اور دیگر مالیاتی ٹیکسوں کی طرح زکوٰۃ کا معاملہ بھی والی اور حاکم وقت کی رائے پر ہے۔" (فیض الباری ج:۱ ص:۱۰۹)

لیکن حضرت صدیق رضی اللہ عنہ اور آپ کے تمام رفقا نے زکوٰۃ کے بارے میں اس نظریہ کے پیش کرنے والوں کو مرتد اور خارج از اسلام قرار دیا اور ان کے خلاف لشکر کشی کی اور ان سے وہی معاملہ کیا جو مرتدین کی جماعت سے کیا جاتا

ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس پر "باب من ابی قبول الفرائض وما نسبوا الی الردۃ۔" (جو لوگ فرائض کے قبول کرنے سے انکار کریں ان کا اور ان کے ارتداد کا بیان) کا عنوان قائم فرما کر زکوٰۃ میں ٹیکس کی تاویل کا پیوند لگانے والوں کے ارتداد کی تصریح فرمائی۔ (بخاری شریف ج:۲ ص:۱۰۲۳ مطبوعہ کراچی)

ان تمام بیانات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ٹیکس کا پرچار کرنے والے دوستوں کا یہ پروپیگنڈا اسلام کی نظر میں کہاں تک قرین عقل و دانش اور مبنی بر صواب ہے۔

اب اس موضوع پر ایک اور پہلو سے غور کیجئے! انگریز نے اپنے دورِ اقتدار میں سیاست، معاشرت اور اقتصاد کے جس راستہ پر مسلمانوں کو ڈالا، ظاہر ہے کہ اس کے پیش نظر اسلام سے ہمدردی کا معمولی جذبہ بھی نہ تھا۔ اس نے ہمارے ممالک اسلامیہ میں جس قسم کے تعلیمی، عدالتی، معاشرتی اور اقتصادی نظام جاری کئے، ان میں نہ تو کتاب و سنت سے روشنی حاصل کرنے کا سوال پیدا ہوتا تھا، نہ اسلامی مزاج کے برقرار رکھنے کا کوئی تصور سامنے رکھا گیا تھا، آزادی کے بعد ہم غلامی کے سیاہ دور کے جبراً مسلط کردہ فرنگی نظام میں کوئی معتد بہ تبدیلی پیدا کردینے کی جرأت مردانہ تو نہیں کرسکے البتہ اس دور کے ہر نظامِ زندگی پر اسلام کی "چھاپ" لگا دینے کو تحقیقی کارنامہ تصور کرنے لگے ہیں، مثلاً یہ کہ دورِ غلامی کے نظام تعلیم میں کسی خاص تبدیلی پر ہم قادر نہ ہوسکے، طرزِ تعلیم سے لے کر نصابِ تعلیم تک کا اکثر حصہ موروثی ہے، البتہ بڑے فخر سے ہمارے اسکول اور کالج کے صدر دروازوں پر: "طلب العلم فريضة على كل مسلم ومسلمة." لکھا جانے لگا ہے، گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مقدس اسی تعلیم کے بارے میں صادر ہوا تھا جو ہمیں صاحب بہادر سے ورثہ میں ملی۔ اسی طرح تاج فرنگ نے جو نظام معیشت رائج کیا، اس کی بنیاد اسلامی تعلیم کا لحاظ رکھے بغیر سرمایہ داری پر رکھی گئی، اور اسی سرمایہ دارانہ نظام کی کوکھ سے بینک کے سودی نظام

نے جنم لیا، اور اس سے متوسط اور نچلے طبقہ کی معیشت کا تباہ ہوجانا بالکل منطقی تھا۔ سرمایہ دار جتنا قوی سے قوی تر ہوتا گیا، غریب اسی نسبت سے افلاس اور ناداری کی چکی میں برابر پستا چلا گیا، آزادی کے بعد بجائے اس کے کہ ہم اسلام کا عادلانہ نظام معیشت اپناتے، اور انگریز کے مسلط کردہ معاشی نظام اور اس کے فرزند ارجمند ''بینک کے سودی نظام'' پر تھوک دیتے، ہوا یہ کہ اس نظام کو علیٰ حالہٖ رکھ کر اسے ''اسلام'' ثابت کرنے پر تحقیقات شروع کر دی گئیں اور آزاد اجتہاد کی قوت سے بینک کے سود پر نہ صرف حلال اور طیب بلکہ واجب اور ضروری کی چھاپ لگادی گئی، بالکل یہی صورت حال مالیاتی نظام میں واقع ہوئی، مغربی فرمانرواؤں نے اسلام کے مالیاتی نظام کی ادنیٰ پروا کئے بغیر بلاامتیاز مذہب و ملت، مملکت کے تمام شہریوں پر جزیہ اور ٹیکس عائد کیا، مسلمان بے چارے ایک طرف زکوٰۃ، عشر اور صدقات ادا کرتے جو ان کے دینی وظائف اور مذہبی فرائض تھے، اور دوسری طرف برٹش گورنمنٹ ان سے مختلف اقسام کے ٹیکس وصول کرتی، آزادی کا سورج طلوع ہوجانے کے بعد ہماری دینی حمیت، ملی غیرت اور مذہبی احساس کا تقاضا یہ ہونا چاہئے تھا کہ اس ٹیکسیشن نظام پر لات مار کر اس کی جگہ اسلام کے مالیاتی نظام کو لاتے، اہل اسلام سے زکوٰۃ، عشر اور صدقات وصول کرتے، اور غیر مسلم ذمیوں سے جزیہ اور خراج وصول کرتے اور اسلام نے آمدنی کے جس شعبہ کے لئے جو مدات متعین فرمائی تھیں، پوری دیانتداری، خدا خوفی اور کامل احتیاط کے ساتھ ان ہی میں خرچ کرتے، لیکن ہم موروثی نظامِ مالیت میں ادنیٰ تبدیلی کئے بغیر یہ چاہتے ہیں کہ دورِ غلامی کا مالیاتی نظام جوں کا توں رہے، مگر اس پر اسلام کا ''ٹھپہ'' لگادیا جائے، یوں:

رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی!

یہ ہے ہمارے ٹیکسی دوستوں کی تحریک کا پس منظر! انگریز کے عطا کردہ ٹیکسیشن نظام کو اسلام ثابت کرنے کے لئے بحث و تمحیص کی ساری تان یہاں آکر

ٹوٹتی ہے کہ: ''زکوٰۃ ٹیکس ہے۔'' اس لئے جو ٹیکس بھی عائد کیا جائے گا وہ زکوٰۃ ہی کا مقدس نام حاصل کرے گا۔ لطف یہ ہے کہ اس ''ماڈرن زکوٰۃ'' کی نہ کوئی مقدار معین ہے، نہ اس کا کوئی مصرف طے شدہ ہے، بس جو ٹیکس لگایا جائے گا اور جہاں خرچ کردیا جائے گا اسے ''زکوٰۃ شریف'' ہی کہا جائے گا، ورنہ اسلام خطرے میں ہے، مزید برآں یہ کہ اس تفتیش کی بھی ضرورت نہیں کہ یہ ٹیکس کس شخص سے وصول کیا جاتا ہے؟ اور کس مال پر عائد کیا جاتا ہے؟ شراب اور افیون کے ٹھیکیداروں سے جو ٹیکس وصول کیا جائے، سینما کے ناچ اور گانے پر جو ٹیکس لگایا جائے اور ملک کے غیر مسلم باشندوں سے جو ٹیکس وصول کیا جائے، اس قسم کے تمام ٹیکسوں کو بھی اسلامی رکن ''زکوٰۃ'' کے تحت لانا ہوگا، ورنہ اسلامی تحقیقات اور ''ماڈرن اجتہاد'' کے کس بل نہیں نکلیں گے:

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است!

اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی توجہ طلب ہے، اور وہ یہ کہ ہمیں گہرے غور و فکر اور انتہائی عقل و بصیرت سے زکوٰۃ اور ٹیکس کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے دونوں کے اوصاف ذاتیہ اور لوازم قریبیہ کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا چاہئے کہ جو اصحابِ فکر و نظر زکوٰۃ پر بھی ''ایں ہم بچہ شیر است'' کا خود غرضانہ دعویٰ کرتے ہیں، ان کا یہ پروپیگنڈا کہاں تک حقیقت پسندانہ ہے؟ میں چاہتا تھا کہ اس موضوع پر کوئی صاحبِ بصیرت قلم اٹھاتا، تاکہ میرے جیسے بے بضاعت اور نادان طالب علم کی ژولیدہ بیانی کی حاجت نہ رہتی، لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! آیئے اپنی پرواز کی حد تک دونوں پر غور کرلیں، اور یہ نظریہ ذہن میں رکھیں کہ اگر کوئی بات غلط ہوگی یا اندازِ بیان میں کسی جگہ سقم ہوگا تو ہمارے اکابر خود ہی تصحیح فرمالیں گے۔

زکوٰۃ:

۱:...... زکوٰۃ خدا تعالیٰ کا نازل کردہ فریضہ ہے جو بندوں پر فریضۂ عبدیت کی

حیثیت سے فرض فرمایا گیا ہے۔

۲:......زکوٰۃ ابتدائے نزول سے لے کر آج تک اعلیٰ ترین عبادت کا تصور اپنے اندر رکھتی ہے۔

۳:......فرضیت زکوٰۃ کا ہدف اصلی خدا تعالیٰ کی رضاطلبی اور آخرت کی سرخروئی ہے۔

۴:......زکوٰۃ صرف اہل ایمان پر فرض کی گئی ہے۔

۵:......زکوٰۃ میں مال کی پاکیزگی کا تصور ہمہ وقت سامنے رکھا گیا ہے، یعنی زکوٰۃ صرف مالِ حلال پر فرض ہے، کسبِ حرام سے زکوٰۃ ادا کرنے کے کوئی معنی نہیں۔

۶:......زکوٰۃ میں یہ ضمانت دی گئی ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے والے کے مال میں برکت ہوگی، حق تعالیٰ اس کی حفاظت فرمائیں گے اور اس کا مال پاک ہوجائے گا، جیسا کہ قرآن وحدیث کے نصوص اس پر شاہد ہیں۔

۷:......زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر حق تعالیٰ کی ناراضی، آخرت کی ذلت اور رسوائی اور جہنم کے عذاب کی خبر دی گئی ہے۔

۸:......زکوٰۃ صرف اس مال پر لی جاتی ہے جس میں نمو کی صلاحیت ہو، یعنی نقدی، مالِ تجارت اور مواشی جو نسل کشی کے لئے ہوں، اس لئے زرعی، صنعتی اور اہل حرفہ کے آلات جو تجارت کے لئے نہ ہوں بلکہ استعمال کے لئے ہوں ان پر زکوٰۃ نہیں لی جاتی۔

۹:......زکوٰۃ اس شرط کے ساتھ عائد ہوتی ہے کہ اس مال پر سال گزر جائے، گویا سال میں دو دفعہ زکوٰۃ نہیں۔

۱۰:......زکوٰۃ صرف اسی مال پر فرض ہوتی ہے جو قرض اور حاجات اصلیہ سے زائد ہو، فرض کیجئے کہ ایک شخص کے پاس ہزار روپیہ ہے اور سال بھر کے اخراجات کے بعد بھی اس کے پاس اتنی مالیت بچ رہتی ہے لیکن وہ پانچ صد روپیہ کا مقروض ہے

تو اس پر پانچ صد روپے کی زکوٰۃ فرض ہوگی۔

۱۱:......زکوٰۃ جن اموال پر فرض کی گئی ہے ان کی فہرست محدود ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دفعہ گدھے اور خچر کی زکوٰۃ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرمادیا کہ: ”ان کے بارے میں مجھ پر کچھ نہیں نازل کیا گیا۔“ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اموالِ زکوٰۃ کی معین فہرست خدا تعالیٰ کی نازل فرمودہ ہے، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہاد کا بھی دخل نہیں، کسی دوسرے کی تو بات ہی کیا ہے۔

۱۲:......زکوٰۃ خاص مالیت اور خاص نصاب پر فرض ہوتی ہے جو کسی کے اجتہاد کا نتیجہ نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی جانب سے نازل فرمودہ ہیں، جیسا کہ احادیث صحیحہ میں اس کی تصریح فرمائی گئی ہے۔

۱۳:......زکوٰۃ اپنی معین مقدار رکھتی ہے جو حسب تصریح احادیث منزل من اللہ ہے اور چودہ صدیوں تک اس کا محفوظ رہنا اس کی بجائے خود ایسی دلیل ہے جس کے جھٹلانے والے پر دماغی توازن کھو بیٹھنے کا شبہ ہوتا ہے۔

۱۴:......زکوٰۃ چونکہ اپنے نصاب، اپنے تشخص اور دائرۂ نفاذ کے لحاظ سے منزل من اللہ ہے، اس لئے کسی حاکم، امام، خلیفہ بلکہ خود نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی اس کے کل یا بعض کے معاف اور ساقط کردینے کا اختیار نہیں دیا گیا۔

۱۵:......زکوٰۃ کا مصرف مسلمان حاجت مند ہوسکتا ہے، اس لئے نہ وہ غیر مسلم پر خرچ کی جاسکتی ہے نہ کسی غیر حاجت مند مسلمان کا اس میں کوئی حق ہے۔

۱۶:......زکوٰۃ دینے والا زکوٰۃ سے نہ خود منتفع ہوسکتا ہے، نہ اس کے خاص متعلقین جن کے ساتھ ان کے منافع مشترک ہیں، بلکہ زکوٰۃ دے کر اگر فقیر سے شکریہ کی توقع رکھے تو اجر باطل ہوجاتا ہے۔

ٹیکس:

۱:......ٹیکس انسانی ذہن کی ایجاد ہے جو اسلام سے پہلے بھی اور بعد از اسلام بھی غیر مسلم سلاطین اور حکام کی جانب سے نافذ کیا جاتا رہا۔

۲:......اور ٹیکس میں عبادت کا ادنیٰ تصور بھی کسی ملک اور کسی قوم نے کسی زمانہ میں کبھی پیش نہیں کیا۔

۳:......اور ٹیکس میں رضائے خداوندی اور فلاحِ آخرت کے سوال کا دور دور تک بھی کہیں پتہ نشان نہیں ملتا، اس کا وجود دنیا اور صرف دنیا میں گم ہوکر رہ جاتا ہے۔

۴:......اور ٹیکس میں کسی مذہب و ملت کی تمیز نہ کبھی کی گئی، نہ اب کی جاتی ہے۔

۵:......اور ٹیکس میں یہ تصور سرے سے مفقود ہے، اسے حلال وحرام کی بحث سے کوئی سروکار نہیں، وہ ہر خبیث اور طیب پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔

۶:......اور ٹیکس برکت، حفاظت اور مال کی صفائی کی ضمانت کا بوجھ اٹھانے سے قطعاً عاری ہے، برکت اور حفاظتِ خداوندی اس کی لغت سے خارج ہیں۔

۷:......اور ٹیکس ان لوگوں کی طرف سے بھی جو خدا اور آخرت کے قائل ہی نہیں اسی طرح عائد کیا جاتا ہے جس طرح قائلین کی جانب سے، جس سے واضح ہوجاتا ہے کہ ٹیکس میں خدا خوفی اور فکرِ آخرت کا کوئی جذبہ کارفرما نہیں۔

۸:......اور ٹیکس اس تفتیش میں مبتلا نہیں ہوتا، اس لئے بھاری قسم کے ٹیکس صرف آلات استعمال پر لگائے جاتے ہیں۔

۹:......اور ٹیکس اس شرط سے آزاد ہے، بہت سے ٹیکس ایک ہی چیز پر سال میں کئی کئی دفعہ بھی وصول کئے جاسکتے ہیں۔

۱۰:......اور ٹیکس کو اس امر کی کوئی پرواہ نہیں کہ یہ مال اس کی ضروریات

اصلیہ سے زائد بھی ہے یا نہیں؟ اور اس شخص کے ذمہ کچھ قرض تو نہیں، وہ اس تمام بحث میں پڑے بغیر کل آمدنی (منافع) پر نافذ ہوجائے گا۔

۱۱:......ٹیکس اپنے دائرۂ اختیار کی حد بندی کا قائل نہیں، وہ صرف اموال پر نہیں بلکہ ذوات پر بھی عائد ہوسکتا ہے اور شادی ٹیکس، چولہا ٹیکس، پیدائش ٹیکس، تک پھیل جاتا ہے، اور اگر کسی شہر میں داخلے کا اتفاق ہوجائے یا کسی دریا کے مصنوعی پل کو عبور کرنے کی نوبت آجائے تو ''آدمی ٹیکس'' سے ''مرغی ٹیکس'' تک اس کی حدود وسیع ہوجاتی ہیں، الغرض وہ اپنی طویل وعریض فہرست میں ہمہ وقت مزید در مزید اضافہ کا خواستگار رہتا ہے۔

۱۲:......ٹیکس اس پابندی کا بھی قائل نہیں، وہ نصاب کی تعیین میں خدا کا محتاج نہیں بلکہ جتنی مالیت پر اس کا جی چاہے وہ نافذ ہوسکتا ہے، آپ اپنے عزیز کے لئے ایک سیر گھی شہر میں لے جائیں، تو اس پر بھی ٹیکس حق طلبی کا دعویٰ کرسکتا ہے۔

۱۳:......ٹیکس اس قید سے بھی آزاد ہے، وہ ہر سال چھ مہینے بعد نئے اضافوں کی شکل میں اضعافاً مضاعفہ بڑھتا رہتا ہے۔

۱۴:......ٹیکس اربابِ اقتدار کے دائرۂ اختیار کی چیز ہے، اس لئے وہ اسے کُلّاً یا بعضاً ساقط کردینے میں بااختیار ہیں کیونکہ وہ کسی مرحلہ میں بھی وحی الٰہی کا پابند نہیں (اور ماتحت افسران کا رشوت وغیرہ لے کر کم اندراج کرنا تو ایک عام بات ہے)۔

۱۵:......ٹیکس امیر، غریب، مسلم، غیر مسلم سب کے مفاد پر خرچ کیا جاتا ہے۔

۱۶:......ٹیکس کے منافع میں ٹیکس دینے والا بھی بدستور شریک رہتا ہے بلکہ صحیح لفظوں میں ہر شخص کی طرف سے ٹیکس کی ادائیگی صرف ان اجتماعی فوائد کے حصول کے لئے ہوتی ہے، جو اس کی طرف عائد ہوتے ہیں، یا اربابِ اقتدار کی جانب سے ان کا یقین دلایا جاتا ہے۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور ۲۱/اکتوبر ۱۹۶۶ء)

رفیع اللہ شہاب کے نظریہ
''زکوۃ عبادت یا ٹیکس؟'' کا جائزہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

ہماری کتابوں میں سوفسطائیت اور لاادریت کے دو لفظ ملتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بعض لوگ شک و ارتیاب کے اس درجہ مریض تھے کہ تمام حقائق عالم کے بارے میں شکی ذہن رکھتے تھے، حتیٰ کہ انہیں خود اپنے وجود میں بھی شک رہا کرتا تھا اور حد یہ کہ اس شک میں شک در شک کا تسلسل ان کے یہاں قائم رہتا، گویا یقین و اطمینان کی دولت سے ان کا کیسہ ذہن یکسر خالی تھا، علماء و حکماء ان کو دلائل و براہین سے سمجھانے کی کوشش کرتے لیکن نتیجہ صرف لا ادری (میں نہیں جانتا) کے جواب کی صورت میں ظاہر ہوتا۔ نوعمر طالب علم جب ان کا یہ تشکیکی تذکرہ پڑھتا ہے تو حیرت سے یہ سوچنے بیٹھ جاتا ہے کہ ایسا کون ہوگا جو بقائمی عقل و خرد، اپنی سر کی آنکھوں سے آفتاب کو دیکھے اور پھر بڑی سنجیدگی سے کہے کہ: ''اس میں شک ہے اور اس شک میں بھی شک ہے۔'' حقائق عالم کے بارے میں ایسے لوگوں کا واقعی وجود ہو یا نہ ہو لیکن دینی حقائق کے بارے میں ایسے شکی مزاج سرپھرے بہرحال پائے جاتے ہیں جو فسطائیت کی مصلحت آمیز پالیسی پر گامزن ہیں۔

دین اسلام کے ان حقائق سے کون ناواقف ہوگا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی تھے، آپؐ نے اللہ کا کلام قرآن مجید پیش کیا جو لفظاً و معناً ابدی ہے، قرآن اور نبیؐ کا ہر فیصلہ امت کے لئے واجب التسلیم ہے، امت قرآن و سنت کے فیصلوں کی پابند ہے، نہ ان کے کسی شوشے کو منسوخ کرسکتی ہے، نہ ان کے کسی فیصلہ کو بدل ڈالنے کی مجاز ہے۔ اسلام کے بنیادی ارکان پانچ ہیں۔ جو شخص ارکانِ خمسہ کی رکنیت، فرضیت اور عبادتی حیثیت کا انکار کرے وہ دین سے خالی ہے، اسلام کامل و مکمل نظامِ حیات کا حامل ہے جو زندگی کے تمام شعبوں اور ہر شعبہ کے ہر جزوی پہلو کے بارے میں رہنمائی کا داعی ہے۔ اسلام میں سود، قمار، شراب اور تمام فحش و منکرات حرام ہیں۔ معراجِ رسول حق ہے، معجزات انبیا حق ہیں، کرامات حق ہیں، مسئلہ تقدیر حق ہے، جنت و دوزخ حق ہیں، عذاب قبر حق ہے، آخرت حق ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ اور اس قسم کے بے شمار اسلامی حقائق اور ضروریاتِ دین کے بارے میں کیا یہ تصور ممکن ہے کہ کوئی شکی مزاج بقائمی عقل و خرد، دین و ایمان، ان کا انکار کردے گا؟

لیکن ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے بعض افراد کی سوفسطائیت نے اس ناممکن کو ممکن کر دکھایا ہے۔ وہاں تمام ''ضروریاتِ دین'' کو شک و ارتیاب کے طوفان کی نذر کردینا ہی اصل تحقیقی کارنامہ قرار پاتا ہے۔ آپ اسلام کے قطعی، یقینی اور واقعی حقائق میں سے ایک ایک کے بارے میں دریافت کرتے جایئے، وہاں سے ''اس میں شک ہے'' کی قسم کا جواب ملتا چلا جائے گا، وہاں بتلایا جاتا ہے کہ:

''حدیث و فقہ کا تمام ذخیرہ عہد وسطیٰ کی رنگ آمیزی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف اخلاقی مصلح تھے، آپؐ نے امت کو کوئی قانونِ عام نہیں دیا، قرآن کا قانونی یا قانون نما حصہ محض وقتی اور ہنگامی حالات و ظروف سے متعلق تھا، ابدیت قرآن کا یہ مفہوم غلط ہے کہ اس کے احکام قیامت تک کبھی

انسانوں کے لئے واجب العمل ہیں، معراج رسولؐ کا عقیدہ محض توہم پرستی ہے جو عیسائیت سے برآمد کی گئی، نزولِ عیسیٰؑ اور آمد مہدیؑ محض افسانے ہیں جو مسلمانوں میں یوں ہی رواج پذیر ہوگئے، مسئلہ تقدیر کو محض ایک مصلحت کی بنا پر رواج دیا گیا، مسئلہ شفاعت، مسیحیت کے عقیدۂ کفارہ کے جواب میں بنایا گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں شان ایزدی پیدا کرنے کے لئے کثیر التعداد معجزات آپؐ کی طرف یونہی منسوب کردیئے گئے، بینک کا سود نہ صرف حلال بلکہ فرض ہے، تیرہ صدیوں کے علمأ وفقہأ کی اسلامی تحقیقات یا تو غلط ہیں یا پھر ان کے زمانہ کے موافق تھیں، ہمیں قرآن و حدیث، فقہ کو تاریخی بحث کا موضوع بنانا ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔

یہ ہے جدید سوفسطائیت کا اجمالی خاکہ...!!

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کا ایک ایک حصہ جو ان کی خواہشات سے ٹکراتا ہو، اسے حرفِ غلط کی طرح مٹانا، صحیح احادیث نبویؐ کو انمل، بے جوڑ اور مصنوعی کہہ کر ان کا مذاق اڑانا، تمام علمأ امت کو تاریخ ساز کا لقب دینا، حدودِ اسلام کی محافظت پر، روایت پرستی، قدامت پسندی کے فقرے چست کرنا، خدا کے نازل کردہ دین کو روایتی اسلام، راسخ العقیدہ اسلام محض پوست، مغز سے محروم، ایک ظاہری رسمی ڈھانچہ اور روح سے عاری قرار دینا اس سوفسطائیت کی غذا ہے۔

گزشتہ سال ادارۂ تحقیقات اسلامی کے سربراہ نے اسلام کے تیسرے رکن زکوٰۃ کو ٹیکس کے معزز لقب سے نوازا تھا (اگرچہ اس کی عبادتی حیثیت کا بھی فی الجملہ اقرار تھا)، ان کے رفقأ نے ان کی شرح و تفسیر کا سلسلہ شروع کردیا، اس کے جواب میں علمأ امت نے زکوٰۃ کے بنیادی اوصاف بیان کئے، زکوٰۃ اور ٹیکس کے درمیان

بیسیوں فرق بتلائے، اسلام کے مالیاتی نظام کو واضح کیا، موجودہ دور میں حکومت کی اقتصادی مشکلات کا حل پیش کیا، لیکن بقول شخصے: ”پرنالہ وہیں کا وہیں رہا۔“

قرآنی آیات، احادیث نبویہ، اجماع امت، اکابر سلف کے ارشادات، ادارہ تحقیقات کی لاادریت کا زنگ نہ اتار سکے:

”اَفَرَأَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشَاوَةً فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ۔“ (الجاثیۃ:۲۳)

ترجمہ:...... ”جس نے اپنی خواہش ہی کو اپنا معبود بنالیا ہو اور علم کے باوجود اللہ نے اسے گمراہ کردیا ہو، اس کے کان اور دل پر مہر کردی ہو اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہو، تمہیں بتلاؤ کہ اللہ کے بعد اسے کون راہِ راست پر لاسکتا ہے؟ تم اتنا نہیں سوچتے!“

”فکر ونظر“ مارچ ۱۹۶۷ء کے شمارے میں کسی ابوشہاب رفیع اللہ نامی بزرگ کا مضمون شائع ہوا جس کا عنوان ہے:

”کیا زکوٰۃ عبادت ہے یا ٹیکس“

ان صاحب کا مبلغ علم اسی سے واضح ہوجاتا ہے کہ آپ: ”ولنا انها عبادة۔“ کا ترجمہ فرماتے ہیں: ”اور ہمارے نزدیک یہ عبادت ہے۔“ ”مفهوم الزكوة الشرعية۔“ کا ترجمہ کیا جاتا ہے: ”زکوٰۃ کا شرعی مفہوم۔“ ”لاربوا۔“ کا ترجمہ فرماتے ہیں: ”ربوا جائز ہے۔“ اس کے مقابلے میں جس دجل وتلبیس اور بدفہمی وکج روی کا مظاہرہ کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایمان اور عقل کتنی قدر کی چیزیں ہیں، اور جب یہ دونوں چیزیں سلب کرلی جائیں تو آدمی مذکورہ بالا آیت کا مصداق کس طرح بن جاتا ہے۔

کیا یہ سوفسطائیت کسی مسلمان کے ذہن میں آسکتی ہے کہ اسلام کے رکن ثالث اور عظیم ترین فریضہ خداوندی کے عبادت ہونے کا انکار کردے اور آئندہ اعلان کیا کرے کہ اسلام کا تیسرا رکن عبادت نہیں بلکہ ٹیکس ہے، نعوذ باللہ من الجہل والغباوۃ!

”لتنقضن عرى الاسلام عروة عروة فكلما انتقضت عروة تشبث الناس بالتى قليها، فاولهن نقضا الحكم وآخرهن الصلوٰة۔“ (مسند احمد ج:۵ ص:۲۵۱۔ وفیض القدير شرح جامع الصغير ج:۵ ص: عن ابى امامة. صححه الحاكم والسيوطى وقال الذهبى رجال احمد رجال الصحيح)

ترجمہ:...... ”اسلام کے تمام حلقوں (قطعی مسائل) کو ایک ایک کرکے توڑ دیا جائے گا، جب ایک حلقہ ٹوٹا کرے گا تو لوگ اس کے ساتھ والے کو پکڑ لیا کریں گے۔ چنانچہ سب سے پہلے فیصلہ دل کا حلقہ توڑا جائے گا اور سب سے آخر میں نماز کا حلقہ ٹوٹے گا۔“

اس ارشاد میں ترتیب نیچے سے اوپر بیان ہوئی ہے، ادارہ تحقیقات چند ہی سال کی کارکردگی کے نتیجے میں اسلام کے تیسرے حلقہ (زکوٰۃ) کے عبادت ہونے کا انکار کرچکا ہے، اب اس کے بعد نماز اور پھر کلمہ طیبہ کا نمبر آتا ہے، جس دن ان دونوں پر بھی ہاتھ صاف کردیا گیا، اور وہ دن موجودہ رفتار کے پیش نظر کچھ زیادہ دور نظر نہیں آتا، اس دن ادارہ تحقیقات کے ڈائریکٹر کی یہ تمنا پوری ہوجائے گی کہ:

”تمام مشکلات کا آسان حل سیکولرزم ہے۔“

(ملاحظہ ہو فکر ونظر ج:۴ ش:۱ مقالہ تجدد پسندی کے اثرات)۔

زکوٰۃ عبادت یا ٹیکس؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

ہر دور کی بعض نمایاں خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جو افراد، طبقات اور معاشرے کے سبھی گوشوں میں سرایت کرجاتی ہیں، دورِ حاضر کی ایک اہم خصوصیت "کھیل اور تماشے کا تقدس" ہے۔ سوسائٹی کے اونچے اونچے افراد کو آپ کھیل کے میدان اور تماشے کی محفل میں حاضر پائیں گے، کھیل اور تماشا کی ہار جیت ریڈیو پر نشر کی جائے گی اور سنجیدہ اخبارات کی جلی سرخیوں میں انہیں جگہ دی جائے گی، اسی پر قوموں میں تفاخر ہوگا اور اسی پر سفر کے گراں قدر مصارف اور انعامات کی معقول رقمیں خرچ کی جائیں گی، گویا کھیل کود اور تفریح و تماشا موجودہ دور میں موجب ننگ و عار نہیں بلکہ سرمایہ عزت و فخر تصور کیا جاتا ہے۔

دورِ حاضر کی اسی مزاجی خصوصیت کا یہ اثر ہے کہ دین و مذہب بھی ایک طرح کا ذہنی کھیل اور دماغی تماشا سمجھا جاتا ہے، اس معاملہ میں ہر شخص مجتہد ہے، ہر ایک کی اپنی رائے ہے، اور دین کے ہر مسئلے میں ہر شخص اپنا اپنا فتویٰ صادر کرنے کے لئے بے تاب ہے، جسے تھوڑی بہت حرف شناسی کی نعمت مل گئی وہ بزعم خود ابوحنیفہؒ و شافعیؒ کے اجتہاد پر حرف زنی کا حق رکھتا ہے۔ دنیا کے عام شعبوں میں ابھی تک یہ اصول مسلّم ہے کہ کسی فن میں اس فن کے ماہرین ہی کی رائے قابل قبول ہوتی ہے،

کسی ماہر قانون کا قول طب میں اور کسی حاذق و پختہ کار طبیب کا قول قانونی دفعات کی تشریح میں حجت نہیں، لیکن دین، کھیل کا ایک ایسا میدان تصور کرلیا گیا ہے جس میں ہر ذوق کا کھلاڑی نہ صرف حصہ لے سکتا ہے بلکہ چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ کے مجتہدین کی تحقیقات کو بلکہ خاکم بدہن خود صاحب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کو تبدیل کرنے کی بھی اہلیت رکھتا ہے، معاذ اللہ!

دیگر فرائض و عبادات کی طرح قرآن کریم نے اہل اسلام پر زکوٰۃ کو فرض کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اسلام کے ان پانچ ارکان میں سے تیسرا رکن بتلایا، جن پر اسلام کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس کی مقدار، نصاب اور شرائط کی تعیین فرمائی، اس کے مصارف بیان فرمائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک پوری امت نے اس کی رکنیت، فرضیت اور عبادتی حیثیت کے منکر کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا، اور اس کی فرضیت کا اقرار کرنے کے باوجود زکوٰۃ ادا نہ کرنے والے کو فاسق قرار دیا، قرآن و حدیث اور اسلافِ امت کے ارشادات یہاں نقل کرنے کی ضرورت نہیں، یہ مسئلہ ضروریاتِ دین اور بدیہیاتِ اسلام میں داخل ہے، جس میں نہ کسی متنفس کا اختلاف ہے، نہ کوئی عاقل و بالغ مسلمان اس سے بے خبر ہے — لیکن دورِ حاضر کے تماشائی مزاج کی داد دیجئے کہ:

گزشتہ سال ادارۂ تحقیقات اسلامی کے سربراہ نے زکوٰۃ کو ٹیکس کے بلند خطاب سے مشرف فرمایا، اور اس کے منصوص مقادیر، نصاب اور مصارف میں تبدیلی کی ضرورت کا فتویٰ ایک سوالنامے کی صورت میں صادر فرمایا، غالباً اسلامی تاریخ میں پہلا یہ حادثہ تھا جس میں اسلام کے پاکیزہ فرض اور دین کے تیسرے ستون کو دماغی کھیل کا موضوع بنایا گیا، چنانچہ موصوف کے رفقا میں سے بہت سے لوگوں نے اس میں حصہ لیا، اور موصوف کے مختصر متن کی شرح و تفسیر میں طویل مقالات کا سلسلہ شروع کردیا گیا، البتہ اتنا احسان اب تک روا رکھا جاتا رہا کہ زکوٰۃ کو ٹیکس کہنے کے ساتھ اسے

عبادت بھی تسلیم کیا جاتا رہا۔ مگر اہل نظر جانتے تھے کہ یہ مصنوعی تکلف ہے کہ زکوٰۃ کو ٹیکس بھی کہا جائے اور عبادت بھی، آخر دنیا میں ایسا کون سا مذہب ہوگا جس نے ٹیکس کو عبادت اور رکنیت کا شرف بخشا ہو؟ زکوٰۃ کو ٹیکس قرار دینے کا پہلا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی فرضیت، عبادتی حیثیت اور پاکیزگی ختم ہوجائے گی، ٹیکس اور عبادت کے مفہوم کو یکجا کرنے کی کتنی بھی کوشش کیجئے مگر ان دونوں کا یکجا رہنا محال ہے، چنانچہ مزید جرأتِ رندانہ سے کام لے کر زکوٰۃ کے عبادت ہونے کا انکار کردیا گیا ہے۔ ادارۂ تحقیقات کے ماہنامے "فکر و نظر" مارچ ۱۹۶۷ء کے شمارے میں کسی ابوشہاب رفیع اللہ نامی صاحب کا مقالہ شائع ہوا ہے، جس کا عنوان ہے:

"کیا زکوٰۃ عبادت ہے یا ٹیکس؟"

اس مقالے میں جس کج فہمی کا مظاہرہ ہوا ہے وہ تو اپنی جگہ ہے لیکن اس سے کم از کم اتنی بات تو واضح ہوجاتی ہے کہ اب تک جن حضرات نے زکوٰۃ کو ٹیکس قرار دیا ہے، وہ اس کی عبادتی حیثیت کے قائل نہیں تھے، بلکہ ٹیکس کے ساتھ عبادت کی رٹ محض نمائشی تکلف تھا، اور یہ سارا ڈرامہ محض اسلام کے ستون کو گرانے کے لئے کھیلا جاتا رہا۔

"یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِؤُا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْکٰفِرُوْنَ." (الصف:۸)

ترجمہ:..... "یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (یعنی دین اسلام) کو اپنے منہ سے (پھونک کر) بجھادیں، حالانکہ اللہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا کر رہے گا۔" (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"ما ضل قوم بعد هدی کانوا علیه الا اوتوا الجدل" (ابن ماجه)

ترجمہ:...... "جب بھی کوئی قوم راہِ ہدایت سے ہٹ جاتی ہے اسے بحث وجدال کا مشغلہ دے دیا جاتا ہے۔"

ہماری بدقسمتی ہے کہ قرآن حکیم جیسی پاکیزہ کتاب، محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے اولوالعزم رسول اور اسلام جیسا پاکیزہ، معتدل اور جامع ترین دین ہماری راہنمائی کے لئے موجود ہے، مگر ہم اب تک اپنے کاروانِ حیات کی راہ و رسم اور منزل متعین نہیں کر سکے، کہیں بڑی رازداری سے سیکولرزم کے مشورے دیئے جارہے ہیں، کہیں کمیونزم کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا جارہا ہے، اور کہیں سوشلزم کو مسلمان بنانے کا منصوبہ پیش کیا جارہا ہے، اور کافی زور دار انداز سے کہا جاتا ہے کہ ہمارا قومی نصب العین "اسلامی سوشلزم" ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ دیگر حوائج زندگی کی طرح ہم نظریۂ حیات بھی باہر سے درآمد کریں گے، اور تھوڑی سی محنت سے اسے "اسلامی" بنالیں گے۔

ہمارے خیال میں اس "جنگ وجدال" میں حصہ لینے والے اہل فکر کو دو نکتے خاص طور سے سامنے رکھنے چاہئیں: اول یہ کہ جو قومیں اپنا نظریۂ حیات اور اس کی اصطلاحات تک میں درآمدی پالیسی کی خوگر ہوں انہیں زمانے سے اس انصاف کی توقع نہ رکھنی چاہئے کہ انہیں باعزت قوموں کی صف میں جگہ مل جائے گی، زمانہ ہمیشہ انہیں دریوزہ گر سمجھے گا۔ ترقی کی انتہائی بلندی پر پہنچ جانے کے بعد بھی ذہنی افلاس ان کا مقدر رہے گا اور انہیں ذہنی غلامی اور غیروں کی نقالی سے کبھی نجات نہ ہوگی۔

دوم یہ کہ کسی بنی بنائی شاہراہ کو چھوڑ دینا بڑا آسان ہے۔ لیکن ایک بار راستہ سے بھٹک جانے کے بعد قومیں صدیوں کی مسافت بے راہ روی کی تاریکیوں میں طے کرنے پر مجبور ہوجاتی ہیں۔ جن قوموں نے راہِ راست سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کی وہ طویل مسافت کے بعد بھی اپنا توازن قائم رکھنے میں کامیاب نہیں ہوسکیں۔ ضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ وباؤوا بغضب من اللّٰہ!

نصاب ومقادیر زکوٰۃ کی تبدیلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

مولانا نعمانی مدفیوضہم نے چند سال قبل جو تشریح حدیث کا سلسلہ شروع فرمایا تھا، اس کی تین جلدیں کتاب الایمان، کتاب الاخلاق والرقاق اور کتاب الصلوٰۃ پر مشتمل تھیں، جو قبولیتِ عامہ سے مشرف ہیں، زیرنظر جلد اسی بابرکت سلسلہ کی چوتھی کڑی ہے، جو ارکان ثلاثہ (زکوٰۃ، روزہ، حج) کی احادیث کے ترجمہ وتشریح کے لئے وقف ہے۔

اگرچہ امت مرحومہ اس وقت متعدد امراض کا شکار ہے، لیکن امت کا اصل مرض، مولانا محترم کی تشخیص کے مطابق، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے رابطۂ ایمان کا کمزور پڑجانا ہے، اسی کے علاج کے لئے ارشادات نبوت سے یہ "نسخۂ کیمیا" مرتب کیا جارہا ہے۔ احادیث کے انتخاب، ترتیب اور ترجمہ وتشریح میں متکلمانہ یا فقیہانہ نہیں، بلکہ عصری مزاج کے عین مطابق خالص داعیانہ انداز اختیار کیا گیا ہے، کتاب کے مطالعہ سے فرموداتِ نبویہ دل کی گہرائیوں میں اترتے چلے جاتے ہیں، اور ایمان وعمل اور یقین ومحبت میں اضافہ ہوجاتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ

مولانا موصوف اس کارِ خیر کے لئے موفق من اللہ ہیں، حق تعالیٰ موصوف کی صحت و عمر میں برکت عطا فرمائے تاکہ وہ اس مفید سلسلے کو جاری رکھ سکیں۔

شریعت مطہرہ نے وجوبِ زکوٰۃ کے لئے مال کی ایک خاص مقدار مقرر کی ہے، جسے ”نصابِ زکوٰۃ“ کہا جاتا ہے، مصنف محترم نے حکیم الامت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ سے اس کی حکمت اس طرح نقل فرمائی ہے:

”پانچ وسق (۳۰ من) کھجوریں ایک مختصر گھرانے کے سال بھر کے گزارے کے لئے کافی ہوجاتی تھیں، اسی طرح دو سو درہم میں سال بھر کا خرچ چل سکتا تھا، اور مالیت کے لحاظ سے قریب قریب یہی حیثیت پانچ اونٹوں کی ہوتی ہے، اس لئے اس مقدار کے مالک کو خوش حال اور صاحبِ مال قرار دے کر زکوٰۃ واجب کردی گئی۔“

اس پر مولانا محترم نے یہ نوٹ دیا ہے:

”حضرات علماء کے لئے یہ بات قابلِ غور ہے کہ اب جبکہ روپے کی قیمت اور حیثیت زمانۂ نبوت کے درہم کے مقابلے میں بھی بہت ہی کم رہ گئی ہے، بلکہ ہمارے ہی ملک میں اب سے پچیس سال پہلے روپے کی جو قیمت اور مالیت تھی، اس کا بھی صرف دسواں حصہ یا اس سے بھی کم رہ گئی ہے، تو اس صورت میں زکوٰۃ کا نصاب کم سے کم کیا ہوگا؟“ (ص:۳۶)

اور اس پر ایک ”متجدد“ معاصر نے یوں ”گرہ“ لگائی ہے:

”یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، جب معاشی حالات کی تبدیلی کی وجہ سے نصابِ زکوٰۃ میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی گئی ہے، تو آج جب اجتماعی حالات بہت زیادہ ہوگئے ہیں تو

کیا اس کی ضرورت نہیں کہ زکوٰۃ کے مصارف میں بھی مناسب تبدیلیاں کی جائیں؟“ (ماہنامہ فکر و نظر راولپنڈی فروری ۱۹۶۸ء)

نصاب یا مصارفِ زکوٰۃ میں ”مناسب تبدیلی“ پر غور کرنے سے پہلے اس اصولی مسئلہ پر غور کرلیا جانا ضروری ہے کہ شریعتِ مطہرہ نے عبادات کے لئے جو مخصوص شکلیں اور مقداریں صاف طور پر مقرر کردی ہیں، کیا کسی ظاہری مصلحت کے پیشِ نظر ان میں رد و بدل کیا جاسکتا ہے؟ مثلاً: نماز کے اوقات، تعدادِ رکعات، رکوع و سجود، یا دیگر ارکان و شرائط میں اجتماعی حالات کے مطابق ”مناسب تبدیلیاں“ کی جاسکتی ہیں؟ کیا فرض روزوں کی تعداد، مقدار یا اوقات کو بدلنا صحیح ہے؟ کیا حج کے زمان و مکان اور شرائط و ارکان میں وقتی حالات کی بنا پر تغیر جائز ہے؟ کیا نکاح کے قیود و شرائط کی رد و بدل پر غور کیا جاسکتا ہے؟ کیا شریعتِ مطہرہ کے قطعی حلال و حرام امور میں بدلے ہوئے معاشی اور اجتماعی حالات کی وجہ سے ”مناسب تبدیلی“ ممکن ہے؟

جہاں تک ہمارے ناقص علم و فہم کی رسائی ہے، اس قسم کی خودساختہ مصلحتوں کی بنا پر احکامِ شرعیہ میں تبدیلی کی تجویز عقلاً و نقلاً غلط ہے، حق تعالیٰ نے جن امور کے لئے خاص حدیں قائم کی ہیں، جن شرائط کو لازم کیا ہے، جو مقداریں قطعی طور پر مقرر کردی ہیں، حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے بارے میں واضح فیصلے دیئے ہیں، ان میں ادنیٰ سے ادنیٰ تبدیلی کی گنجائش نہیں، احکامِ الٰہیہ کو بدل دینے کا حق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہیں دیا گیا، چہ جائیکہ کسی ادنیٰ امتی کی عقلِ نارسا کو یہ منصب تفویض کردیا جاتا، ارشادِ خداوندی ہے:

”قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ“ (یونس:۱۵)

ترجمہ:......"آپ فرما دیجئے: یہ میرے بس کی بات نہیں کہ میں اسے ازخود بدل ڈالوں، میں تو صرف اس حکم کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجا جاتا ہے، اگر میں اپنے رب کی بے حکمی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔"

غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ شرائع الٰہیہ کے مقابلے میں مصلحت تراشی کا یہی مرض تھا، جس نے امم سابقہ کو غارت اور پہلی شریعتوں کو مسخ کیا، حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ، اسبابِ تحریف پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"من جملہ اسبابِ تحریف کے "استحسان" ہے، اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص یہ دیکھ کر کہ شارع نے ہر حکمت کے مناسب وضع کا حکم دیا ہے، ہمارے ذکر کردہ بعض اسرار تشریع کو سامنے رکھے اور پھر اپنی خود تراشیدہ مصلحت کے مطابق لوگوں کے لئے احکام وضع کرنے لگے، جیسا کہ یہود نے جب یہ دیکھا کہ شارع نے خاص جرائم کے لئے خاص نوعیت کی جو سزائیں مقرر کی ہیں، ان کا مقصد گناہوں سے باز رکھنا اور اصلاح کرنا تھا، اور اب (ہمارے بدلے ہوئے حالات میں ان احکام پر یہ مصلحت مرتب نہیں ہوتی بلکہ اس کے برعکس) رجم سے اختلاف اور جنگ و جدال برپا ہوتا ہے، اور اس میں بجائے اصلاح کے شدید فساد ہے، تو انہوں نے رجم کے بجائے منہ کالا کرنے اور کوڑے لگانے کی سزا مناسب سمجھی۔"

"فبين النبي صلى الله عليه وآله وسلم انه تحريف ونبذ لحكم الله المنصوص في التوراة بآرائهم." (حجۃ اللہ البالغہ، طبع منیریہ ج:۱ ص:۱۲۱)

ترجمہ:......"چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرمایا کہ یہود کا یہ طرزِ عمل تحریف اور محض اپنی رائے سے تورات کے منصوص حکم خداوندی کو پس پشت ڈالنا تھا۔"

معاشی اور اجتماعی حالات کی آڑ میں آج اگر زکوٰۃ کے نصاب اور مصارف میں "مناسب تبدیلیاں" کردی جائیں، کل روزے پر نظرِ عنایت ہونے لگے اور پرسوں نماز پر غور کیا جانے لگے، تو سوچنا چاہئے کہ کیا چند دن بعد ہماری شریعت کا حلیہ بھی اسی طرح بگڑ نہیں جائے گا، جس طرح یہود و نصاریٰ کی بدعقلی نے ان کی شریعتوں کو برباد کیا تھا؟ یہی وجہ ہے کہ احکامِ منصوصہ میں تبدیلی کو حکمائے امت نے کبھی برداشت نہیں کیا، مکہ و مدینہ اور حجازِ مقدس کی جو زمینیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں زیرنگیں اسلام آچکی تھیں، ان کے بارے میں امام ابویوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فلا يزاد ولا ينقص، لانه شئ قد جرىٰ عليه حكم رسول الله صلى الله عليه وسلم، فلا يحل للامام ان يحوله عنها." (کتاب الخراج ص:۵۸)

ترجمہ:......"ان میں کمی بیشی اور رد و بدل نہیں کیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ صادر ہوچکا ہے، اس لئے امام کے لئے یہ جائز نہیں کہ اسے بدل ڈالے۔"

ممکن ہے یہاں یہ کہا جائے کہ جب ہمیں کسی حکم شرعی کی مصلحت معلوم ہے، اگر کسی وقت وہ مصلحت اس پر مرتب نہ ہو تو اس حکم خداوندی کو ہٹا کر اس کے بجائے کیوں نہ ایسا حکم نافذ کردیا جائے جس پر وہ مصلحت مرتب ہوسکے۔ یہی وہ شبہ ہے جسے بعض لوگ نصوصِ قطعیہ کی قطع و برید کے جواز کے لئے بڑی آب و تاب سے

پیش کیا کرتے ہیں، وہ ہر حکم شرعی کی، اِدھر اُدھر سے کوئی نہ کوئی مصلحت ڈھونڈ لاتے ہیں، اور پھر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ چونکہ خدا کا یہ حکم اس مصلحت کو پورا نہیں کرتا، اس لئے اس کا بدل ڈالنا ہی عین تقاضائے اسلام ہے۔ لیکن یہ شبہ صریح مغالطہ پر مبنی ہے، ان مصلحت تراشوں سے دریافت کیا جائے کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ جو مصلحت آپ نے تجویز کی ہے، وہ شارع کی نظر میں بھی کوئی وزن رکھتی ہے؟ عقل جب خواہش نفس سے ہم رشتہ ہوتی ہے تو بسا اوقات مفاسد کو مصالح کی شکل میں جنم دیتی ہے، اس لئے ہوسکتا ہے کہ آپ کی تجویز کردہ مصلحت واقعہ کے اعتبار سے نہ ہو بلکہ مفسدہ ہو، پھر انسانی عقل کے لئے احکام شرعیہ کے تمام مصالح کا احاطہ کب ممکن ہے؟ اگر کسی حکم شرعی کی ایک آدھ مصلحت معلوم بھی ہوگئی تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ اس کے علاوہ حکم شرعی میں اور کوئی مصلحت نہیں؟ حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ، جنہیں شریعت کے اسرار وحکم کا امام تسلیم کیا گیا ہے، کتنی صفائی سے اس میدان میں انسانی عقل کی درماندگی کا اعتراف کرتے ہیں:

”ولا استوعب المذکور جمیع ما ھو مکنون فی صدورنا من اسرار الشریعة ..... ولا استوعب ما جمع اللہ فی صدورنا جمیع ما انزل علیٰ قلب النبی صلی اللہ علیه وسلم، وکیف یکون لمورد الوحی ومنزل القرآن نسبة مع رجل من امته؟ ھیھات ذالک! ولا استوعب ما جمع اللہ فی صدرہ صلی اللہ علیه وسلم جمیع ما عند اللہ تعالیٰ من الحکم والمصالح المرعیة فی احکامه تعالیٰ، وقد اوضح عن ذالک الخضر علیه السلام حیث قال: ”ما نقص علمی وعلمک الا کما نقص ھذا العصفور من البحر.“ فمن ھذا الوجه ینبغی

ان یعرف فخامة امر المصالح المرعیة فی الاحکام الشرعیة وانھا لا منتھیٰ لھا، وان جمیع ما یذکر فیھا غیر واف بواجب حقھا ولا کاف بحقیقة شانھا.“

(حجۃ اللہ البالغہ، طبع منیریہ ج:۲ ص:۲۰۴)

ترجمہ:...... ”وہ تمام اسرار شریعت جو ہمارے سینے میں محفوظ ہیں، اس کتاب (حجۃ اللہ) میں نہیں سما سکے ...... پھر جو اسرار ہمارے سینے میں جمع ہیں وہ ان تمام اسرار کو محیط نہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر نازل کئے گئے، جس ذات قدسی صفات صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اور قرآن نازل ہوا، اس کے ساتھ امت کے کسی معمولی فرد کو آخر کیا نسبت ہوسکتی ہے؟ قطعاً کوئی نسبت نہیں! پھر جو اسرار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں اللہ تعالیٰ نے جمع کئے تھے وہ ان تمام اسرار الٰہیہ پر حاوی نہیں، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام میں ودیعت فرمائے ہیں، اس امر کو حضرت خضر علیہ السلام نے واضح کیا، چنانچہ آپ نے موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کرکے فرمایا: ”میرے اور تیرے (اور اولین وآخرین کے) علوم کی نسبت، علم الٰہی کے مقابلے میں اتنی بھی نہیں، جو سمندر کے مقابلے میں اس چڑیا کی چونچ میں اٹھائے ہوئے قطرۂ آب کی طرح ہے۔“ یہیں سے معلوم کرنا چاہئے کہ احکام شرعیہ میں جن مصالح کی رعایت رکھی گئی ہے ان کا معاملہ کس قدر عظیم الشان ہے، اور یہ کہ ان مصالح کے لئے کوئی نہایت نہیں، اور یہ کہ ان مصالح کے باب میں جو کچھ بھی بیان کیا جائے اس سے نہ تو ان کا حق

واجب ہوتا ہے، نہ ان کی حقیقت تک رسائی ممکن ہے۔“

پوری امت کا مجموعی علم بھی انبیاءؑ کرام علیہم السلام کے علم سے وہ نسبت نہیں رکھتا جو ذرہ کو آفتاب سے ہوسکتی ہے، جب انبیاءؑ کرام کے لئے بھی احکامِ شرعیہ کے اسرار و حِکم اور فوائد و مصالح کا احاطہ ممکن نہیں تو کسی امتی کے لئے کب زیبا ہے کہ کسی حکم شرعی کی قطعی مصلحت کا دعویٰ کرے؟ اور پھر اس کی بنیاد پر حق تعالیٰ شانہ کے حکم کو پس پشت ڈالنے کے لئے آمادہ ہوجائے۔

الغرض حکمائے امت نے اس تصور کو کبھی جائز نہیں رکھا کہ شریعت کے منصوص احکام کے لئے اپنی طرف سے ایسی علت یا حکمت تراش لی جائے جس سے احکامِ شرعیہ کا باطل ہونا لازم آئے۔ حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ”باب الفرق بین المصالح والشرائع“ میں اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ جن امور کے لئے شریعتِ مطہرہ نے مخصوص ہیئت، مخصوص وضع، مخصوص مقدار اور مخصوص شکلیں متعین فرمادی ہیں، اور جنہیں ”علم الشرائع والحدود والفرائض“ کہا جاتا ہے، ان میں یہ مخصوص وضع اور مقدار ہی مقصود بالذات ہے، حق تعالیٰ کی رضامندی و ناراضی انہیں مقادیر پر دائر ہے، وہاں مصالح کا اعتبار نہیں بلکہ قابل اعتبار تقدیرات شرعیہ ہیں، شرائع، مصالح کے تابع نہیں بلکہ خود مصالح ان مقادیر شرعیہ سے وابستہ ہیں، اگر ان تقدیرات شرعیہ کو ہٹادیا جائے تو تمام مصالح باطل ہوکر رہ جائیں گے، اس کے بعد شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

”وقد اتفق من يعتد به من العلماء علىٰ ان القياس لا يجرى فى باب المقادير، وعلىٰ ان حقيقة القياس تعدية حكم الاصل الى الفرع لعلة مشتركة، لا جعل مظنة مصلحة علة، او جعل شئ مناسب ركنًا او شرطًا، وعلىٰ انه لا يصلح القياس لوجود المصلحة،

ولكن لوجود علة مضبوطة ادير عليها الحكم. فلا يقاس مقيم به حرج على المسافر فى رخص الصلواة والصوم، فإن دفع الحرج مصلحة الترخيص لا علة القصر والافطار، وإنما العلة هى السفر.“

(حجۃ اللہ البالغہ، طبع منیریہ ج:۱ ص:۱۳۰)

ترجمہ:..... ”قابل شمار علما کا اس پر اتفاق ہے کہ مقادیر کے باب میں قیاس نہیں چلتا، اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ قیاس کی حقیقت، منصوص کے حکم کو غیر منصوص کی طرف متعدی کرنا ہے، کسی مظنہ مصلحت کو علت یا کسی مناسب چیز کو رکن یا شرط قرار دے لینا، قیاس نہیں (بلکہ تحریف ہے)، اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ محض وجود مصلحت کی بنا پر قیاس صحیح نہیں، بلکہ ایسی منضبط علت کے وجود پر قیاس ہوگا جس پر حکم کا مدار ہو۔ مثلاً: ایک مقیم کو کتنا ہی حرج لاحق ہو، لیکن نماز اور روزے کی رخصتوں میں اسے مسافر پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ دفع حرج رخصت کی مصلحت ہے، مگر قصر و افطار کی علت نہیں، اس کی علت صرف سفر ہے۔“

خلاصہ یہ کہ بہ اتفاق امت، محض قیاس آرائی اور مصلحت تراشی کے ذریعہ شریعت کے منصوص احکام میں رد و بدل جائز نہیں، نہ وہاں مصالح کے ترتب و عدم ترتب کا سوال ہے، شریعت نے سفر میں قصر و افطار کا حکم دیا ہے، اب مسافر کو کسی قسم کا حرج نہ لاحق ہو تب بھی یہ حکم باقی رہے گا، اور مقیم کو ہزار حرج لاحق ہوں تب بھی اسے دفع حرج کے لئے یہ رخصت نہیں دی جاسکتی، البتہ اگر خود شارع کی جانب سے تصریح کردی جائے کہ فلاں حکم کی علت مقصودہ فلاں مصلحت ہے، اور یہ حکم محض اس مصلحت

پر دائر ہے، بلاشبہ وہاں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جب یہ مصلحت باقی نہیں رہی تو حکم کی مقصدیت فوت ہوگئی، اسی کا نام فقہائے اصول کی اصطلاح میں: ''ارتفاع الحکم بارتفاع العلة'' ہے، لیکن جہاں حکم کی مصلحت خود شارع کی جانب سے مصرح نہیں بلکہ محض انسانی ذہن کی اختراع ہے، وہاں یہ دعویٰ کرنا کہ چونکہ ہماری مخترع مصلحت نہیں پائی جاتی، اس لئے شارع کا حکم باطل ہوگیا، ایک طرح سے خود صاحب شریعت ہونے کا دعویٰ ہے۔ اگر انسانی ذہن وفکر میں یہ استعداد ہوتی کہ وہ خود ہی مصالح تجویز کرلیا کرے اور خود ہی ان کے مناسب احکام وضع کرلیا کرے تو نزولِ شریعت اور بعثتِ انبیاء علیہم السلام کی ضرورت ہی نہ ہوتی، حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ ارشاد کس قدر حکیمانہ ہے:

''نعلم انه لا بد من تقدير النصاب فی الزكوٰة ونعلم ان مائتی درهم وخمسة اوساق قدر صالح للنصاب، لانه يحصل بهما غنی معتد به، وهما امران مضبوطان مستعملان عند القوم، ولا نعلم ان الله تعالىٰ كتب علينا هذا النصاب وادار الرضا والسخط عليه الا بنص الشرع. كيف؟ وكم من سبب له لا سبيل الیٰ معرفته الا الخبر.'' (حجۃ اللہ البالغہ، طبع منیریہ ج:۱ ص:۱۳۰)

ترجمہ:...... ''ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ وجوبِ زکوٰۃ کے لئے تعیین نصاب کی ضرورت ہے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ دو سو درہم اور پانچ وسق نصاب کی مناسب مقدار ہے، کیونکہ اس سے معتد بہ غنا حاصل ہوجاتا ہے، اور یہ دونوں چیزیں سب کو معلوم اور عام و خاص کے یہاں مستعمل ہیں، لیکن یہ امر کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر یہ نصاب مقرر فرمایا ہے اور اپنی رضامندی و ناراضی کا

مدار اسی پر رکھا ہے، شارع کی تصریح کے بغیر معلوم نہیں ہوسکتا تھا اور یہ معلوم بھی کیونکر ہوسکتا ہے؟ جبکہ بہت سے اسباب حکم ایسے ہیں جن کا علم اطلاع خداوندی کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔''

جب عقل انسانی بذاتِ خود اسبابِ احکام کو دریافت نہیں کرسکتی ہے، نہ احکامِ صحیحہ کو تجویز کرسکتی ہے، نہ احکامِ الٰہیہ کے اسرار و علل اور حِکم و مصالح کا احاطہ کرسکتی ہے، بلکہ ان تمام امور میں قدم قدم پر نورِ وحی اور نص شرعی کی محتاج ہے، حتیٰ کہ معتزلہ، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ عقل کو حاکم مانتے ہیں، ان کے نزدیک بھی عقل، وضع احکام میں مستبعد نہیں، تو اس صورت میں شریعت کے منصوص اور قطعی احکام کو عقلی یا وہمی مصالح کی قربان گاہ پر ذبح کرنے کی جرأت کرنا، عقل اور شریعت دونوں سے ناانصافی ہے، کون نہیں جانتا کہ نص شرعی کے حکم کو موقوف کردینا ''نسخ'' ہے اور یہ صرف شارع کا وظیفہ ہے، امت کے کسی فرد کو نہ نسخ شریعت کی اجازت ہے، نہ تحریف ملت کی۔

اس اصولی بحث کے بعد اب مولانا نعمانی مدفیضہٗ کے سوال پر چند معروضات پیش کی جاتی ہیں:

ظاہر ہے کہ مولانا محترم کا سوال حضرت شاہ صاحبؒ کی بیان کردہ مصلحت سے ناشی ہے، لیکن مولانا کو ''مصلحت'' اور ''علت'' کے درمیان التباس ہوا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے حوالے سے گزر چکا ہے کہ قصر و افطار کی علت سفر ہے، اور دفع حرج اس کی مصلحت ہے، ٹھیک اسی طرح وجوبِ زکوٰۃ کی علت نصاب نامی ہے اور اس کی مصلحت حصول غنا ہے۔ حکم اپنے وجود و عدم میں مصلحت پر نہیں بلکہ علت پر دائر ہوتا ہے، چنانچہ مسافر کو واقعتاً حرج نہ بھی لاحق ہو، تب بھی اس کے لئے قصر و افطار کی رخصت حاصل ہے، اور مقیم کو کتنا ہی حرج لاحق ہو لیکن اس کی وجہ سے قصر و افطار کی رخصت اسے حاصل نہ ہوگی، پس جس طرح شریعت نے دفع حرج کو سفر شرعی

کے ساتھ منضبط کیا ہے، اسی طرح حصولِ غنا کو بھی ملکیتِ نصاب کے ساتھ متعین کردیا، اس لئے زکوٰۃ کے وجوب و عدمِ وجوب میں قابلِ اعتبار براہِ راست حصولِ غنا نہیں بلکہ نصابِ شرعی ہے۔

پھر اس پر بھی غور کیا جائے کہ پانچ وسق (۳۰ من) کھجوروں، پانچ راس اونٹوں اور بیس مثقال سونے سے آج بھی مختصر گھرانے کا خرچ اسی طرح چل سکتا ہے، جس طرح کہ بقدرِ کفاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چل سکتا تھا، پس زیادہ سے زیادہ ساڑھے باون تولے چاندی کے نصاب کا مسئلہ مولانا کے سوال کا محل بن سکتا ہے، اس لئے اول تو مطلق نصاب کو محلِ بحث لانا غیر معقول ہوا، پھر زکوٰۃ صرف صاحبِ نصاب پر واجب نہیں ہوتی، بلکہ سال بھر کے اخراجات اور حوائجِ اصلیہ کے بعد جس شخص کے پاس بقدرِ نصاب مال بچ رہتا ہے، اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، اب ایک شخص تو سال بھر سے نانِ جویں کا محتاج ہے، اور دوسرا شخص ایسا ہے کہ سال بھر کے خرچ کے بعد بھی ساڑھے باون تولے چاندی کی مالیت اس کے پاس باقی بچ رہتی ہے، تو کیا اسلامی عدل و انصاف کا تقاضا یہ نہیں ہونا چاہئے کہ اسے یہ حکم دیا جائے کہ اس فاضل مال کا چالیسواں حصہ وہ فقرأ و مساکین پر خرچ کرڈالے۔

مولانا موصوف نے روپے کی قیمت میں کمی واقع ہوجانے کو جو تبدیلی نصاب کے سوال کی بنیاد بنایا ہے، یہ بھی محلِ نظر ہے، اس لئے کہ زکوٰۃ سونے، چاندی اور غلہ وغیرہ کی متعین مقداروں پر واجب ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ روپے کی قیمت میں کمی واقع ہوجانے سے بیس مثقال سونے اور ساڑھے باون تولے چاندی کی مقدار کم نہیں ہوتی، علاوہ ازیں یہ بھی دیکھئے کہ کیا دورِ نبویؐ سے حضرت شاہ صاحبؒ کے دور تک، ان چیزوں کی قیمت یکساں رہی تھی؟ اگر روپے کی قیمت میں کمی بیشی، تبدیلی نصاب میں مؤثر ہوتی تو اول تو خلافتِ راشدہ ہی کے دور میں اس پر غور کرلیا گیا ہوتا، ورنہ کم از کم شاہ صاحبؒ کے دور تک تو اس کا فیصلہ ہو ہی جانا چاہئے تھا، جب روپے

پیسے اور سونے چاندی کی قیمتوں میں کمی بیشی کے باوجود چودہ سو سال تک کسی کے ذہن میں تبدیلی مقدارِ نصاب کا خطرہ تک نہیں گزرا تو کیسے تسلیم کرلیا جائے کہ مولانا موصوف کے سوال کی بنیاد صحیح ہے؟

اور سچ تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے متعلق: "یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ." (اللہ تعالیٰ ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے) کی جو خبر دی ہے، مولانا اگر گہرائی میں اتر کر دیکھتے تو عنایتِ خداوندی کا یہ کرشمہ انہیں تعیینِ نصاب میں بھی نظر آتا، تفصیل کی تو گنجائش نہیں، مختصر یہ کہ اگر شارع کی طرف سے زکوٰۃ کے لئے مالداری کا ایک خاص پیمانہ یا نصاب مقرر نہ کردیا جاتا اور حکم صرف اتنا ہوتا کہ مالداروں پر زکوٰۃ فرض ہے، تو "مالدار" کے مفہوم میں ابہام کی جو تاریکی پائی جاتی ہے کیا اس سے نکلنا کسی کے لئے ممکن ہوتا؟ "مالدار" کسے کہتے ہیں؟ خوشحالی کا معیار کیا ہے؟ تول کا اطلاق کتنی مالیت پر کیا جاسکتا ہے؟ شارع حکیم کی اطلاع اگر نہ ہوتی تو سوچنا چاہئے کہ ان پیچیدہ سوالات کا شافی جواب ایمان و یقین کی پوری روشنی میں، کیا اس طرح دیا جاسکتا تھا جس طرح آج ہم دے سکتے ہیں اور دیتے ہیں؟ "مالدار" کا لفظ جتنا آسان ہے اس کے مصداق کی تعیین اور قطعی تعیین بھی کیا اتنی ہی آسان ہے؟ ہم بہت دور کی کوڑی لاتے تو بس اتنا کہہ دیتے کہ: "جس کی سالانہ آمدنی اس کے سالانہ اخراجات کے لئے کفایت کرسکے، اس کو ادنیٰ درجہ کا مالدار سمجھنا چاہئے۔" لیکن دنیا میں ھل من مزید؟ یا جوع البقر کا جو نقشہ ہمارے سامنے ہے، یعنی آمدنی سیکڑوں سے لاکھوں اور لاکھوں سے کروڑوں تک جاپہنچے، لیکن اخراجاتی دوزخ کی شکم پری کے لئے سمجھا جاتا ہے کہ وہ بھی ناکافی ہے، جتنا آتا ہے کھپتا چلا جاتا ہے، اس صورت میں کتنوں کو ہمت ہوتی کہ اپنے کو مالدار سمجھ کر زکوٰۃ ادا کرنے پر آپ سے آپ آمادہ ہوجایا کرتے؟ شریعت نے انسانوں کی اسی کمزوری پر رحم فرماتے ہوئے "تمول" کا معیار نصاب کی مقدار کو قرار دیا، اور یوں ابہام کی تاریکیوں سے

تعیین کی روشنی کی طرف ان کو کھینچا۔ مجھے دوسروں کی خبر نہیں لیکن میں تو ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے بار بار کے مطالعہ سے یہی سمجھا ہوں کہ تعیین نصاب کے ذریعہ جو رحمت حق تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرمائی ہے، شاہ صاحبؒ اس کو لوگوں کے ذہنوں میں اتارنا چاہتے ہیں۔

اب شرعی نصاب کو بدلنے کی عقلمندی اگر کی جائے تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ انسانوں کو ایک دفعہ پھر انہی تاریکیوں کی طرف دھکیل دیا جائے جن سے ہاتھ پکڑ کر شریعت نے انہیں نکالا تھا۔

بہر حال جہاں تک ہم نے غور کیا، مولانا موصوف کا یہ نوٹ نہ صرف یہ کہ کسی صحیح بنیاد پر مبنی نہیں ہے، بلکہ اندیشہ ہے کہ یہ نوٹ بعض کج فہموں کی فتنہ سامانی کا باعث نہ بن جائے۔

(ماہنامہ بینات صفر ۱۳۸۸ھ)

ایک وضاحت:

''معارف الحدیث جلد چہارم، میں زکوٰۃ کے بیان میں نصابِ زکوٰۃ سے متعلق صحیحین کی مشہور حدیث درج کی گئی ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ دوسو درہم سے کم چاندی میں اور پانچ وسق (قریباً ۳۰ من سے) کم کھجوروں میں، اور اسی طرح پانچ راس سے کم اونٹوں میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

پھر اس حدیث کی تشریح کے ضمن میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ پانچ وسق کھجور، دوسو درہم بھر چاندی اور پانچ راس اونٹوں کی مالیت اتنی ہوتی تھی کہ ایک مختصر گھرانے کا سال بھر کا خرچ اس سے چل سکتا تھا، اس لئے ایسے شخص کو جس کے پاس سال پورا کرنے کے بعد اتنا محفوظ ہو،

خوشحال اور صاحبِ مال قرار دے کر وجوب زکوٰۃ کا حکم کیا گیا۔

پھر اس پر ایک مختصر حاشیہ لکھا گیا تھا جس میں فی زمانہ روپیہ کی قیمت اور مالیت میں بہت زیادہ کمی ہوجانے کی بنا پر زکوٰۃ کے کم سے کم نصاب پر غور کرنے کے لئے حضراتِ علمائے کرام سے عرض کیا گیا تھا۔

بعض حضرات نے اس حاشیہ سے میرا مطلب یہ سمجھا کہ اس زمانہ میں معاشی حالات میں جو تبدیلیاں ہوگئی ہیں ان کی وجہ سے نصابِ زکوٰۃ کی منصوص مقادیر پر ازسرنو غور کرنے کی میں علمائے کرام کو دعوت دے رہا ہوں اور ان میں کسی قسم کی ترمیم وتبدیلی کی گنجائش سمجھتا ہوں۔

یہ بات کبھی میرے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقرر کی ہوئی اس طرح کی حدود و مقادیر میں تبدیلی وترمیم کا حق امت کے کسی ادارہ یا طبقہ کو ہرگز نہیں دیا جاسکتا۔

دراصل میں اس حاشیہ کے ذریعہ حضراتِ علمائے کرام کو اس صورت حال پر غور کرنے کی دعوت دینا چاہتا تھا کہ ہمارے اس زمانہ میں لوگوں کے پاس دولت یا تو نوٹوں کی شکل میں ہوتی ہے یا ''بضائع'' اور تجارتی اموال کی شکل میں، اور اب چاندی، سونے اور سوائم (اونٹوں وغیرہ) کے منصوص نصابوں کی مالیت میں وہ یکسانی باقی نہیں رہی ہے جس کا ذکر حضرت شاہ ولی اللہؒ نے کیا ہے، بلکہ بہت بڑا فرق ہوگیا ہے، تو اس صورت میں یہ مسئلہ علمائے کرام کے غور وفکر کا مستحق ہے کہ کس نصاب کی

مالیت کو معیار قرار دے کر زکوٰۃ کے وجوب یا عدمِ وجوب کا فیصلہ کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ نصوص دائرہ سے باہر کی چیز ہے،

بہر حال میرا مقصد اسی صورت حال کی طرف توجہ دلا کر غور وفکر کی دعوت دینا تھا۔ میں یہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس طرح کے مسائل میں انفرادی فتووں کے بجائے حتی الامکان اجتماعی اور شورائی فیصلے ہونے چاہئیں۔

میں نے اب غور سے دیکھا تو مجھے اعتراف ہے کہ میرے حاشیہ کے الفاظ، میرا یہ مقصد ادا کرنے کے لئے ناکافی ہیں اور اگر کسی کو غلط فہمی ہوئی تو اس کی ذمہ داری میری تعبیر کے قصور اور ابہام پر بھی ہے۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔"

(مولانا محمد منظور نعمانی مدفیضہ، مدیر ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ)

بینات:......حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدفیضہم کا شمار اس دور کے ان خواص اکابر میں ہے، جن کے علم وعمل، اخلاص و دیانت اور فہم وبصیرت پر اعتماد کیا جاتا ہے، "معارف الحدیث" جلد چہارم، کے مذکورہ بالا نوٹ کو یہاں کے بعض حلقوں نے "تحریف فی الدین" کے جواز کے لئے زینہ بنالینے کی کوشش کی تھی۔ اس لئے بینات میں اس پر تنقید کی گئی۔ حق تعالیٰ موصوف کو جزائے خیر دیں کہ انہوں نے بروقت وضاحت فرما کر ایک بڑے فتنے کا سدباب کردیا۔ حضرت مولانا کے نئے سوال پر اکابر اہل فتویٰ غور کرسکتے ہیں، ہمارے خیال میں "بضائع" کی زکوٰۃ کے لئے "احد النقدین" کا معیار ہونا راجح ہے، واللہ اعلم!

ہمارے یہاں اکابر اہل حق کی یہ روایت قدیم ہے کہ ان سے کسی تعبیر میں اگر تسامح ہوجاتا ہے، یا کوئی تحقیق کسی الجھن کا باعث ہوتی ہے تو تنبہ کے بعد فوراً اس

سے برأت کا اظہار کردیتے ہیں (حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے یہاں تو باقاعدہ "ترجیح الراجح" کا سلسلہ قائم تھا، اور چند معتمد اہل علم کو اس پر مامور کیا گیا تھا کہ اگر آپؒ کی تالیفات میں کہیں تسامح نظر آئے تو اس کی نشاندہی کریں)۔ اس کے برعکس اہل زیغ کا طرزِ عمل یہ رہا ہے کہ کسی غلطی پر متنبہ کئے جانے کے بعد بھی انہیں اپنے موقف سے رجوع کی ہمت نہیں ہوتی، پہلے تاویلات کا سہارا لیا جاتا ہے، اور اگر اس سے کام نہ چلے تو آئندہ ایڈیشن میں چپکے سے عبارت بدل دی جاتی ہے (نظریہ جوں کا توں رہتا ہے)۔ حضرت مولانا دامت فیوضہم نے اس وضاحت سے اکابر اہل حق کی رسم کہنہ کو پھر سے زندہ کردیا اور بعد والوں کے لئے ایک اچھی روایت قائم کردی۔

فضاعف اللّٰہ اجرہ، وادام فیوضہ، واحسن جزائہ!

(ماہنامہ بینات کراچی صفر ۱۳۸۸ھ)

اسلام میں انفرادی ملکیت کا تصور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

مکرمی مدیر بینات! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! آپ کے موقر مجلہ "بینات" بابت ماہ ذی الحجہ میں مولانا محمد یوسف بنوری دامت برکاتہم کا مضمون "بصائر وعبر" بہت مفید چیز ہے۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اسلام آباد میں منعقد ہونے والی جشن نزولِ قرآن کی تقریب میں مولانا بنوری جیسے علمائے حق نے صحیح اسلام کی نمائندگی کی۔ آج وطن عزیز میں ایسے لوگوں کی کھیپ پیدا ہو چکی ہے جو اسلام کے پیچھے چلنے کے بجائے اسلام کو اپنے پیچھے چلانا چاہتے ہیں، جعفر شاہ پھلواری کی تقریر کے جواب میں مولانا ممدوح نے جو کچھ فرمایا وہ انہی کا حصہ تھا، ممالکِ اسلامیہ سے آئے ہوئے مندوبین یقیناً یہ دیکھ کر مسرور ہوئے ہوں گے کہ پاکستان کے علمائے حق، دین حق کی ترجمانی کے لئے ہمہ وقت تیار ہیں۔ لیکن اسی مضمون میں ایک بات بہت کھٹکی ہے اور وہ اوقاف کے ناظم اعلیٰ جناب مسعود صاحب کے مقالے کا مطالعہ ہے، موصوف اشتراکیت زدہ ہیں اور یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے، مگر ان کے اشتراکی خیالات کے جواب میں مفتی محمود صاحب نے جو تقریر کی اس کے بارے میں یہ نہیں بتایا گیا کہ اس

تقریر کے بنیادی نکات اور خدوخال کیا تھے؟ مفتی صاحب کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ خود بھی ان لوگوں کی طرف مائل ہیں جو سوشلزم کی حمایت کرتے ہیں، اور مضمون محولہ بالا میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ مفتی صاحب کی تقریر سے لوگوں کی تسلی ہوگئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مفتی صاحب نے مسعود صاحب کی ہی تقریر کو ذرا کسی اور رنگ میں پیش کرکے یہ باور کرانے کی سعی کی ہو کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، تقریر میں کوئی غیر اسلامی بات نہیں کہی گئی۔ اگر ممکن ہو تو یہ سطور بینات کی آئندہ اشاعت میں شائع کردی جائیں جو غلط فہمی قارئین کے اذہان میں پیدا ہوئی ہے اسے دور کرنے کے لئے وضاحت بھی کردی جائے۔ والسلام علیکم!

خاکسار حافظ محمد ادریس
پنجاب یونیورسٹی لاہور
۲۰/مارچ ۱۹۶۸ء

جواب:...... ہمیں معلوم نہیں کہ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب کے بارے میں اس بدگمانی کی بنیاد کیا ہے؟ جس کا حوالہ محترم مراسلہ نگار نے دیا ہے، اشتراکیت یا سوشلزم کو ''اسلامی'' اضافت کے ساتھ جن معنوں میں آج کل استعمال کرنے کا فیشن چل نکلا ہے، اور جس کی تشریح و تبلیغ میں حزبِ اقتدار و اختلاف دونوں کے ممتاز افراد دن رات ایک کر رہے ہیں، اس کی حمایت کی توقع کسی ایسے شخص سے بھی نہیں کی جاسکتی جو اسلامی اقتصادیات اور اشتراکیت کے مبادی سے ذرا بھی شد بد رکھتا ہو۔

آپ نے مولانا بنوری مدفیوضہم کے الفاظ ''مفتی صاحب کی تقریر سے لوگوں کو تسلی ہوگئی۔'' سے مسعود و محمود کی ہموائی کا دقیق استنباط کرنے سے پہلے اس پہلو پر غور نہیں فرمایا کہ: مفتی صاحب کی تقریر سے جن لوگوں کو تسلی ہوئی ان میں بیسیوں ذی علم حضرات کے علاوہ خود مولانا بنوری مدفیوضہم بھی تو تھے، اگر مفتی صاحب نے ''ذرا کسی اور رنگ میں لوگوں کو یہ باور کرایا ہوتا کہ مسعودی تقریر غیر اسلامی نہیں۔'' تو اسی مجلس میں کسی دوسرے بزرگ نے یہ مصنوعی محمودی رنگ بھی کیوں پھیکا نہ کر دکھایا؟

راولپنڈی کی بین الاقوامی کانفرنس میں مولانا مفتی محمود صاحب نے نام نہاد اسلامی سوشلزم کی حمایت نہیں کی بلکہ تردید کی تھی۔ ''بینات'' کے ''بصائر و عبر'' میں تو اس تردید کی یہ اجمالی اطلاع دی گئی ہے کہ:

''آخر کار مولانا مفتی محمود صاحب نے استاذ باقوری سے تقریر کرنے کی اجازت لی کہ یہ ہنگامہ بغیر ''تردیدی تقریر'' کے خاموش نہیں ہوسکتا، چنانچہ مفتی صاحب کی تقریر سے لوگوں کی تسلی ہوگئی۔''

(ماہنامہ بینات ذی الحجہ ۱۳۸۷ھ)

لیکن مولانا محمد تقی عثمانی مدیر ''البلاغ'' کراچی نے، جو اس موقع کے عینی شاہد ہیں، اسی اجمال کی تفصیل یوں بیان فرمائی ہے:

''جب حالت بے قابو ہونے لگی تو حضرت مولانا مفتی محمود صاحب اپنی نشست سے اٹھ کر صدرِ محفل جناب باقوری صاحب کے پاس پہنچے اور ان سے کہا:

''ہنگامہ کی صورت حال افسوسناک ہے، لیکن اگر تنقید کا موقع نہ دیا گیا تو سامعین اپنے اس احتجاج میں حق بجانب ہوں گے اور اندیشہ ہے کہ صورت حال بالکل ہی بگڑ نہ جائے، آپ مجھے دس منٹ کے لئے اظہار خیال کا موقع دیں تو امید ہے کہ یہ ہنگامہ فرو ہوجائے گا، بازاری انداز کا مناظرہ اور نزاع و جدال میرا مقصد نہیں، میں صرف سنجیدہ و علمی انداز میں اس مقالے پر تنقید کرنا چاہتا ہوں۔''

یہ بات جناب باقوری صاحب کی سمجھ میں آگئی اور انہوں نے تنقید کی اجازت دے دی، تھوڑی دیر کے بعد مفتی صاحب ڈائس پر نظر آئے تو مجمع پُرسکون ہونے لگا......''

مفتی صاحب نے دس منٹ کی تقریر میں جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ بھی مولانا تقی عثمانی ہی سے سنئے:

''حضرت مفتی محمود صاحب نے جناب مسعود کے دلائل پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''انہوں نے جن آیات واحادیث کے حوالے دیئے ہیں خود ان ہی میں جناب مسعود صاحب کے خیالات کی تردید موجود ہے، مثلاً: انہوں نے ''ان الارض للہ'' سے انفرادی ملکیت کے خلاف استدلال کیا ہے، لیکن اس بات پر غور نہیں فرمایا کہ اسی کے آگے یہ جملہ بھی ہے: ''یورثھا من یشاء۔'' حضرت رافع رضی اللہ عنہ کی جو حدیث جناب مسعود صاحب نے پیش کی ہے خود اسی میں زمین کو عطیہ کے طور پر کسی مسلمان بھائی کو دے دینے کا حکم ہے، اور ظاہر ہے کہ عطیہ اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ عطیہ دینے والا اس کا مالک ہو۔''

حضرت مفتی صاحب نے فرمایا:

''اسلام میں انفرادی ملکیت کی حیثیت اور اس کے تفصیلی دلائل مجھ سے قبل حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم اپنے مقالے میں بیان فرماچکے ہیں، لیکن یہ موٹی سی بات تو ہر شخص کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ اگر انفرادی ملکیت کو تسلیم نہ کیا جائے تو زکوۃ، عشر، خراج اور انفاق فی سبیل اللہ کے ان تمام احکام کا کیا مطلب رہ جاتا ہے، جن سے قرآن وحدیث بھرے پڑے ہیں؟''

مفتی صاحب کے جملے جملے پر لوگ مسرت وتائید کا

اظہار کررہے تھے، تقریباً دس منٹ کی تقریر کے بعد مفتی صاحب تحسین وآفرین کی صداؤں میں رخصت ہوگئے۔''

(ماہنامہ البلاغ دارالعلوم کراچی، محرم الحرام ۱۳۸۸ھ)

اور یہی بات مولانا بنوری مدفیوضہم نے یوں ادا کی تھی: ''چنانچہ مفتی صاحب کی تقریر سے لوگوں کی تسلی ہوگئی۔''

(ماہنامہ بینات صفر ۱۳۸۸ھ)

مسئلۂ زکوٰۃ کے بعض پہلو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

ان دنوں بعض ایسی تحریریں دیکھنے میں آئی ہیں جن میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ زکوٰۃ اگر انفرادی طور پر ادا کی جائے تو ادا نہیں ہوتی، اور بعض انتہا پسندوں نے یہاں تک لکھ ڈالا ہے کہ انفرادی طور پر زکوٰۃ ادا کرنا حکومت کے خلاف بغاوت کے مترادف ہے، یہ فتنہ بڑی شدت سے اٹھایا جارہا ہے، اس مسئلہ کی صحیح وضاحت تو اکابر اہل فتویٰ ہی کرسکتے ہیں، ان ہی کا یہ منصب ہے، تاہم علمائے کرام کی توجہ کے لئے مسئلہ زکوٰۃ پر چند الٹے سیدھے حروف پیش خدمت ہیں۔

اسلامی شریعت نے مسلمانوں کے جن اموال پر زکوٰۃ فرض کی ہے، اصولی طور پر ان کی چار قسمیں ہیں:

۱:......مویشی: یعنی اونٹ، گائے، بھینس، بھیڑ، بکری۔

۲:......زرعی پیداوار: غلہ، پھل، سبزی ترکاری۔

۳:......اموالِ تجارت۔

۴:......نقدی، یعنی سونا، چاندی خواہ کسی شکل میں ہوں، یا ان کے متبادل

سکے۔

شریعت نے یہ بات اچھی طرح واضح کردی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا "نصاب" کتنا ہے، جس پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟ کتنی مقدار میں واجب ہوگی؟ اس کے وجوب ادائیگی کی کیا شرائط ہیں؟ اور اسے کہاں خرچ کرنا صحیح ہے، کہاں نہیں؟ ان امور کی پوری تفصیل "فقہ" میں موجود ہے۔

فقہائے اسلام کی اصطلاح میں اول الذکر دو قسموں ...مویشی اور زرعی پیداوار... کو "اموالِ ظاہرہ" کہا جاتا ہے۔ کیونکہ مالک کے لئے ان کا چھپالینا عادتاً ممکن نہیں ہے، اور مؤخر الذکر دو قسمیں ...اموالِ تجارت اور نقدی ... کو "اموالِ باطنہ" کہلاتی ہیں، البتہ مالِ تجارت کو اگر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جائے تو وہ بھی اموالِ ظاہرہ کی صف میں آجاتا ہے۔

شریعت کے احکام چونکہ ظاہر پر جاری ہوتے ہیں، باطن پر نہیں، اسی اصول کے پیش نظر مسلمانوں کو اس کا پابند کیا گیا کہ وہ سوائم (مویشیوں) اور زرعی پیداوار کی زکوٰۃ بیت المال میں جمع کریں، اور اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ میں ان پر یہ جبر نہیں کیا گیا، بلکہ انہیں اختیار دیا گیا کہ خواہ وہ اسے خود تقسیم کریں، یا بیت المال میں جمع کرائیں۔

چنانچہ جب تک شرعی بیت المال قائم رہا، اسی قاعدے پر عمل ہوتا رہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور آپؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ کی شخصیت چونکہ مسلمانوں کے لئے مرجع عقیدت تھی اس لئے وہ نہ صرف اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ بلکہ صدقاتِ نافلہ بھی ان ہی حضرات کی خدمت میں پیش کرنا اپنی سعادت اور موجب مقبولیت سمجھتے تھے، چنانچہ آیت کریمہ:

"خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا
وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ." (التوبہ:۱۰۳)

ترجمہ:....."لے ان کے مال میں سے زکوٰۃ کہ پاک

کرے تو ان کو اور بابرکت کرے تو ان کو اس وجہ سے اور دعا دے ان کو بے شک تیری دعا ان کے لئے تسکین ہے۔"

صدقاتِ نافلہ ہی کے حق میں نازل ہوئی، جیسا کہ اس کی شانِ نزول اور علمائے تفسیر کی تصریحات سے واضح ہے۔ (اس آیت کے تحت تفسیر درمنثور، روح المعانی، تفسیر قرطبی وغیرہ ملاحظہ فرمائیے)۔

لیکن خلافتِ راشدہ کے بعد جب حکمرانوں میں نہ وہ مرجعیت کی شان باقی رہی، نہ ان کے ہاں زکوٰۃ کے جمع کرنے اور خرچ کرنے میں شریعت کے نازک احکام کی رعایت کا لحاظ رہا، فطری طور پر عوام میں یہ سوال اٹھا کہ ان کو دینا صحیح بھی ہے یا نہیں؟ چنانچہ اس زمانے میں صحابہ کرامؓ اور اکابر تابعینؒ موجود تھے، ان سے اس بارے میں دریافت کیا گیا، بعض حضرات کی رائے یہ ہوئی کہ زکوٰۃ ان ہی کے سپرد کردی جائے اور بعض حضرات نے یہ فتویٰ دیا کہ چونکہ وہ شرعی مصارف پر خرچ نہیں کرتے اس لئے زکوٰۃ اپنے طور پر ادا کرنی چاہئے، وہ زمانہ پھر غنیمت تھا، پھر بعد کے زمانے میں جب شرعی بیت المال کا ڈھانچہ یکسر ٹوٹ گیا تو علمائے امت نے تمام اموال کی زکوٰۃ بطور خود دینے کا فتویٰ دیا۔

مندرجہ بالا بحث سے جو نکات منقح ہوکر سامنے آتے ہیں، اب ہم دلائل کی روشنی میں ان کا مطالعہ کریں گے۔

۱:.....اگر ملک میں اسلامی حکومت اور شرعی بیت المال قائم ہو اور شریعت کے احکام کی پوری رعایت رکھتے ہوئے اسلامی حکومت زکوٰۃ وصول کرتی ہو اور اس کے صحیح مصارف پر خرچ کرتی ہو تو بلاشبہ وہ "اموالِ ظاہرہ" کی زکوٰۃ کا مطالبہ کرسکتی ہے، لیکن اموالِ باطنہ سونے چاندی اور مالِ تجارت کی زکوٰۃ کے مطالبہ کا اسے شرعاً حق حاصل نہیں ہے، بلکہ یہ خود اصحابِ اموال کی صوابدید پر ہوگا، وہ چاہیں تو بطور خود تقسیم کریں، اور چاہیں تو بیت المال میں جمع کرادیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور

خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں اسی پر عمل ہوا اور تمام امت اس پر متفق ہے۔

چنانچہ امام ابوعبیدؒ (متوفی ۲۲۴ھ) ایک بحث کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"وقد فرقت السنة بينهما، الا ترىٰ ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قد كان يبعث مصدقيه الى الماشية فياخذونها من اربابها بالكره منهم والرضا، وكذالك كانت الائمة بعده وعلىٰ منع صدقة الماشية قاتلهم ابوبكر، ولم يأت عن النبى صلى الله عليه وسلم، ولا عن احد بعده انهم استكرهوا الناس علىٰ صدقة الصامت الا ان يأتوا بها غير مكرهين، انما هى اماناتهم يؤدونها، فعليهم اداء العين والدين، لانها ملك ايمانهم، وهو مؤتمنون عليها. واما الماشية فانها حكم يحكم بها عليهم، وانما تقع الاحكام فيما بين الناس على الاموال الظاهرة وهى فيما بينهم وبين الله على الظاهرة والباطنة جميعا، فاى الحكمين اشد تباينا مما بين هذين الامرين؟

ومما يفرق بينهما ايضًا: ان رجلا لو مر بماله الصامت علىٰ عاشر، فقال: ليس هو لى، او: قد اديت زكوته، كان مصدقا علىٰ ذالك ولو ان رب الماشية قال للمصدق: قد اديت صدقة ماشيتى، كان له ان لا يقبل قوله وان يأخذ منه الصدقة، الا ان يعلم انه قد كان قبله مصدق، فى اشباه لهذا كثيرة."

(کتاب الاموال ص:۴۳۹)

ترجمہ:...... "اور سنت نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے، آپ جانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عاملین زکوٰۃ کو مویشیوں کے پاس تو بھیجتے تھے جو ان کے مالکوں سے خوشی ناخوشی زکوٰۃ وصول کرتے تھے، یہی دستور آپؐ کے بعد کے خلفا کا رہا، اور مویشیوں کی زکوٰۃ روکنے پر حضرت ابوبکرؓ نے مانعین سے جنگ کی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا آپؐ کے بعد کسی امام سے منقول نہیں کہ انہوں نے سونے چاندی کی زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے کسی کو مجبور کیا ہو، ہاں لوگ اپنی خوشی سے لے آتے تو قبول کرلی جاتی۔ یہ تو ان کی امانتیں تھیں جن کو وہ خود ادا کرتے تھے، چنانچہ نقد اور قرض دونوں کی زکوٰۃ کا ادا کرنا ان ہی کے ذمہ تھا، کیونکہ وہ ان ہی کی ملکیت تھی اور وہی اس کے امین تھے، لیکن جہاں تک مویشیوں کا معاملہ ہے وہ تو ایک فیصلہ ہے جو ان پر نافذ کیا جائے گا، اصول یہ ہے کہ لوگوں پر احکام کا اطلاق صرف "اموالِ ظاہرہ" پر ہوتا ہے اور "اموالِ باطنہ" کے بارے میں لوگوں کا معاملہ ظاہراً و باطناً اللہ کے سپرد ہے (وہ جانیں اور ان کا خدا، حکومت کو ان سے کوئی واسطہ نہیں) اب بتلایئے کہ اموالِ ظاہرہ و باطنہ میں جو فرق ہے اس سے بڑھ کر فرق اور کون سی دو چیزوں میں ہوسکتا ہے؟

ان دونوں قسموں میں ایک اور فرق یہ بھی ہے، اگر کوئی شخص بے جان دولت (اموالِ باطنہ) لے کر عاشر کے پاس سے گزرے اور وہ یہ کہے کہ یہ میرا نہیں، یا یہ کہ میں اس کی زکوٰۃ ادا کرچکا ہوں تو اس کی تصدیق کی جائے گی اور اگر مویشیوں کا

مالک صدقہ وصول کرنے والے سے کہے کہ میں اپنے مویشیوں کی زکوٰۃ ازخود ادا کر چکا ہوں تو محصل کو حق حاصل ہے کہ اس کی بات قبول نہ کرے اور اس سے صدقہ وصول کرے، الا یہ کہ اسے معلوم ہو کہ اس سے پہلے کوئی اور محصل یہاں تھا، اس قسم کے بہت سے فرق ان دونوں قسموں میں موجود ہیں۔"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"قال ابو عبید: فكل هذه الآثار التي ذكرناها: من دفع الصدقة الى ولاة الامر، ومن تفريقها هو معمول به وذالك في زكوة الذهب والورق خاصة اى الامرين فعله صاحبه كان مؤديا للفرض الذى عليه، وهذا عندنا هو قول اهل السنة والعلم من اهل الحجاز والعراق وغيرهم في الصامت، لان المسلمين مؤتمنون عليه كما ائتمنوا على الصلاة.

واما المواشي والحب والثمار فلا يليها الا الائمة وليس لربها ان يغيبها عنهم وان هو فرقها ووضعها مواضعها فليست قاضية عنه، وعليه اعادتها اليهم، فرقت بين ذالك السنة والآثار. الا ترىٰ ان ابابكر الصديق (رضی اللہ عنہ) انما قاتل اهل الردّة في المهاجرين والانصار علىٰ منع صدقة المواشي، ولم يفعل ذالك في الذهب والفضة."

(کتاب الاموال ص:۵۷۳)

ترجمہ:...."ہماری ذکر کردہ ان تمام روایات کے

بموجب زکوٰۃ حکام کو دینا یا اسے بطور خود تقسیم کر دینا دونوں پر عمل رہا ہے، لیکن یہ حکم سونے چاندی ... اموال باطنہ ... کے ساتھ مخصوص ہے، ان کا مالک مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں سے جس صورت میں بھی زکوٰۃ ادا کر دے وہ اپنے ذمہ عائد شدہ فرض سے عہدہ برآ ہوگا۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے اہل حجاز و عراق وغیرہ تمام محدثین وفقہا سیم و زر ... اموالِ باطنہ ... کے بارے میں اسی کے قائل ہیں۔ کیونکہ اس بارے میں مسلمانوں کو اسی طرح امین تصور کیا جائے گا جس طرح کہ انہیں نماز کے بارے میں امین سمجھا جاتا ہے۔

باقی رہا مویشیوں، غلوں اور پھلوں ... اموالِ ظاہرہ ... کا معاملہ! سو اس کی زکوٰۃ حکام ہی وصول کریں گے، ان اموال کے مالکوں کو یہ حق نہیں ہوگا کہ وہ ان کی زکوٰۃ حکام سے چھپا رکھیں، اور اگر مالک ان کی زکوٰۃ بطور خود ادا کریں گے تو عہدہ برآ نہیں ہوں گے بلکہ حکام کے مطالبہ پر انہیں دوبارہ دینا ہوگی۔

ان دونوں قسموں ... اموالِ ظاہرہ و اموالِ باطنہ ... کے درمیان یہ فرق سنت (نبویؐ) اور آثارِ صحابہؓ سے ثابت ہے۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مہاجرین و انصار کی موجودگی میں مویشیوں کی زکوٰۃ روکنے پر تو مانعین سے جنگ کی، لیکن سونے چاندی کے معاملہ میں ایسا نہیں کیا۔"

ایک اور جگہ امام ابوعبیدؒ وہ احادیث جن میں عاشر (ٹیکس لینے والے) کی

مذمت وارد ہوئی، ذکر کرتے ہوئے اس کی یہ توجیہ بیان کرتے ہیں کہ اس سے مراد جاہلیت کے وہ تجارتی ٹیکس ہیں جو عرب وعجم کے بادشاہ، تاجروں سے وصول کیا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے ذریعہ اس کو باطل قرار دیا اور ڈھائی فیصد زکوٰۃ فرض ہوئی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''مسلمانوں پر ٹیکس نہیں، ٹیکس تو یہود و نصاریٰ پر ہوگا۔''

اب جو حاکم لوگوں سے زکوٰۃ فرض لیتا ہے وہ عاشر کا مصداق نہیں ہوگا، لیکن جب وہ اصل زکوٰۃ سے زائد کا مطالبہ کرے تو اس نے لوگوں کا مال ناحق وصول کیا اس لئے وہ عاشر کی وعید میں داخل ہوگا۔

اسی طرح اگر مسلمان اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ اپنی خوشی سے محصل کو لاکر دیں، اور وہ قبول کرلے تو وہ ان احادیث کی وعید میں داخل نہیں ہوگا، لیکن جب حاکم اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ لوگوں سے زبردستی وصول کرلے تو مجھے اندیشہ ہے کہ وہ عاشر کی وعید میں داخل ہوگا۔ خواہ چالیسویں حصہ سے زیادہ وصول نہ بھی کرے، کیونکہ سونے چاندی ... اموالِ باطنہ ... کے بارے میں خصوصی سنت یہی رہی ہے کہ اس میں لوگوں کو ان کی امانت و دیانت پر چھوڑ دیا جائے (کہ وہ فی ما بینھم وبین اللہ بطور خود ادا کریں)۔

چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے عامل کو لکھا تھا:

''جو شخص تمہارے پاس نہیں لاتا، اللہ تعالیٰ اس سے خود حساب کرنے والا ہے۔''

اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

''ہم جس سے بھی (اموالِ باطنہ کی) زکوٰۃ لیتے ہیں اس کی صورت یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی خوشی سے ہمیں لاکر دے

دیتا ہے۔'' (کتاب الاموال ص:۵۳۱)

امام ابوبکر جصاص رازیؒ نے اموالِ ظاہرہ و اموالِ باطنہ پر طویل کلام کیا ہے، جس کا خلاصہ یہی ہے جو امام ابوعبیدؒ نے بیان فرمایا، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کے دور میں مویشی اور زرعی پیداوار کی زکوٰۃ کے لئے تو عامل مقرر کئے جاتے تھے، لیکن یہ کہیں ثابت نہیں کہ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ پر عامل مقرر کئے گئے ہوں۔ علاوہ ازیں خلیفہ راشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صاف اعلان کردیا تھا کہ لوگ ان اموال کی زکوٰۃ بطور خود ادا کریں، یہ چونکہ ایک خلیفۂ راشد کا فیصلہ ہے اس لئے بحکم نبویؐ پوری امت پر نافذ العمل ہوگا۔ (احکام القرآن ج:۱ ص:۱۵۵)

امام ابوالحسن الماوردیؒ (متوفی:۴۵۰ھ) فرماتے ہیں:

"والاموال المزكوة ضربان، ظاهرة وباطنة. فالظاهرة ما لا يمكن اخفاءه كالزروع والثمار والمواشي. والباطنة ما امكن اخفاءه من الذهب والفضة وعروض التجارة. وليس لوالي الصدقات نظر في زكوة المال الباطن، وأربابه احق باخراج زكوته منه الا يبذلها ارباب الاموال طوعا فيقبلها منهم، ويكون في تفريقها عونا لهم ونظره مختص بزكوة الاموال الظاهرة، يؤمر ارباب الاموال بدفعها اليه."

(الاحکام السلطانیہ ص:۱۰۹)

ترجمہ:...... ''جن اموال پر زکوٰۃ فرض ہے ان کی دو قسمیں ہیں: ظاہرہ، باطنہ۔ ظاہرہ سے مراد وہ اموال ہیں جن کا اخفاء ممکن نہیں جیسے: غلہ، پھل اور مویشی۔ اور باطنہ سے مراد وہ اموال ہیں جن کا اخفاء ممکن ہے، یعنی سونا، چاندی، مالِ تجارت۔

"اموالِ باطنہ" کی زکوٰۃ سے متولی صدقات کا کوئی تعلق نہیں، بلکہ مالک ان کی زکوٰۃ بطورِ خود ادا کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں، البتہ اگر وہ اپنی خوشی سے اسے لاکر دیں تو قبول کرے گا، اور اس کی تقسیم میں ان کی مدد کرے گا، اس کے اختیارات کا دائرہ صرف "اموالِ ظاہرہ" تک محدود ہے، ان اموال کے مالکوں کو حکم ہوگا کہ ان کی زکوٰۃ محصل کے سپرد کریں۔"

شیخ الاسلام محی الدین نووی رحمہ اللہ شرح مہذب میں لکھتے ہیں:

"قال الشافعي والاصحاب رحمهم الله تعالى: للمالک ان یفرق زکوة ماله الباطن بنفسه وهذا لا خلاف عليه، ونقل اصحابنا فيه اجماع المسلمين. والاموال الباطنة هي الذهب والفضة والركاز وعروض التجارة وزكوة الفطر. في زكوة الفطر وجه انها من الاموال الظاهرة." (المجموع شرح المهذب ج:۶ ص:۱۶۴)

اکابر امت کی ان عبارات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلام کی عادلانہ حکومت صرف اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ میں تصرف کا حق رکھتی ہے، اسی کا مطالبہ کرسکتی ہے، اور لوگوں کو اس کا پابند کرسکتی ہے کہ وہ یہ زکوٰۃ شرعی بیت المال میں جمع کرائیں۔ اس کے برعکس "اموالِ باطنہ" کی زکوٰۃ مالک خود تقسیم کریں گے، حاکم اس پر جبر نہیں کرسکتا، اگر وہ ایسا کرتا ہے تو امام عبیدؒ کی تصریح کے مطابق وہ امام عادل نہیں کہلائے گا بلکہ وہ "عاشر" کا مصداق ہوگا جس کی مذمت احادیث میں آتی ہے، اور جسے جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔

سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، سنت خلفائے راشدینؓ اور اجماع ائمہ دینؒ کا یہی فیصلہ ہے۔

۲:...... اگر کسی ملک میں حدودِ شرعیہ نافذ اور قانونِ اسلام جاری ہو لیکن اسلامی احکام کی رعایت نہ رکھی جاتی ہو، نہ شرعی قاعدے سے بیت المال کے الگ الگ شعبے، الگ الگ مدوں کے لئے رکھے جاتے ہوں، بلکہ سارا مال ایک ہی جگہ ڈھیر کردیا جاتا ہو تو ان حالات میں زکوٰۃ، حکام کے سپرد کی جائے یا نہیں؟ اس میں صحابہؓ وتابعینؒ، ائمہ دینؒ اور علمائے اسلام کا اختلاف ہے، بعض حضرات کا فتویٰ یہ ہے کہ زکوٰۃ حکام کے سپرد کی جائے، کیونکہ انہیں زکوٰۃ نہ دینے میں فتنہ وفساد کا اندیشہ ہے، نیز شرعی حکم کے مطابق زکوٰۃ ان کے حوالہ کردینے کے بعد ہم بری الذمہ ہیں، ان کے نیک وبد ہونے اور صحیح یا غلط مصرف پر خرچ کرنے نہ کرنے کی ذمہ داری تمام تر ان ہی پر ہوگی۔ اور بعض حضرات اس کے برعکس یہ رائے رکھتے ہیں کہ جب ہم کھلی آنکھوں دیکھتے ہیں کہ ہماری جمع کردہ زکوٰۃ اپنے موقع پر خرچ نہیں ہوئی تو آخر کیسے تسلیم کرلیا جائے کہ اندریں صورت زکوٰۃ حکام کو دینا صحیح ہوگا؟

پہلی رائے حضرت عائشہ، سعد بن ابی وقاص، ابوہریرہ، ابوسعید خدری اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے منقول ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا: ہم زکوٰۃ کسے دیا کریں؟ فرمایا: "ان ہی حکام کو۔" عرض کیا گیا وہ تو گھر کی خوشبو اور کپڑوں پر خرچ کرڈالیں گے! فرمایا: "خواہ ایسا کریں!"

(کتاب الاموال ص:۵۷۰)

ایک موقع پر یہ فرمایا: "جب تک وہ نماز پڑھتے ہیں، زکوٰۃ ان ہی کو دو۔"

ایک بار ان سے پوچھا گیا کہ: کیا ہم اپنے حکام کو زکوٰۃ دے دیا کریں؟ فرمایا: "ہاں!" عرض کیا گیا: وہ تو کافر ہیں! (زیاد کافروں کو بھی اس کام میں لگادیا کرتا تھا) فرمایا: "کافروں کو تو صدقات مت دو!" (کتاب الاموال ص:۵۶۹)

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا تو ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

"میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: جب تک وہ نماز پنج گانہ کی پابندی کرتے رہیں زکوٰۃ ان کو دی جائے۔" (رواہ الطبرانی الاوسط وفیہ ھانی بن المتوکل وھو ضعیف. مجمع الزوائد ج:۳ ص:۸۰)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا تو فرمایا: "بیت المال سے وظیفہ لیتا ہوں، اگر ایسا نہ ہوتا تو انہیں کچھ نہ دیتا، اس لئے تم مت دیا کرو۔" (کتاب الاموال ص:۵۷۰)

ایک بار ایک صاحب سے جو اپنی زکوٰۃ حاکم کے پاس لے جارہا تھا، حضرت ابوہریرہؓ نے پوچھا: "کہاں جاتے ہو؟" اس نے کہا: حاکم کو زکوٰۃ دینے جارہا ہوں۔ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا: "کیا وظیفے کے رجسٹر میں تیرا نام لکھا ہے؟" اس نے کہا: نہیں! فرمایا: "پھر ان کو کچھ نہ دو!"

معلوم ہوتا ہے کہ امرأ کے فسق و فجور اور ان کی بے احتیاطی میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا گیا ان کو زکوٰۃ دینے میں اشکال بڑھتا گیا، جعفر بن برقانؒ کہتے ہیں: میں نے میمون بن مہرانؒ سے کہا: سنا ہے ابن عمرؓ یہ فرمایا کرتے تھے: "زکوٰۃ حکام کو دیا کرو خواہ وہ اس سے شراب نوشی ہی کریں۔" میمونؒ نے کہا: تم فلاں نصیبی کو جانتے ہو جو ابن عمرؓ کا دوست تھا؟ اس نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے ابن عمرؓ سے دریافت کیا: "زکوٰۃ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ یہ لوگ (حکام) تو اسے صحیح جگہوں پر خرچ نہیں کرتے۔" فرمایا: "زکوٰۃ ان ہی کو دو!" میں نے کہا یہ تو فرمایئے اگر یہ لوگ نماز کو اس کے صحیح اوقات سے تأخیر کرکے پڑھیں کیا آپ ان ہی کے ساتھ نماز پڑھیں گے؟" فرمایا: "نہیں!" تب میں نے کہا: "کیا زکوٰۃ کی حیثیت بھی وہی نہیں جو نماز کی ہے؟" اس پر فرمایا: "انہوں نے ہمارے معاملات کو مشکوک کردیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں بھی حیران و پریشان رکھے۔" حبان بن ابی جبلہ کہتے ہیں کہ ابن عمرؓ نے اپنے اس قول سے رجوع

کرلیا تھا کہ زکوٰۃ سلطان ہی کو دی جائے، وہ فرمایا کرتے تھے: "زکوٰۃ کو اس کی جگہ خود خرچ کیا کرو۔" (کتاب الاموال ص:۵۷۲)

حسن بصری، سعید بن جبیر، میمون بن مہران، عطا بن ابی رباح، شعبی، سفیان ثوری، ابراہیم نخعی (رحمہم اللہ) بھی یہی فتویٰ دیا کرتے تھے۔ (المغنی لابن قدامہ ج:۲ ص:۶۴۳)

ان روایات سے واضح ہوتا ہے کہ جو حضرات پہلے حکام کو زکوٰۃ دینے کے قائل تھے، امرأ کی بے احتیاطی نے انہیں بھی یہ فتویٰ دینے پر مجبور کردیا کہ مسلمانوں کو زکوٰۃ بطورِ خود تقسیم کرنی چاہئے تاکہ یہ اطمینان ہوسکے کہ وہ زکوٰۃ اپنے صحیح مصرف پر خرچ ہوئی ہے۔

۳:...... جس ملک میں اسلامی قانون نافذ نہ ہو، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام نہ کیا جاتا ہو، حدودِ الٰہیہ کا اجرأ نہ ہوتا ہو اور شرعی بیت المال کا ڈھانچہ ہی سرے سے موجود نہ ہو، بلکہ ملک کا سارا نظم ونسق غیر اسلامی اور لادینی بنیادوں پر چل رہا ہو، محکمہ تحصیل میں غیر مسلم اور مرتدین کو بھرتی کیا جارہا ہو، وہاں مسلمانوں کو اپنی زکوٰۃ خود ادا کرنی ہوگی، اور حکومت کے محاصل کو "زکوٰۃ" کی مد میں شمار کرنا کسی طرح صحیح نہ ہوگا، جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس مسئلہ میں کسی کا اختلاف نہیں، نہ اختلاف کی گنجائش ہے۔

اوپر تفصیل سے جو نتائج سامنے آتے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

الف:...... یہ کہنا غلط ہے کہ جو مسلمان اپنی زکوٰۃ بطورِ خود صحیح جگہ صرف کردے وہ ادا نہیں ہوتی۔

ب:...... اموالِ باطنہ، سونا، چاندی، نقدی، مالِ تجارت کی زکوٰۃ میں اسلامی حکومت جبر نہیں کرسکتی، بلکہ مالک اس کی زکوٰۃ بطور خود ادا کریں گے، اور اگر وہ جبر کرے تو وہ اسلام کی "عادلانہ حکومت" نہیں کہلائے گی۔

ج:...... اگر اسلامی حکومت شرعی بیت المال قائم کرے تو وہ زمین کی پیداوار سے ''عشر'' وصول کرے گی اور مالِ تجارت سے ... جبکہ اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا ہو... زکوٰۃ وصول کرے گی، لیکن اسے موجودہ تجارتی ٹیکس اور زمین کے مالیہ کے نظام کو منسوخ کرنا ہوگا۔

د:...... حکومت جو زکوٰۃ وصول کرے گی اگر وہ شرعی قواعد کے مطابق لی جائے اور شرعی مصرف پر ٹھیک ٹھیک خرچ کی جائے تو زکوٰۃ بلاشبہ ادا ہوجائے گی، اور اگر اس سلسلہ میں حکام بے احتیاطی سے کام لیں، شرعی مسائل کا لحاظ نہ رکھیں تو زکوٰۃ کی ادائیگی مشتبہ ہوگی، اور بعض صورتوں میں مالکوں کو اپنے طور پر دوبارہ ادا کرنا ہوگی۔

ہ:...... اگر ملک میں زکوٰۃ کا صحیح نظام قائم ہوجائے اور حکومت ''اموالِ ظاہرہ'' کی زکوٰۃ شرعی قاعدہ سے لیتی اور ٹھیک مصرف پر خرچ کرتی ہو تو اربابِ اموال کے لئے کسی طرح یہ جائز نہیں ہوگا کہ اس میں اخفا سے یا خیانت سے کام لیں، اگر وہ ایسا کریں گے تو وہ عند اللہ سخت ترین مجرم ہوں گے۔ هذا ما عندی، واللہ اعلم بالصواب!

(ماہنامہ بینات کراچی جمادی الثانی ۱۳۸۹ھ)

کتاب الاموال

کے ترجمہ کا تنقیدی جائزہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب عبدالرحمٰن سورتی صاحب نے امام ابوعبید قاسم بن سلامؒ کی ''کتاب الاموال'' کا اردو میں ترجمہ اور مقدمہ لکھ کر شائع کیا تو اس میں انہوں نے جو گل کھلائے اور جو موشگافیاں فرمائیں ان پر خاموش رہنا امانت و دیانت کے خلاف تھا۔ کتاب حضرت حکیم العصر مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ کے پاس آئی تو آپ نے اس پر مفصل تنقیدی مقالہ سپردِ قلم فرمایا، جو ماہنامہ بینات میں کئی اقساط میں شائع ہوا۔ اب اسے پیش نظر مجموعہ میں شامل کیا جارہا ہے۔

امام ابوعبید قاسم بن سلامؒ کی کتاب الاموال حلقہ اہل علم میں کسی تعارف کی محتاج نہیں، زیرتبصرہ اس کا مترجم نسخہ ہے، جس کا ترجمہ اور مقدمہ جناب عبدالرحمٰن سورتی صاحب نے کیا ہے۔

کتاب الاموال، امام ابوعبید قاسم بن سلامؒ کی تصنیف ہے، جو امام احمد بن حنبلؒ کے معاصر تھے موصوف علم قرأت کے امام، تفسیر کے عالم، حدیث کے حافظ،

لغت عرب کے ماہر اور فقہ میں درجہ اجتہاد پر فائز تھے، ان کی جلالت قدر کے لئے امام بخاریؒ کے استاذ امام اسحاق بن راہویہؒ کا یہ مختصر فقرہ کافی ہے:

''سچی بات کہنی چاہئے، ابو عبید مجھ سے زیادہ فقیہ ہیں۔''

امام ابو عبیدؒ نے قرآن و حدیث اور فقہ و لغت کے علوم پر بیش قیمت تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں، جن میں کتاب الاموال کو اپنے موضوع کی منفرد، جامع، مستند اور نفیس کتاب قرار دیدیا گیا ہے، کتاب الاموال میں اسلامی ریاست کے شعبۂ مالیات سے بحث کی گئی ہے، اور ان اموال کی تفصیل دی گئی ہے جو خلیفہ کے زیر تحویل رہیں گے اور ان مدات کو واضح کیا گیا ہے، جہاں انہیں خرچ کیا جائیگا۔

حکمران کے فرائض:

امام ابو عبیدؒ نے اپنی کتاب کا آغاز ''راعی اور رعایا کے باہمی حقوق'' سے کیا ہے، اس باب میں وہ مختلف احادیث و آثار روایت کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ''اسلام میں راعی اور رعایا کے تعلق کی بنیاد ایک دوسرے سے سراپا اخلاص اور خیرخواہی پر مبنی ہے، جس میں بداعتمادی، نکتہ چینی اور عیب جوئی کا ادنیٰ شائبہ نہ ہونا چاہئے، راعی اور رعایا دونوں کو یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ان پر جو حقوق اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کے لئے انہیں کل اللہ کے حضور میں جواب دہ ہونا ہوگا۔ اسلام کی نظر میں حکومت وامارت پھولوں کی سیج نہیں، بلکہ کانٹوں کا جال ہے، یہ ایک ایسی امانت ہے جس میں ادنیٰ خیانت بھی قیامت کے دن حسرت و ندامت کی موجب ہوگی، امیر، اسلامی معاشرہ کا ایک فرد ہے، اسے اپنے آپ کو عوام الناس سے بالاتر قسم کی مخلوق نہیں سمجھنا چاہئے۔ امیر کا فرض ہے کہ وہ عدل و انصاف میں غنی و فقیر اور قوی و ضعیف سب کو

یکساں رکھے۔ امیر، کتاب وسنت کا پابند ہوگا، اسے کتاب وسنت سے ہٹ کر کوئی نیا طریقہ ایجاد کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ امیر، جب تک کتاب وسنت کا پابند رہے، حکم خداوندی کے مطابق فیصلے کرے، جو امانت اس کے سپرد کی گئی ہے اس کو نہایت خوبی سے ادا کرے، اور رعایا سے حسن سلوک روا رکھے، اس وقت تک لوگوں پر لازم ہوگا کہ اس کے ساتھ ہر ممکن تعاون کریں، اس کی کسی قسم کی خیرخواہی سے دریغ نہ کریں، جو کہے اسے سنیں، جو حکم دے اسے بجا لائیں، اور اس کی ہر دعوت پر لبیک کہیں...... لیکن اگر وہ صحیح راستہ سے ہٹ جائے تو قوم کا فرض ہوگا کہ اسے راہ راست پر لائیں۔ امیر کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس کے طرزِ عمل کا فطری اثر رعایا پر پڑے گا، جب تک اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ سے ٹھیک رہے گا، رعایا بھی اس کے ساتھ درست معاملگی کا مظاہرہ کرے گی، لیکن جب وہ حکم خداوندی سے ادھر ادھر ہوگا تو رعایا اس بڑھ کر حدود شکن ہوگی...... خلیفۂ حق وہی کہلائے گا جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرے اور رعایا پر ایسا شفیق ہو جیسا کہ ایک آدمی اپنے گھر والوں پر ہوتا ہے۔

امامِ عادل کی پہچان:

امام عادل کی پہچان یہ ہے کہ وہ رعایا کے کسی فرد کو اللہ تعالیٰ کے دربار میں شکایت کا موقع نہ دے اور ظالم حکمران کی علامت یہ ہے کہ لوگ اس کے ظلم سے اللہ کے دربار میں بکثرت شکایتیں کریں۔

یہ باب اپنے اختصار کے باوجود جامع ہے اور اس میں اجمالاً وہ تمام ہدایات آجاتی ہیں جو اسلام نے راعی اور رعایا کو دی ہیں بعد ازاں امام ابو عبیدؒ ان اموال سے بحث کرتے ہیں جو اسلامی بیت المال کے زیر نگرانی رہیں گے، وہ اصولی طور پر ان کی تین قسمیں کرتے ہیں۔ فئے، خمس، صدقہ۔

صدقہ:...... سے مراد مسلمانوں کے اموال کی زکوٰۃ ہے، جو سونے چاندی، اونٹ، گائے، بھیڑ بکریوں اور غلہ یا پھلوں پر لی جاتی ہے۔ اور یہ ان آٹھ مدوں میں خرچ کیا جائے گا جنہیں اللہ تعالیٰ نے آیت "اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ" میں بیان فرمایا ہے، ان کے سوا کسی شخص کا اس میں قطعاً کوئی حق نہیں، نہ اسے کسی اور مصرف میں لگانا جائز ہے۔

فئی:...... کا اطلاق ان تمام اموال پر ہوتا ہے جو معاہدۂ صلح کے تحت ذمیوں سے وصول کئے جاتے ہیں، اس کے ذیل میں یہ تین قسمیں آتی ہیں۔

الف: جزیہ:...... جو ہر بالغ ذمی سے اس کی جان و مال کی حفاظت کے عوض لیا جاتا ہے۔

ب: خراج:...... (الف) ایسے علاقے جو فوجی قوت سے فتح کئے جاتے ہیں اور امام ان کے مالک ذمیوں کو بحال رکھے۔ (ب) اسی طرح ایسے علاقے جو صلحاً اسلام کے زیرنگیں آ جائیں، ان دونوں قسم کی اراضی پر جو مالیہ ذمیوں سے وصول کیا جائے گا وہ خراج کہلائے گا۔

ج: عشور:...... وہ محصول جو ذمیوں کے مال تجارت پر عائد ہوتا ہے۔

یہ تمام آمدنیاں "فئی" میں شامل ہیں، اس میں تمام مسلمان، خواہ وہ امیر ہوں یا فقیر، یکساں حق رکھتے ہیں، اسی میں سے فوج اور انتظامیہ کی تنخواہیں دی جائیں گی، بال بچوں کے وظائف جاری کئے جائیں گے، اور ریاست کی دیگر پیش آمدہ ضروریات میں اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے امام اس کو صرف کرے گا۔

خمس:...... جو مال جہاد میں دشمن سے حاصل ہو، اس کا پانچواں حصہ بیت المال کا ہوگا، اسی طرح دفینوں، کانوں اور غوطہ خوری سے حاصل شدہ مال کا پانچواں حصہ بھی بیت المال میں داخل ہوگا۔

خمس کے مصرف میں علماً کا اختلاف ہے، بعض کے نزدیک اسے ان پانچ مدوں پر صرف کیا جائے گا جن کا ذکر کتاب اللہ "فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَهٗ" میں ہے، اور بعض کے نزدیک اس کا مصرف بھی وہی ہے جو "فئی" کا ہے، وہ امام کی صوابدید پر ہے خواہ ان پانچ مدوں پر خرچ کرے، خواہ کسی اور مناسب جگہ۔

اس کے بعد پوری کتاب انہی تین اموال (فئی، خمس، صدقہ) کی تفصیل پر مشتمل ہے، "فئی" کے ضمن میں چونکہ ذمیوں سے صلح اور جزیہ کا ذکر آ جاتا ہے، اس لئے صلح و جنگ اور جزیہ کے مسائل بھی کتاب کا ضمنی موضوع بن جاتے ہیں، اور مختلف لوگوں کے ساتھ آنحضرت ﷺ اور حضرات خلفائے راشدینؓ نے جس طرح معاہدے کئے، امام ابو عبیدؒ ان تمام تفصیلات کو سمیٹ لیتے ہیں۔

انداز بحث:

امام ابو عبیدؒ کے ہاں اس کا التزام ہے کہ وہ ہر زیر بحث مسئلہ میں آنحضرت ﷺ کی احادیث، خلفائے راشدینؓ کی سنت اور صحابہؓ و تابعینؒ کے آثار جمع کرتے ہیں، بعد ازاں فقہائے امت کا مسلک بیان کرتے ہیں، اس کے بعد ہر مسلک کے دلائل لاتے ہیں، پھر ان تمام دلائل کا جائزہ لیتے ہوئے جو مسلک انہیں قوی نظر آتا ہے، اسے اختیار کرتے ہیں۔

امام ابو عبیدؒ اگرچہ روایات پر محدثانہ کلام بھی کرتے ہیں، جس سے واضح ہوتا ہے کہ روایات کے اتصال و انقطاع اور علل احادیث پر ان کی گہری نظر ہے، تاہم یہ

عصر ان کی کتاب میں نسبتاً کم پایا جاتا ہے، ان کے قاری کو جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ہے مشکل آثار کی فقیہانہ توجیہ اور متعارض روایات کے درمیان مجتہدانہ تطبیق۔ دراصل یہی وہ میدان ہے جہاں کسی شخص کی فقاہت کے جوہر کھلتے ہیں، اور اس کی اجتہادی صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں۔

یہ بلند پایہ کتاب ۱۳۵۳ھ میں پہلی مرتبہ مصر سے شائع ہوئی تھی، اہل علم کے لئے بے حد مسرت کی بات ہے کہ اب اس کا اردو ترجمہ ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد سے شائع ہوا ہے جو اس وقت زیر نظر ہے۔

ترجمہ کا تعارف:

ترجمہ دو جلدوں میں ہے، پہلی جلد میں شروع کے ۱۱۰ صفحات، فہرست، حالاتِ مصنف اور مقدمہ کی نذر ہیں۔ اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے، جو فئ اور خمس کے مباحث پر مشتمل ہے اور آخر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں ان مقامات کی تشریح وتعیین کی گئی ہے جن کا ذکر اس جلد میں آیا ہے، دوسری جلد کے ۸۲ صفحات فہرست اور مقدمہ کے لئے وقف ہیں، اس کے بعد کتاب کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے جس میں زکوۃ وصدقات کے مباحث ہیں۔ ترجمہ میں لفظی رعایت سے زیادہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مصنف کا ٹھیک ٹھیک مفہوم، جو ان کی عبارت سے متبادر ہے، اسے بامحاورہ اردو میں ادا کردیا جائے، اس لئے ترجمہ متین بھی ہے اور سلیس بھی۔ علاوہ ازیں مطالب کی وضاحت کے لئے کتاب میں تقریباً نوصد ذیلی عنوانات کا اضافہ کیا گیا ہے (ان کی تعداد جلد اول میں (۳۶۷) اور جلد دوم میں (۳۱۷) ہے جن سے کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے کتاب میں مطبعی اغلاط شاذ ونادر ہی ہیں۔

صفحہ: ۱۵۹، ج: ۱ پر یہ عبارت ہے "اسی طرح جزیہ ہر اس شخص پر واجب ہوگا جسے جزیہ ادا کرنے سے انکار کردیا جائے"۔ یہاں "انکار کردیا جائے" کے بجائے غالباً یہ عبارت تھی "انکار کردینے پر قتل کردیا جائے" صفحہ ۱۲۶ پر ایک عنوان ہے۔ "اللہ ورسول" کی مختلف تاویلیں"۔ یہ بڑا نامناسب عنوان ہے، یوں لکھنا چاہئے تھا "خمس کے اللہ ورسول کیلئے ہونے کی مختلف تاویلیں۔" یا "للہ ولرسولہ کی مختلف تفسیریں" جیسا کہ آگے چل کر ج: ۱ ص: ۵۰۶ پر ایک عنوان دیا گیا ہے "للہ کی ایک اور شرح"۔

صفحہ ۴۲۴ پر یہ عبارت ہے "اس لئے کہ انہوں نے تمہارے ذمے لگائے ہوئے محصول و واجبات میں کمی کردی ہے۔" یہ جس عبارت کا ترجمہ ہے وہ یہ ہے: "وذالک لما اخل فیکم من الالحاق والفرائض" لغت میں "الحاق"، بارانی فصل کو کہا جاتا ہے، اور "فرائض" چار برس یا اس سے کم عمر کے اونٹوں کو (ملاحظہ کیجئے تاج العروس، لسان العرب، اقرب الموارد) اور "اخلال" کے معنی کمی واقع ہونا۔ "من" کو "ما" کا بیان سمجھنا چاہئے، عبارت کا بے تکلف مفہوم یہ ہے کہ: اس سال خشک سالی کی وجہ سے تمہارے یہاں پیداوار اور مویشیوں میں جو کمی واقع ہوئی اس کا اثر جزیہ وخراج کے محاصل پر بھی پڑا، اس لئے پوری کوشش کے باوجود اس مد میں ایک لاکھ کا خسارہ رہا۔ اس عبارت کا جو مفہوم فاضل مترجم نے ادا کیا ہے وہ صحیح نہیں، اس لئے کہ امام، اسلام کے عائد کردہ فرائض و واجبات میں کمی بیشی کا قطعاً مجاز نہیں، اور ان کے علاوہ کوئی محصول اس زمانے میں مسلمانوں پر عائد نہیں تھا۔ اس قسم کے جزوی امور سے قطع نظر جہاں تک کتاب کے نفس ترجمہ کا تعلق ہے فاضل مترجم کی محنت قابل قدر ہے، البتہ بعض جگہ کتاب کے بجائے مترجم کے خیالات کی ترجمانی نظر آتی ہے جو علمی ثقاہت کے منافی ہے۔

لیکن کتاب کے دونوں حصوں پر جو مقدمہ لکھا گیا ہے اسے محتاط لفظوں میں کتاب کے ''حسین چہرے پر بدنما داغ'' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ادھر ادھر کے خیالات کو غیر منہضم شکل میں اگل دیا گیا ہے، اور جلد بازی میں اس امر کو بھی ملحوظ نہیں رکھا گیا کہ جو بات مقدمہ نگار لکھ رہے ہیں خود ان ہی کے ترجمہ کتاب سے اس کی تردید تو نہیں ہوجاتی؟ کتنی عجیب بات ہے، کہ ''کتاب الاموال'' ایسی بلند پایہ کتاب کا فاضل مترجم اموال ظاہرہ و باطنہ کے درمیان فرق نہیں کرپاتا اور اسے دوسروں سے شکایت ہے کہ وہ زکوۃ اور صدقہ نافلہ کے درمیان فرق نہیں کرسکے، ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ موصوف اسلامی مالیات کے ان بنیادی مسائل سے واقعتاً ناواقف ہیں، یا وہ جان بوجھ کر لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ مقدمہ کی تفصیلی تنقید ایک مستقل تصنیف کا موضوع ہے، تاہم ضروری ہے کہ موصوف کے خیالات کا مختصر جائزہ لیا جائے۔

امام اور سنت

امام اور اس کے اختیارات:

اس عنوان کے تحت امام (سربراہ مملکت) کے اختیارات پر طویل گفتگو کرتے ہوئے موصوف نے لکھا ہے:

> ''ایک مسئلہ کو حل کرنے کے لئے جہاں قرآن مجید میں متعدد صورتیں بتائی گئی ہوں ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کے لئے ''امام'' کو اختیار ہوتا ہے اسی طرح اسے وقتی انتظامی امور میں رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں میں تغیر وتبدل کا

> بھی اختیار ہوتا ہے......'' (مقدمہ جلد اول ص ۲۶)

خط کشیدہ عبارت بظاہر بالکل بے ضرر سی معلوم ہوتی ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کا جو فیصلہ تشریعی نہیں بلکہ محض انتظامی تھا، اور آپ ﷺ نے اس پر صرف ایک خاص وقت میں عمل فرمایا اور بعد میں اس پر عمل نہیں کیا (وقتی و انتظامی کا مفہوم یہی ہوسکتا ہے) ظاہر ہے کہ ایسا فیصلہ منسوخ ہوگا اور امت کے لئے اس کی قانونی حیثیت باقی نہیں رہے گی، سوال یہ ہے کہ مقدمہ نگار کو اسے ''امام کے اختیارات'' میں شمار کرنے اور اسے ''رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں میں تغیر وتبدل'' کے قبیح عنوان سے تعبیر کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ اگر یہ اتنی سرسری بات ہوتی جتنی کہ مقدمہ نگار کے اس فقرے سے بظاہر سمجھی جاتی ہے تو ہمیں اس کا نوٹس لینے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی، مگر مقدمہ نگار نے ''امام اور اس کے اختیارات'' پر خاصی طویل اور زوردار بحث کرتے ہوئے جس انداز سے یہ بات کہی ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا یہ فقرہ معمولی نوعیت کا نہیں ہے، بلکہ کسی چلتی ہوئی بحث میں وہ اپنی رائے ظاہر کرنا چاہتے ہیں ـــ دراصل ان کی اس بحث کا تعلق ''اصلاح اسلام'' کی اس تحریک سے ہے جو بڑی آب وتاب سے اور نہایت تیزی وتندہی کے ساتھ گزشتہ دور امامت (صدارت) میں ادارہ تحقیقات اسلامی کے اعیان و اکابر کے زیر اہتمام چلائی گئی تھی۔ ''امام'' (ایوب خاں) کے ہر لکچر میں علماء کو مشورہ دیا جاتا تھا کہ وہ نئے زمانے کے مطابق اسلام کی نئی تعبیر کریں، اونچی مجلسوں میں کھل کر کہا جاتا ہے کہ چودہ سو سال کا قدیم اسلام جو عرب کے بدوؤں کے لئے آیا تھا آج کے دور میں کیسے نافذ کیا جاسکتا ہے؟ (معاذ اللہ)

ادھر ادارہ تحقیقات کے محققین ''اسلام میں اصلاح وترمیم'' کی ضرورت کو

علمی سطح پر ثابت کرنے میں مصروف تھے، ان کے ہاں استدلال کا صغریٰ کبریٰ کچھ اس طرح ملایا جاتا تھا:

صغریٰ:...... چند اساسی اصولوں کے ماسوا قرآن وسنت کے تمام فیصلے وقتی وانتظامی نوعیت کے تھے، حتیٰ کہ نماز اور اس کے اوقات تک میں کوئی غیر لچکدار فیصلہ نہیں کیا گیا۔

کبریٰ:...... رسول اللہ کے وقتی فیصلوں میں تغیر وتبدل کا اختیار ''امام'' کو ہے۔

نتیجہ:...... یہ کہ قرآن وسنت کے ایک ایک فیصلہ کو جانچ پرکھ کر دیکھا جائے گا کہ وہ ہمارے دور کی خواہشات پر پورا اترتا ہے یا نہیں؟ اگر اترے تو اسلام زندہ باد ـــ اور اگر آج کے معاشرے میں قرآن وسنت کے کسی فیصلہ کو نافذ کرنا ذرا مشکل نظر آئے تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ خدا اور رسول کا یہ ''وقتی فیصلہ'' تھا، جسے تبدیل کرنے کا ''امام'' کو اختیار ہے۔

پھر یہ بحث صرف علمی سطح تک محدود نہیں رہی تھی بہت سے خلاف شرع امور کو عملاً اسی دلیل سے نافذ کیا گیا اور 'اسلام پر تجدد پسندی کے اثرات' پر بحث کرتے ہوئے پرنسٹن یونیورسٹی میں اسلام کے پورے نظام عقائد واعمال پر نظر ثانی کا منصوبہ تجویز کیا گیا۔

نیرنگی زمانہ سے اس تحریک کے سرپرست اور لیڈر پس منظر میں چلے گئے، لیکن ادارہ کے بعض دانشور ابھی تک اسی لکیر کو پیٹے جا رہے ہیں۔ گویا رسی جل گئی لیکن بل نہیں گیا۔ ذرا احتیاط اور ہلکے پھلکے انداز میں یہی بات فاضل مقدمہ نگار اپنے قارئین کو سمجھانا چاہتے ہیں، مگر وہ یہ نہیں بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے وقتی انتظامی فیصلوں

سے ان کی مراد کیا ہے؟ اور یہ کہ آنحضرت ﷺ کے جس فیصلے پر خلفائے راشدینؓ، ائمہ مجتہدینؒ اور بعد کی پوری امت نے عمل کیا آج چودہ سو سال بعد یہ کیسے معلوم ہوگا کہ آپ ﷺ کا فلاں فیصلہ چونکہ وقتی تھا، اس لئے آج کے ''امام'' کو اس کے تغیر وتبدل کا حق حاصل ہے۔ اور اگر اس فقرے سے مقدمہ نگار کا منشا واقعتاً وہی نہیں جس کی تکرار ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب اور ان کے ہم نوا کرتے رہے ہیں، تب بھی یہ تعبیر چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے، امام کا منصب آنحضرت ﷺ کے غیر منسوخ فیصلوں کو پوری قوت سے نافذ کرنا ہے، نہ کہ ''وقتی وانتظامی'' کی منطق سے انہیں رد کرنا۔ اسلامی تاریخ میں کسی امام برحق کے بارے میں آپ کو یہ نہیں ملے گا کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں کو بدلنے کے ''اختیارات'' کا اعلان کردیا تھا، اس کے برعکس امام برحق حضرت صدیق اکبرؓ کے بارے میں ہمیں یہ ملتا ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے ان فیصلوں کو بھی، جو بظاہر خالص انتظامی نوعیت کے تھے، پوری قوت کے ساتھ نافذ کیا، جیش اسامہؓ کی تفصیلات حدیث وتاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں، جب انہیں حالات کی تبدیلی کی بنا پر اسامہؓ کے لشکر کو روک لینے کا مشورہ دیا گیا، تو فرمایا: ''میں اس لشکر کو کیسے روک سکتا ہوں جسے رسول اللہ ﷺ اپنی مہم پر جانے کا حکم دے چکے ہیں۔'' اور جب حضرت عمرؓ نے یہ درخواست کی کہ اگر آپ کو یہ لشکر بھیجنا ہی ہے تو کم از کم اتنا کیجئے کہ اسامہؓ کی جگہ کسی دوسرے کو امیر مقرر فرمادیجئے، تو امام برحقؓ نے نہایت برہمی سے فرمایا:

''ثکلتک امک وعدمتک یا ابن الخطاب استعملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم و تامرنی ان انزعہ.'' (حیاۃ الصحابہ ج:۱ص:۴۱۱،تالیف مولانا محمد یوسف دہلویؒ)

ترجمہ:......''خطاب کے بیٹے! تجھے تیری ماں گم پائے، اسے رسول اللہ ﷺ نے امیر مقرر کیا ہے اور تو مجھ سے کہتا ہے کہ میں اسے معزول کردوں؟''

کتاب الاموال کے پہلے باب میں امام ابو عبیدؒ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا وہ خطبہ نقل کیا ہے جو آپ نے خلیفہ بننے کے فوراً بعد دیا تھا، اسے اگر اسلامی ریاست کے دستور کا مختصر متن اور خلاصہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا، یہ مسلمانوں کے سب سے پہلے ''امام'' کا سب سے پہلا خطبہ تھا جس کی گونج آج بھی مسلمانوں کے کانوں سے ٹکرارہی ہے ـــ فرمایا جارہا تھا:

''امابعد: فانی ولیت امرکم ولست بخیرکم. ولکنه نزل القرآن وسن النبی صلی الله علیه و سلم وعلمنا فعملنا...... یا ایها الناس! انما انا متبع ولست بمبتدع، فان انا احسنت فاعینونی وان انازغت فقومونی.''

(کتاب الاموال ص:۵)

ترجمہ:......''امابعد: لوگو! مجھے تمہارے کارِ مملکت کا متولی بنادیا گیا، جبکہ میں تم سے بہتر (ہونے کا دعویٰ) نہیں (کرتا) ہوں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ قرآن نازل ہوا، آنحضرت ﷺ نے سنت جاری فرمائی اور ہم نے (کتاب وسنت کے مجموعہ سے دین کا) علم حاصل کیا، پھر (آنحضرت ﷺ کی نگرانی میں اس پر) عمل کیا...... لوگو! اب (بحیثیت خلیفہ کے) میرا کام صرف (کتاب وسنت کی) پیروی کرنا ہے، (ان سے ہٹ

کر) کوئی نیا طریقہ ایجاد کرنا نہیں ہے۔ اب اگر میں (اتباع کتاب وسنت کے جادہ مستقیم پر) ٹھیک ٹھیک چلوں تو میری مدد کرو، اور اگر اِدھر اُدھر ہوجاؤں تو مجھے راہ راست پر لاؤ۔''

اس سے واضح ہوسکتا ہے کہ امام ابو عبیدؒ کی نظر میں ''امام'' (سربراہ مملکت) کا منصب کیا ہے؟ اور ان کے مقدمہ نگار لوگوں کو کیا سمجھاتے ہیں؟

سنت کی دو قسمیں:

مترجم موصوف رقمطراز ہیں:

''معلوم ہوتا ہے ابو عبیدؒ کی نظر میں رسول اللہ ﷺ کی دو حیثیتیں ہیں، ایک موقتہ اور دوسری غیر موقتہ، موخر الذکر انتظامی امور پر مشتمل ہوگی اور اس میں تغیر وتبدل کا ''امام'' مجاز ہوگا، جزیہ وخراج کی رقم کا تعین ابو عبیدؒ کے ہاں صدقہ (زکوٰۃ) کی طرح سنت موقتہ نہیں ہے، بلکہ یہ رسول اللہ ﷺ کے ان وقتی انتظامی فیصلوں میں تھے جن میں حالات کے تقاضوں اور مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے امام تغیر وتبدل کرسکتا ہے، اپنی رائے کی تائید میں وہ حضرت عمرؓ کا رسول اللہ ﷺ کے مقررہ جزیہ سے زیادہ لینے کا عمل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ولو علم عمر ان فیها سنة موقتة من رسول الله صلی الله علیه وسلم ماتعداها الی غیرها.''

(کتاب الاموال ج:۱ ص:۶۷)

ترجمہ:...... ''اور اگر حضرت عمرؓ کو یہ معلوم ہوجاتا کہ
جزیہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی کوئی مقررہ متعینہ
(موقتہ) سنت ہے تو حضرت عمرؓ اسے چھوڑ کر کبھی دوسری شکل
اختیار نہ کرتے۔''

یہ بھی اوپر کی بحث کا شاخسانہ ہے، مقدمہ نگار نے امام ابوعبیدؒ کا ایک فقرہ سیاق وسباق سے الگ کرکے ان کو سنت کی دو حیثیتوں کا قائل کرلیا، اب سنئے کہ دراصل امام ابوعبیدؒ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ زیر بحث مسئلہ کا حاصل یہ ہے کہ قرآن مجید نے اہل کتاب ذمیوں سے جزیہ وصول کرنے کا حکم فرمایا لیکن اس کی کوئی شرح مقرر نہیں فرمائی، اور آنحضرت ﷺ کا معمول بھی مختلف رہا، چنانچہ آپ ﷺ نے اہل نجران سے سالانہ دوہزار حلوں (یعنی چادروں کے جوڑوں) پر صلح فرمائی۔ اور اہل یمن پر ایک دینار فی کس سالانہ جزیہ عائد فرمایا، اسی طرح خلیفہ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی اس بارے میں روایات مختلف ہیں، ایک روایت کے مطابق آپ نے اہل شام پر چار دینار فی کس مقرر فرمائے، دوسری روایت کے مطابق اہل عراق پر ۴۸ درہم سالانہ مقرر کئے اور ایک تیسری روایت میں یہ تفصیل ہے، کہ آپ نے غنی، فقیر اور متوسط الحال پر علی الترتیب ۴۸۔۱۲۔۲۴ درہم کا فیصلہ کیا، اور ایک روایت کے مطابق آپ نے ۴۸ درہم کی جگہ ۵۰ درہم کردیئے تھے اور عرب کے ایک عیسائی قبیلہ بنی تغلب پر مسلمانوں کی زکوٰۃ وعشر کی شرح سے دوگنا جزیہ نافذ کیا (یہ تمام احادیث و آثار حدیث کی دوسری کتابوں کے علاوہ امام ابوعبیدؒ کی کتاب الاموال میں بھی موجود ہیں)۔

ان مختلف آثار کے سلسلہ میں فقہائے امت کے سامنے یہ سوال اٹھا کہ آیا

شریعت میں جزیہ کی کوئی خاص شرح معین ہے یا نہیں ـــــ ایک جماعت نے ان روایات میں تطبیق یا ترجیح کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے یہ رائے قائم کی ہے کہ اسلام میں جزیہ کی ایک خاص شرح معین ہے ''لا یزاد و لا ینقص'' (جس میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں) امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کا یہی مسلک ہے، اور امام احمدؒ کا بھی ایک قول جسے اصحاب متون نے اختیار کیا یہی ہے۔

ایک دوسری جماعت نے یہ موقف اختیار کیا کہ شریعت نے اس کی کم از کم مقدار متعین کردی ہے، اس پر اضافہ کیا جاسکتا ہے لیکن اس میں کمی نہیں کی جاسکتی۔

اور ایک تیسری رائے، جسے امام ابوعبیدؒ نے حسن بن صالح وغیرہ سے نقل کیا ہے، اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ اس میں کمی کی جاسکتی ہے، اضافہ کی اجازت نہیں، بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ چونکہ آنحضرت ﷺ اور خلفائے راشدینؓ کا عمل مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف رہا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شریعت نے ائمہ مسلمین کو جزیہ کی کسی خاص شرح کا پابند نہیں کیا کہ اس سے کمی بیشی جائز نہ ہو، بلکہ اس کا انحصار ذمیوں کے حالات اور اسلام و مسلمین کے مصالح پر ہے، اور اس امر کا فیصلہ کہ کسی قوم پر کتنا جزیہ مقرر کیا جائے، یہ تمام تر امام اور اسکی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ دیکھئے المغنی لابن قدامۃ ج:۸ ص:۵۰۲، ۵۰۳۔

امام ابوعبیدؒ اسی آخری رائے کے حامی ہیں، وہ حضرت عمرؓ سے مختلف آثار نقل کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جزیہ کی شرحوں کا یہ اختلاف واضح کرتا ہے کہ جزیہ کی کوئی معین مقدار واجب نہیں، وہ کہتے ہیں:

''جزیہ وخراج کے بارے میں ہمارا یہی مسلک ہے کہ
وہ ذمیوں پر بقدر طاقت عائد کیا جائے گا، جس میں نہ تو ذمیوں

پر بار ہو، نہ مسلمانوں کی "فئی" میں نقصان ہو، جزیہ وخراج کی معینہ حد مقرر نہیں ہے۔"

اس کے بعد وہ ان لوگوں کا مسلک نقل کرتے ہیں جو حضرت عمرؓ کے تجویز کردہ جزیہ پر اضافہ کے روادار نہیں تھے، خواہ ذمی اس سے زیادہ کی استطاعت رکھتے ہوں، لیکن وہ اس بات کے قائل تھے کہ اگر کوئی ذمی، حضرت عمرؓ کے تجویز کردہ جزیہ کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اس میں کمی جاسکتی ہے۔

لیکن امام ابوعبیدؒ اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں کہ ان مختلف آثار کا تقاضہ یہ ہے کہ جس طرح جزیہ کی رقم میں کمی کی جاسکتی ہے، اسی طرح اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ نے نہ صرف آنحضرت ﷺ کے عائد کردہ جزیہ اہلِ یمن پر اضافہ کیا بلکہ خود اپنی تجویز کردہ مقدار اڑتالیس درہم میں اضافہ کرکے اسے پچاس کردیا تھا، نیز خود انہوں نے ہی ایک بوڑھے آدمی سے، جو دربدر بھیک مانگتا تھا، نہ صرف جزیہ ساقط کردیا تھا بلکہ بیت المال سے اس کا وظیفہ بھی جاری کردیا تھا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جزیہ کی کوئی ایسی مقدار متعین نہیں فرمائی ہے جس میں کمی بیشی جائز نہ ہو، ورنہ:

"ولو علم عمر ان فيها سنة موقتة من رسول الله صلى الله عليه وسلم لما تعداها."

(کتاب الاموال ج:۱ ص:۶۷)

ترجمہ:...... "اگر حضرت عمرؓ کو جزیہ کے بارے میں کوئی معین مقدار متعین آنحضرت ﷺ کی جانب سے معلوم ہوتی تو وہ اس سے قطعاً تجاوز نہ کرتے۔"

امام ابوعبیدؒ کی یہ تقریر خود فاضل مقدمہ نگار کے ترجمہ میں صفحہ ۱۶۰ سے صفحہ ۱۶۳ تک پھیلی ہوئی ہے، اب دیکھئے کہ کتاب الاموال کے مصنف امام کیا کہنا چاہتے ہیں، اور ان کے فاضل ترجمہ نگاران سے کیا کہلانا چاہتے ہیں۔

امام ابوعبیدؒ یہ بتاتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے جزیہ کی مختلف شرحیں اس لئے تجویز فرمائیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس کی کوئی معین شرح مقرر ہی نہیں فرمائی تھی، ورنہ حضرت عمرؓ، آنحضرت ﷺ کی مقرر کی ہوئی شرح کو چھوڑ کر کبھی ادھر ادھر نہ جاتے نہ اسکے وہ مجاز تھے، اور ان کے ذہین ترجمہ نگاران کی ترجمانی یوں کرتے ہیں کہ: "امام رسول اللہ کے وقتی فیصلوں کو بدل سکتا ہے۔"

انہوں نے امام ابوعبیدؒ کے ہاں ایک لفظ "سنة موقتة" دیکھ کر فوراً یہ نکتہ پیدا کرلیا، کہ جزیہ وخراج کی رقم کا سارا قصہ محض ایک وقتی انتظامی فیصلہ تھا پھر اس سے اس کلیہ کا استخراج کرلیا کہ سنت کی دو قسمیں ہیں، پھر اس پر یہ خیالی محل تعمیر کرلیا کہ: امام، سنت رسول اللہ ﷺ میں تغیر وتبدل کا مجاز ہے، یہاں بے ساختہ حافظ جلال الدین السیوطیؒ کا ایک فقرہ یاد آتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"والمبتدع ليس له قصد الا تحريف الأيات وتسويتها على مذهبه الفاسد، بحيث انه متى لاح له شاردة من بعيد اقتنصها، او وجد موضعا له فيه ادنى مجال سارع اليه ...... واما الملحد فلا تسأل عن كفره والحاده فى آيات الله وافترائه على الله مالم يقله."

(الاتقان فی علوم القرآن، النوع الثمانون ج:۴ ص:۱۹۰)

ترجمہ:...... "اور مبتدع کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں

ہوتا کہ وہ آیات کی تحریف کر کے انہیں اپنے غلط نظریے پر منطبق کرے، اسے دور کی کوئی گری پڑی بات مل جائے، تو اسے فوراً اچک لے گا، اور کسی جگہ اسے ادنیٰ گنجائش ملے، تو فوراً اس کی طرف لپکے گا، اور ملحد کے کفر و الحاد اور افترا علی اللہ کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔"

پھر مقدمہ نگار کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ جزیہ وخراج کی رقم کا تعین خالص ایک وقتی انتظامی معاملہ ہے، کتاب الاموال ہی میں ہے کہ مجوس پر جزیہ عائد کرنے میں حضرت عمرؓ کو شروع شروع میں توقف تھا اور وہ فرماتے تھے کہ:

"ما ادری ما اصنع بالمجوس و لیسوا اھل کتاب؟."

ترجمہ:...... "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجوسیوں کے ساتھ کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ جبکہ یہ اہل کتاب نہیں ہیں؟"

پھر جب حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے انہیں بتایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ:

"سنوا بھم سنة اھل الکتاب." "ان سے اہل کتاب کا سا طرز عمل اختیار کرو۔" (ترجمہ کتاب الاموال ج:۱ ص:۱۵۱) (کتاب الاموال میں حدیث کا صرف یہی جملہ نقل کیا گیا ہے، اور حدیث کی دوسری کتابوں میں اس پر اتنا اضافہ ہے:

"غیر آکلی ذبائحھم و لا ناکحی نسائھم." "یعنی ان مجوس کے ذبیحے نہ کھاؤ اور ان کی عورتوں سے نکاح نہ کرو)۔

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے فوراً قبول کرلیا اور مجوس پر جزیہ عائد

کر دیا، کیا اس کا صاف صاف مطلب یہ نہیں کہ جزیہ کے معاملہ میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ، رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں کی پابندی ضروری سمجھتے تھے اور اسے محض انتظامی نوعیت کا معاملہ قرار نہیں دیتے تھے۔ جزیہ ہی کے مسئلہ میں امام ابوعبیدؒ کی ایک عبارت پر فاضل مترجم نے ذیلی عنوان یہ قائم کیا ہے: "اہل کتاب سے جزیہ لینا قرآنی فیصلہ ہے، اور مجوس سے جزیہ لینا سنت رسول ﷺ ہے۔" (ص:۱۵۴)

اب اگر جزیہ اور اس کی رقم کا تعین محض ایک انتظامی معاملہ ہے جس کی وجہ سے سنت رسول ﷺ کو بدلا جاسکتا ہے، تو "امام" کے لئے کیا "قرآنی فیصلے" کو بھی بدلنا جائز ہے؟ مقدمہ میں ایک چیز کو وقتی انتظامی قرار دیتے ہوئے آخر وہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ٹھیک اسی چیز کو اپنے قلم سے انہوں نے قرآنی فیصلہ اور سنت رسول ﷺ لکھا ہے۔

یہاں ایک اور امر بھی توجہ طلب ہے، موصوف کی اس سرخی سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن نے صرف اہل کتاب سے جزیہ لینے کا حکم فرمایا ہے، اور مجوس سے جزیہ لینے کا حکم رسول اللہ ﷺ نے دیا۔ کیا اس صورت حال کو یوں تعبیر کرنا صحیح ہوگا کہ:

"قرآن کے بعض فیصلوں میں تغیر و تبدل کا رسول اللہ ﷺ کو اختیار ہے۔"

ہمارا خیال ہے کہ کوئی مسلمان نہ اس تعبیر کو صحیح سمجھے گا، نہ اس سے یہ کلیہ نکالنے کی کوشش کرے گا، بلکہ اس کی سیدھی سادی تعبیر یہ ہوگی کہ قرآن کریم کا ایک پہلو، جو امت سے مخفی رہ سکتا تھا، اسے رسول اللہ ﷺ نے امت پر کھولدیا، اور آیت کی تفسیر و تشریح امت کے سامنے واضح کردی۔ اب اگر یہی معاملہ آنحضرت ﷺ کی سنت اور حضرات خلفائے راشدینؓ کے طرز عمل کے درمیان پیش آتا ہے، مثلاً سنت رسول (ﷺ) میں بظاہر کسی چیز کے ایک پہلو کا ذکر ہے اور خلفائے راشدینؓ کے عمل

نے اس کا دوسرا پہلو واضح کردیا، رسول اللہ ﷺ سے کسی چیز کا حکم ثابت ہے، مگر عام لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ یہ حکم وجوب کے لئے ہے؟ استحباب کے لئے ہے؟ اباحت کے لئے ہے؟ یا تخییر کے لئے ہے؟ اور خلفائے راشدینؓ نے اس حکم کے خلاف عمل کرکے یہ وضاحت کردی کہ آپ ﷺ کا یہ حکم وجوب کے لئے نہیں تھا بلکہ استحباب، اباحت یا تخییر پر محمول تھا، تو کیا اسے "سنت رسول" میں تغیر و تبدل سے تعبیر کرنا ان بزرگوں پر سراسر ظلم نہیں؟ اور اس سے یہ کلیے نکالتے پھرنا کہ ہر حکمران کو حق حاصل ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے بعض فیصلوں کو تبدیل کرڈالے، کیا اسے صحتمندانہ طرز فکر کہا جائے گا؟

بہرحال مقدمہ نگار نے جس طرح زور زبردستی سے امام ابوعبیدؒ کو "سنت کی دو حیثیتوں" کا قائل کرنا چاہا ہے، اسی طرح انھوں نے امام ابو یوسفؒ کو بھی مشورہ دے دیا کہ اگر ان کی عبارت میں تھوڑی سی ذہانت سے قطع و برید اور اصلاح کرلی جائے تو وہ سنت کی دو حیثیتیں آسانی سے مان سکتے ہیں، اور اس کا نمونہ بھی انہوں نے پیش کردیا ہے، حاشیہ میں لکھتے ہیں:

> "ابوعبید کی طرح امام ابویوسفؒ بھی سنت کی یہ دو حیثیتیں مانتے ہیں، چنانچہ اس کی مثال گھوڑ سوار مجاہد کو غنیمت سے حصہ دئے جانے کے موقع پر وضاحت سے سامنے آجاتی ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کرتے ہیں، جس میں گھوڑسوار مجاہد کو غنیمت کے حصوں میں سے تین حصے ملیں گے ایک سوار کے لئے اور دو گھوڑے کے لئے۔ بعد ازاں وہ اپنے استاد امام ابوحنیفہؒ کا مسلک بیان کرتے ہیں جو مجاہد کو ایک حصہ

> اور گھوڑے کو ایک حصہ دینے کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک جانور کو مرد مسلم پر فضیلت نہیں دے سکتا، پھر وہ اپنی تائید میں حضرت عمرؓ کے عامل کا عمل پیش کرتے تھے جس نے سوار کو ایک حصہ اور گھوڑے کو ایک حصہ دیا تھا اور جب یہ عمل حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو انہوں نے بھی اسے بحال رکھا تھا..... امام ابویوسفؒ یہ دونوں فیصلے بیان کرنے کے بعد اس وقت کے امیر المومنین (امام) ہارون الرشید سے کہتے ہیں:
>
> "فخذ یا امیر المؤمنین بای القولین رأیت، واعمل بما تری انه افضل واخیر للمسلمین فان ذالک موسع علیک ان شاء اللہ تعالیٰ۔"
>
> ترجمہ:..... "اے امیر المومنین! آپ ان ہر دو اقوال میں سے جسے مناسب تصور فرمائیں اختیار کرلیں اور جسے آپ مسلمانوں کے لئے افضل و بہتر سمجھیں اس پر عمل کرلیں، اس باب میں آپ کو وسیع اختیارات حاصل ہیں۔"
>
> (کتاب الخراج لابی یوسف: ۱۸، ۱۹)

یہ تو ہوا امام ابو یوسفؒ کی اصلاح شدہ عبارت کا نمونہ، اس اصلاح سے پہلے امام ابو یوسفؒ نے جو کچھ کہا، ذرا وہ بھی سن لیجئے، زیر بحث مسئلہ وہی ہے جو موصوف نے بیان فرمایا، امام ابو یوسفؒ اس موقع پر سب سے پہلے حضرت ابن عباسؓ کی یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے جنگ بدر کے موقع پر گھوڑسوار کو دو حصے اور پاپیادہ کو ایک حصہ دیا تھا۔ اسی کے متصل وہ حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت

نقل کرتے ہیں کہ: ہم دو بھائی جنگ حنین میں شریک ہوئے، ہمارے ساتھ دو گھوڑے بھی تھے، آنحضرت ﷺ نے ہمیں چھ حصے دیئے، چار حصے ہمارے گھوڑوں کے، اور دو حصے ہمارے۔"

بعد ازاں امام ابو یوسفؒ، فقیہ مقدم ابو حنیفہؒ کا قول اور حضرت عمرؓ کا اثر نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"وما جاء من الاحاديث والآثار ان للفرس سهمين وللراجل سهما اكثر من ذالك واوثق والعامة عليه." (کتاب الخراج ص:۲۰)

ترجمہ:...... "جن احادیث و آثار میں یہ آتا ہے کہ گھوڑے کے دو حصے ہیں اور آدمی کا ایک حصہ، ان کی تعداد کہیں زیادہ ہے، وہ اعتماد و وثوق کے لحاظ سے بھی بڑھ کر ہیں، اور عام علماً کا عمل بھی ان ہی پر ہے۔"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ امام ابو یوسفؒ اپنے استاذ محترم کے مسلک سے اتفاق نہیں کرتے، نہ ان کے دلائل سے مطمئن ہیں، تاہم چونکہ دونوں طرف احادیث و آثار بھی ہیں، اور فقہائے امت کے اقوال بھی، اس لئے ان کا خیال ہے کہ امیر المومنین کو دونوں میں سے کسی ایک پہلو کے اختیار کر لینے کی انشاءُ اللہ گنجائش ہے۔

اب اگر کسی شخص نے کوئی بات پہلے سے اپنے ذہن میں طے نہ کر لی ہو، وہ امام ابو یوسفؒ کی تقریر سے یہ اصول تو اخذ کر سکتا ہے، کہ جہاں نصوص متعارض اور علماً کے اقوال مختلف ہوں، وہاں کسی ایک جانب کو اختیار کر لینے کی گنجائش ہے، لیکن فاضل مقدمہ نگار نے "سنت کی دو حیثیتوں" کا باریک اصول جو اس سے کشید کیا ہے، وہ

"تحقیقات اسلامی" کی خوردبین کے بغیر کہیں نظر آ سکتا ہے؟

ضمنی طور پر ایک بات اور سن لیجئے، مقدمہ نگار کے اقتباس میں خط کشیدہ فقرہ۔ "سوار کو ایک حصہ اور گھوڑے کو ایک حصہ۔" کی عربی عبارت کتاب الخراج میں یہ ہے "للفارس سهم وللراجل سهم" کیا نیازمندانہ طور پر ان سے عرض کر سکتا ہوں کہ "راجل" کے معنی "گھوڑا" لغت کی کونسی کتاب میں ملاحظہ عالی سے گزرے ہیں؟ اور "ذالک موسع علیک ان شاء الله." کا مفہوم ادا کرنے کے لئے۔ "اس باب میں آپ کو وسیع اختیارات حاصل ہیں۔" کا محاورہ کس "امام" سے سماعت فرمایا؟ حضرات فقہاً کسی چیز کے لئے جب "وسع له ذالک انشاء الله." بولتے ہیں تو اس چیز کی اباحت کے کمزور پہلو کی طرف اشارہ ہوتا ہے یا مکلف کے وسیع اختیارات کی طرف؟

(دراصل یہاں کتاب الخراج کے نسخے میں تصحیف ہے، جس کا ایک قرینہ تو یہ ہے کہ یہ اثر امام ابو حنیفہ کی دلیل میں ذکر کیا گیا ہے، جو "فارس" کو دو حصے اور "راجل" کو ایک حصہ دینے کے قائل ہیں، اس کے برعکس اس اثر میں "فارس" کا ایک حصہ اور "راجل" کا ایک حصہ ذکر کیا گیا ہے، فاضل مقدمہ نگار اس تضاد پر متنبہ ہوئے ہیں، لیکن انہوں نے اسے دور کرنے کے لئے "راجل" کا گھوڑا بنا دیا۔

دوسرا قرینہ پورے جملہ کو سامنے رکھنے سے واضح ہوتا ہے اور وہ یہ ہے:

"قسم في بعض الشام للفارس سهم و للراجل سهم." یہاں سهم کا لفظ قسم کا مفعول واقع ہوا ہے، جسے مرفوع نہیں بلکہ منصوب ہونا چاہئے امام ابوبکر جصاصؒ نے احکام القرآن (ج:۳ ص:۵۸) میں یہ اثر ان الفاظ میں نقل کیا ہے، "انه جعل للفارس سهمين و للراجل سهما." اس سے کتاب الخراج کی عبارت کی تصحیح کی

جاسکتی ہے، حضرت عمرؓ کے اس عامل کا نام کتاب الخراج میں منذرؒ ابن ابی خمیصہ الھمدانی اور احکام القرآن للجصاصؒ میں منذرؒ بن ابی حمصہ ذکر کیا گیا ہے، اور حافظ ابن حجرؒ نے (ج:۳ ص:۵۰۳) میں منذرؒ بن ابی حمیصۃ الھمدانی ذکر کیا ہے۔)

خلاصہ یہ کہ امام ابوعبیدؒ اور امام ابو یوسفؒ کی طرف فاضل مقدمہ نگار نے جو نظریہ منسوب کیا ہے، وہ خود موصوف اور اس کے رفقاء کا ذہنی تخیل ہے، ان بزرگوں کا نام محض وزن بیت کے لئے ذکر کردیا گیا ہے، دراصل کتاب وسنت اور سلف صالحین کے ارشادات کا مطالعہ کرنے اور ان سے استدلال کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی بالکل خالی الذہن ہوکر ان میں غور وفکر کرے، اور کسی امر کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر یہ دیکھے کہ خدا و رسول کا منشا کیا ہے، صحابہؓ وتابعینؒ نے اس سے کیا سمجھا ہے اور سلف صالحین اس پر کس طرح عمل پیرا ہوئے ہیں، اس طرح کے مطالعہ سے توقع کی جاسکتی ہے کہ آدمی صحیح نتیجہ پر پہنچ جائے، جبکہ اس میں اس کی صلاحیت واہلیت بھی ہو مگر کیا کیجئے یہی ہمارے یہاں عنقا ہے۔

فئ اور ٹیکس

فئ اور خمس کا بدل؟

اما ابوعبیدؒ کے حوالے سے ”فئ“ کی تعریف اور اس کے مصارف کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مقدمہ نگار لکھتے ہیں:

”فئ اور خمس غنیمت کی یہ آمدنیاں جن پر اسلامی حکومت کے فوجی وانتظامی اخراجات، نیز وظائف کا دارومدار تھا

اور جو اسلامی مملکت کی ابتدائی صدیوں میں بڑی مقدار میں حاصل ہوتی تھیں، اب تقریباً بند ہوچکی ہیں اور آج اسلامی مملکت کو اپنے فوجی وانتظامی اخراجات کے لئے جو دیگر متبادل ذرائع اختیار کرنا پڑ رہے ہیں وہ اسی ”فئ“ کے بدل ہیں، اندریں حالات ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی حکومت صدقہ مفروضہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ اپنے انتظامی ادارہ کو چلانے اور فوجی اخراجات پورے کرنے کے لئے جو مختلف ٹیکس مقرر کرے گی وہ تمام ”فئ“ کا بدل شمار ہوں گے کیونکہ بہرحال ان کے مصارف وہی ہیں جو ”فئ“ کے ہوا کرتے تھے۔“ (ج:۱ ص:۸۷)

یہ صحیح ہے کہ اس زمانے میں حکومتوں کے اخراجات بہت بڑھ گئے ہیں، جنہیں پورا کرنے کے لئے متبادل ذرائع کی تلاش بہرحال ایک ناگزیر ضرورت ہے، آنحضرت ﷺ کے اسوہ حسنہ اور حضرات خلفائے راشدین (رضوان اللہ علیہم) کی سنت طیبہ میں ہمیں اس کے لئے بہت سے نظائر ملتے ہیں، کہ اگر اسلامی بیت المال کی آمدنی کے معینہ ذرائع، حکومت کی پیش آمدہ ضرورتوں کے لئے کافی نہ ہوں تو اسلامی حکومت کو اجازت ہے کہ وہ اپنی ضروریات کے لئے قرض حسنہ لے (سودی قرضہ کالین دین حکومت کے لئے بھی اسی طرح حرام وناجائز ہے جس طرح امت اسلامیہ کے ہر فرد کے لئے) اہل استطاعت سے چندوں کی اپیل کرے، اس سے کام نہ چلے تو ازروئے قانون مالداروں پر مطلوبہ رقم مہیا کرنے کی پابندی عائد کرے، اور غیر معمولی حالات میں؛ جبکہ ملک وملت کے وجود ہی کے لئے خدانخواستہ خطرہ پیدا ہوجائے تو اسلامی حکومت، متمول طبقہ سے یہ مطالبہ کرسکتی ہے کہ وہ انفاق فی سبیل اللہ

کے جذبے سے رضا کارانہ طور پر تمام اموال فاضلہ جو ان کی واقعی ضروریات سے زائد ہوں، اجتماعی مقاصد کے لئے خرچ کر ڈالیں (اور مسلمانوں پر لازم ہے کہ اپنے دینی فرض کا احساس کرتے ہوئے اس سلسلہ میں اسلامی حکومت سے ہر ممکن تعاون کریں) شرط یہ ہے کہ یہ سب کچھ دین و عقل کے تقاضوں کے مطابق ہو اور اسلام و مسلمین کے مصالح اور ملک و ملت کی فلاح و بہبود کے پیش نظر کیا جائے، کسی فرد پر اس کی استطاعت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے، بیت المال کو مال یتیم کی طرح ایک مقدس امانت سمجھا جائے، ایک ایک پائی کے مصارف میں احتیاط وتقویٰ اور محاسبہ آخرت کو ملحوظ رکھا جائے، اسے ناروا تعیش پسندی، مسرفانہ شاہ خرچی، بے مقصد تفریحوں اور لایعنی تقریبوں پر نہ صرف کیا جائے، جہاں اسلامی ریاست کو اپنی گرانقدر اور عظیم تر ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لئے اسلام، مال جمع کرنے کی اجازت دیتا ہے، وہاں اس کے حدود و قیود بھی متعین کرتا ہے اور مال کی جمع و تفریق میں حکومت پر کڑی شرائط بھی عائد کرتا ہے، بیت المال میں معمولی خیانت اور ادنیٰ بے اعتدالی پر لعنت و غضب خداوندی کی وعید بھی سناتا ہے۔

کیا آج کے مروجہ نظام محاصل میں یہ روح موجود ہے؟ ہر شخص کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے کہ موجودہ دور میں اسلامی ممالک کا نظام محاصل بھی (الا ماشاء اللہ) غیر مسلم اور لادین ملکوں کے نظام محاصل کا چربہ ہے، اس میں اسلامی احکام اور شرعی ہدایات کا کوئی لحاظ، حلال وحرام کی کوئی تمیز اور مسلم وکافر کا کوئی امتیاز سرے سے نہیں، نہ ٹیکس عائد کرتے وقت غریب باجگزاروں کی حالت زار اور قوت برداشت کا لحاظ، نہ اس کی وصولی میں انسانی ہمدردی کا اظہار، نہ سرکاری خزانے کے بے مصرف اڑانے میں کسی قسم کی اعتدال پسندی کا مظاہرہ — آج پورے عالم پر ٹھیک وہی کیفیت طاری

ہے جس کی پیش گوئی آنحضرت ﷺ نے یوں فرمائی تھی:

"یاتی علی الناس زمان لایبالی المرء ما اخذ منه، امن الحلال ام من الحرام." (مشکوٰۃ ص:۲۴۱)

ترجمہ:..... "لوگوں پر ایک ایسا وقت آئے گا جب کہ آدمی کو اس کی قطعاً کوئی پروا نہیں ہوگی کہ وہ حلال طریقہ سے مال لیتا ہے یا حرام طریقہ سے۔"

آج کے ان گنت ٹیکسوں کی طویل فہرست پر ایک نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ ان میں اچھی خاصی تعداد ان ٹیکسوں کی ہے جو محرمات شرعیہ سے وصول کئے جاتے ہیں، ان میں ایسے ٹیکس بھی ہیں جو براہ راست غربت زدہ اور مفلوک الحال طبقہ پر عائد کئے جاتے ہیں (چولھا ٹیکس، مرغی ٹیکس اور بچہ ٹیکس سے آگے پیشقدمی کا سلسلہ جاری ہے) ہزاروں غریب کسان ایسے ہیں جن کی سارے سال کی خون پسینہ کی کمائی حکومت کے مالیہ میں چلی جاتی ہے، اور وہ اپنے بیوی بچوں سمیت فاقہ مستی کی مشق کرنے پر مجبور ہیں، یا پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے غلط راستوں کا رخ کرتے ہیں، اور جو ٹیکس بظاہر متمول طبقہ پر عائد کئے جاتے ہیں ان کی ساخت بھی ان کے ذہین واضعین کی بدولت کچھ ایسی رکھی جاتی ہے کہ ان کا بیشتر بار بھی اسی پسماندہ طبقہ پر پڑے، تجارتی مال پر ٹیکس کا سارا بوجھ بالآخر خریداروں پر آگرتا ہے، صنعتی مال کا ٹیکس بالآخر صارفین کو ادا کرنا ہوتا ہے، ذرائع مواصلات کا تمام ٹیکس غریب عوام ہی پر تقسیم ہوتا ہے، فاضل مقدمہ نگار کا اس لادینی نظام محاصل کو "فیٔ اور خمس کا بدل" قرار دینا نہ صرف ژولیدہ فکری کی افسوسناک مثال ہے، بلکہ اسلام کی ایک مقدس اصطلاح کی بے حرمتی بھی، اگر ہم اپنے مالیاتی نظام کو اسلامی منہاج پر لانا ہے، اور سرمایہ داری کے

عفریت نے ہماری معیشت کو جس طرح درہم برہم کر ڈالا ہے اس کی اصلاح چاہتے ہیں تو اس کے لئے ہمیں سب سے پہلے ان امکانات کا جائزہ لینا ہوگا کہ کس طرح موجودہ نظام محاصل کے ڈھانچے کو بدل کر اس کی جگہ شرعی بیت المال قائم کیا جائے؟ اس کے ساتھ ساتھ حرام ذرائع کو یکسر بند کرنا ہوگا، سرکاری افسروں کو سادگی، کفایت شعاری اور قناعت پسندی کی تربیت دینا ہوگی، ان کا معاشی لیبل عوامی معیشت کے تناسب سے نیچے لانا ہوگا، مسرفانہ شاہ خرچیوں کا سدباب کرنا ہوگا، معاشرے میں استحصال کے لئے عقل وایمان، دیانت وامانت اور فہم وفراست کی بہت بڑی مقدار درکار ہے، اس کے بجائے ہمارے دانشوروں نے غیر اسلامی اور غیر فطری نظریات کو ''اسلامیانے'' کا نسخہ کیمیا ڈھونڈھ نکالا ہے کہ دنیا کا کوئی گرا پڑا نظریہ حیات لو جسے اس کے اصل موجد بھی کھوٹا سکہ سمجھ کر اسے پھینک چکے ہوں اس پر دو چار الٹی سیدھی آیتیں پڑھ کر ''چھومنتر'' سے اسے مشرف باسلام کرلو، اس پر اسلام کا لیبل لگاؤ اور رسالوں، ماہناموں اور کتابوں میں اس کی اسلامیت کا اشتہار دے دو، فاضل مقدمہ نگار نے موجودہ نظام محاصل کو اسی چھومنتر سے ''فیٔ اور خمس کا بدل'' قرار دیا ہے، اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا اسی نسخہ کیمیا سے اشتراکیت کو مشرف باسلام فرما کر ''اسلامی اشتراکیت'' کا وعظ فرمایا ہے۔

مسلمانوں سے ٹیکس؟

حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں شاہراہوں پر عاشر ''محصل'' مقرر کئے تھے، جو مال تجارت پر مسلمانوں سے ڈھائی فیصد زکوٰۃ لیتے تھے اور ذمیوں سے پانچ فیصد اور اہل حرب سے دس فیصد ''عشور'' وصول کیا کرتے تھے، روایات میں اس کی

تصریح موجود ہے کہ مسلمانوں سے صرف ان کے مال کی زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی اور اسی پر تمام امت اور ائمہ کا اجماع ہے، لیکن فاضل مقدمہ نگار اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں سے اس قسم کا جو ٹیکس؟ لیا جاتا تھا وہ زکوٰۃ ہوتی تھی. لیکن سوال یہ ہے کہ یہ وہ زکوٰۃ تو نہیں تھی جو سال گزرنے پر لی جاتی ہے، یہ عشور تو نیا سامان درآمد برآمد کرنے پر بغیر سال گزرے وصول کیا جاتا تھا، لہٰذا ہماری نظر میں ارجح یہی ہے کہ یہ عشور اس صدقہ کے علاوہ لیا جاتا تھا، جو رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے اموال پر مقرر فرمایا تھا۔ واللہ اعلم''

یہ مقدمہ نگار کا محض خیالی مفروضہ ہے، جس کا وجود باہر کی دنیا میں نہیں، نہ اس پر وہ عقل ونقل سے کوئی دلیل لاسکتے ہیں، انہیں چونکہ موجودہ دور کے ٹیکسوں کو مسلمان کرنا ہے، اس لئے بزعم خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس کی سند لے آئے، حالانکہ حدیث وفقہ اور سیر وتاریخ کی کسی کتاب میں یہ نہیں ملے گا کہ دور نبوت و خلافت میں مسلمانوں سے کوئی ٹیکس وصول کیا گیا، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مسلمانوں کے مال تجارت سے ڈھائی فیصد زکوٰۃ ہی وصول کی جاتی تھی، اور سال گزرنے کی شرط کو پوری طرح ملحوظ رکھا جاتا تھا، اس سلسلہ میں خود امام ابوعبیدؒ کی تصریح یہ ہے:

''وكان مذهب عمر فيما وضع من ذلك انه كان ياخذ من المسلمين الزكوٰة.''

(کتاب الاموال ص:۵۳۱)

ترجمہ:......"اس بارے میں حضرت عمرؓ کا مسلک یہ تھا کہ وہ مسلمانوں سے تو زکوٰۃ وصول کرتے تھے۔"

(ترجمہ کتاب الاموال ج:۲ ص:۲۹۶)

امام ابوعبیدؒ کی عبارت کا یہ ترجمہ خود فاضل مقدمہ نگار کے قلم سے ہے، نہیں معلوم کہ وہ خود اپنی تحریر سمجھنے سے بھی معذور ہیں، یا عمداً تحریف پر مامور ہیں، موصوف کے لئے کچھ اور تصریحات بھی پیش کی جاتی ہیں، امام ابوبکر جصاص رازیؒ اموال تجارت کی زکوٰۃ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"......کتب عمر بن عبدالعزیز الی عماله ان یا خذوا مما یمر به المسلم من التجارات من کل عشرین دیناراً نصف دینار و مما یمر به الذمی یوخذ منه من کل عشرین دینارا دینار، ثم لا یؤخذ منه شئ الا بعد حول، اخبرنی بذالک من سمع النبی صلی الله علیه و سلم، وکتب عمر بن الخطاب الی عماله ان یاخذوا من المسلم ربع العشر، ومن الذمی نصف العشر، ومن الحربی العشر، وما یوخذ من المسلم من ذالک فهو الزکوة الواجبة، تعتبر فیها شرائط وجوبها من حول و نصاب و صحة ملک، فان لم تکن الزکوة قد وجبت علیه لم توخذ منه." (احکام القرآن ج:۳ ص:۱۵۵ طبع ۱۳۳۵ھ)

ترجمہ:......"حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے عمال کو لکھا تھا کہ "مسلمان جس مال تجارت کو لے کر گزرے اس

سے بیس دینار میں سے نصف دینار وصول کیا جائے، اور جو مال ذمی لے کر گزرے اس سے بیس دینار میں سے ایک دینار لیا جائے، پھر اس مال سے سال بھر تک کچھ وصول نہ کیا جائے، مجھے اس کی ایک ایسے شخص نے خبر دی ہے جس نے یہ بات آنحضرت ﷺ سے سنی ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے عمال کو لکھا تھا کہ "مسلمان سے چالیسواں حصہ، ذمی سے بیسواں حصہ اور حربی سے دسواں حصہ وصول کریں، مسلمان سے اس سلسلہ میں جو کچھ لیا جائے گا یہ وہی مقررہ زکوٰۃ ہوگی جو شرعاً واجب ہے، اس میں زکوٰۃ کے شرائط وجوب کو مثلاً سال کا گزرنا، نصاب کا ہونا، اور صحیح ملکیت کا ہونا، ملحوظ رکھا جائے گا، اور اگر کسی مسلمان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے تو اس سے کچھ نہیں لیا جائے گا۔"

امام شافعیؒ کتاب الام میں رزیق بن حکیم سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے انہیں لکھا تھا:

"مسلمانوں سے مال تجارت سے چالیس دینار پر ایک دینار وصول کیا کرو، اس سے کم بیس دینار تک اسی حساب سے لو، اور اگر اس سے تہائی دینار بھی کم ہو تو اسے چھوڑ دو اس پر کچھ نہ لو۔"

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

"ویعدله حتی یحول علیه الحول فیاخذ، ولا یاخذ منهم حتی یعلموا ان الحول قد حال علی ما یاخذ منه." (کتاب الام ج:۲ ص:۳۹)

ترجمہ:...... "عاشر، اسے نوٹ کرلے گا تاکہ سال گزرنے پر اس کی زکوٰۃ لے سکے گا، اور جب تک اسے یہ معلوم نہ ہوجائے کہ اس مال پر سال گزر چکا ہے، ان تاجروں سے کچھ وصول نہیں کرے گا۔"

امام سرخسی المبسوط میں لکھتے ہیں:

"العاشر یاخذ مما یمر به المسلم علیه الزکوٰة، اذا استجمعت شرائط الوجوب، لان عمر بن الخطاب رضی الله تعالیٰ عنه لما نصب العشار قال لهم: خذوا مما یمر به المسلم ربع العشر...... وان عمر بن العزیز کتب الی عماله بذلک وقال اخبر نی به من سمعه من رسول الله صلی الله علیه و سلم."

(المبسوط ج:۲ ص:۱۹۹)

ترجمہ:...... "عاشر مسلمان کے اس مال سے جسے لے کر وہ گزرے، زکوٰۃ وصول کرے گا جبکہ اس میں وجوب زکوٰۃ کی تمام شرائط جمع ہوں، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب عاشر مقرر کئے تو ان سے فرمایا کہ: مسلمان جو مال تجارت لے کر گزرے اس سے چالیسواں حصہ وصول کیا کرو...... یہی بات

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی اپنے کارندوں کو لکھی تھی، اور فرمایا تھا کہ یہ بات مجھے ایسے شخص نے بتلائی ہے جس نے آنحضرت ﷺ سے سنی ہے۔"

شیخ محی الدین نوویؒ شرح مہذب میں لکھتے ہیں:

"النصاب والحول معتبران فی زکوٰة التجارة بلا خلاف...... الخ." (المجموع شرح المہذب ج:۶ ص:۵۵)

ترجمہ:...... "مال تجارت کی زکوٰۃ میں نصاب اور سال کا گزرنا شرط ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔"

اس قسم کی بیسیوں شہادتوں کی موجودگی میں فاضل مقدمہ نگار کا یہ دعویٰ کتنا عجیب ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کے مال تجارت پر "زکوٰۃ" کے علاوہ ڈھائی فیصد ٹیکس نافذ کردیا تھا، جس کے لئے سال گزرنے کی شرط بھی نہیں تھی، جو حضرات حدیث وفقہ اور اسلامی موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں ان کی طرف سے ایسی سطحی اور مہمل باتوں کا پیش کیا جانا اور اسلامی حقائق کو توڑ موڑ کر غلط رنگ دینا بڑی تکلیف دہ بات ہے۔

موصوف نے چونکہ "مسلمانوں پر ٹیکس" کا ذکر چھیڑا ہے اس لئے مناسب ہے کہ اس بارے میں اسلام کا نقطہ نظر معلوم کیا جائے، امام ابوعبیدؒ، کتاب الاموال میں ٹیکس کی مذمت میں چند احادیث وآثار نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"ان احادیث کا محمل جاہلیت کے وہ ٹیکس ہیں جو عرب وعجم کے بادشاہ لیا کرتے تھے، چنانچہ ان کا دستور تھا کہ وہ تاجروں سے دس فیصد تجارتی ٹیکس لیتے تھے، اس کی وضاحت

ان مکاتیب سے ہوتی ہے جو آنحضرت ﷺ نے ثقیف، بحرین، دومۃ الجندل اور دوسرے شہروں کے مسلمان باشندوں کو لکھے تھے کہ ''ان سے ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔'' اس قسم کی بہت سی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک جاہلی دستور تھا، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ اور اسلام کے ذریعہ توڑا اور چالیسواں حصہ زکوٰۃ فرض ہوئی، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: مسلمانوں پر ٹیکس نہیں بلکہ ٹیکس تو یہود و نصاریٰ پر ہیں۔''

(کتاب الاموال ص: ۵۲۹ ملخصاً)

تفصیل اس کی یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جہاں زندگی کے اور شعبے بے اعتدالی کی نذر تھے، وہاں اقتصادی و معاشی شعبہ بھی افراط و تفریط سے خالی نہیں تھا، جن مختلف ذرائع سے عوام کو لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بنایا جاتا تھا، ان میں سود اور ٹیکس کو سب سے نمایاں جگہ حاصل تھی، سودی نظام کے تحت عوامی معیشت پر ساہوکاری کا بوس کچھ اس طرح چھایا ہوا تھا کہ فاقہ زدہ عوام پشت در پشت قرض کے بوجھ تلے دبے رہتے تھے، اور سود در سود کے جال سے نجات کی کوئی صورت انہیں نظر نہیں آتی تھی، اگر وہ سود کی مقررہ قسط ادا کرنے کی سکت نہ رکھتے...... تو سنگ دل سرمایہ دار انہیں اپنی بہو بیٹیوں کو گروی رکھنے پر مجبور کرتا، ادھر رئیسوں، نوابوں اور شہنشاہوں کی طرف سے ان پر گراں بار ٹیکس عائد تھے، ان میں ہر سال اضافہ ہوتا رہتا تھا، ان کی وصولی میں ماتحت حکام پوری سنگدلی اور بے رحمی کا مظاہرہ کرتے تھے، اگر کوئی شخص اپنی ناداری کی بنا پر ان کی ادائیگی نہ کر پاتا تو شاہی عتاب کا مستوجب ہوتا، اس کے املاک کی قرقی یا بحق سرکار ضبطی کے احکام صادر کئے جاتے۔ گویا عوام جو کچھ کمائے وہ خود اپنی یا اپنے

بیوی بچوں کے لئے نہیں، بلکہ ان انسان نما خونخوار درندوں کے لئے، جو دولت و اقتدار کی کنجیوں کے مالک تھے، اسلام انسانیت کی اس بنجر زمین پر ابر رحمت بن کر برسا، اس نے الجھی ہوئی معیشت کی گتھی سلجھائی اقتصادی استحصال کے تمام دروازے بند کئے، زمانے کی ہر کجی کو سیدھا کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے تاریخ کے دھارے بدل گئے اور قافلہ انسانیت پھر سے صراط مستقیم پر جادۂ پیمائے منزل ہوا، اسلام نے اس کے لئے جو ''معاشی اصلاحات'' نافذ کیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ:

اولاً:...... نظام زکوٰۃ جاری فرمایا، جس کی بنیاد ''**یؤخذ من اغنیائہم ویرد علی فقرائہم**'' کے اصول پر رکھی گئی، یعنی زکوٰۃ کا مطالبہ...... جاہلی ٹیکسوں کی طرح ...... ہر شخص سے نہیں ہوگا، بلکہ یہ صرف ان اغنیاء سے وصول کی جائے گی جن کے پاس سال بھر کے اخراجات و ضروریات زندگی پورا کرنے کے بعد ''نصاب'' کی بقدر بچت رہ جاتی ہے، مگر ان سے وصول شدہ یہ زکوٰۃ حکومتوں کی تجوریوں میں جمع نہیں رہے گی، بلکہ ایک ہاتھ لی جائے گی اور دوسرے ہاتھ، فقراء و مساکین پر تقسیم کردی جائے گی۔

ثانیاً:...... زکوٰۃ کی ایک قطعی مقدار معین کرکے افراط و تفریط کا دروازہ بند کردیا گیا: ''ثم مست الحاجة الی تعیین مقادیر الزکوة، اذ لو لا التقدیر لفرط المفرط ولاعتدی المعتدی.'' (حجۃ اللہ البالغہ ج:۲ ص:۳۹) ورنہ اس کا امکان تھا کہ جاہلی ٹیکس زکوٰۃ کے نام سے وصول کئے جانے لگتے اور اس مقدس فریضہ کو استحصال کا ذریعہ بنالیا جاتا۔

ثالثاً:...... سود کی تمام انواع و اقسام کو حرام قرار دے کر لفظ سود کو اسلام کی معاشی ڈکشنری سے خارج کردیا گیا، سود خوروں کے خلاف اعلان جنگ کیا گیا، اور

سود کالین دین کرنے والوں کے ساتھ اس کے شاہد و کاتب کو بھی ملعون قرار دیا گیا۔

رابعاً:...... خرید و فروخت کی ان تمام صورتوں کو، جن سے معاشی ناہمواری کا خطرہ تھا، ناجائز اور ممنوع ٹھہرایا گیا (اس کی تفصیل حدیث و فقہ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے)۔

خامساً:...... جاہلی ٹیکسوں کو یکسر منسوخ قرار دیا گیا (ترجمہ کتاب الاموال ج:۱ ص:۳۴۸۔ ج: ۲ ص:۹۳) مسلمانوں کو اطمینان دلایا گیا کہ ان سے زکوٰۃ مفروضہ سے زائد کوئی ٹیکس نہیں لیا جائے گا (ترجمہ کتاب الاموال ج:۲ ص:۲۹۴) مسلمانوں سے فرمایا گیا کہ وہ اللہ کا شکر کریں کہ انھیں ٹیکسوں کی لعنت سے نجات ملی ("یا معشر العرب احمدوا اللہ الذی رفع عنکم العشور." مجمع الزوائد ج:۳ ص:۸۷) ٹیکس وصول کرنے والوں کو زانیہ سے بدتر بتایا گیا: "وفی قصۃ الغامدیۃ: مھلا یا خالد! فوالذی نفسی بیدہ لقد تابت توبۃ لو تابھا صاحب مکس لغفر لہ." (صحیح مسلم باب حد الزنا ج:۲ ص:۶۸) اسے جنت سے محروم اور آتش جہنم کا مستحق قرار دیا گیا (ترجمہ کتاب الاموال ج:۲ ص:۲۹۱) اس کے قتل کا حکم دیا گیا (مجمع الزوائد ص:۸۷ ج:۳، کتاب الاموال ج:۲ ص: ۲۹۲) اس کے بارے میں اعلان فرمایا گیا کہ رحمت خداوندی کے مخصوص اوقات میں بھی وہ مغفرت سے محروم رہتا ہے (مجمع الزوائد ج:۳ ص:۸۸)۔

جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے، اسلامی حکومت کو اہل استطاعت سے مالی مطالبہ کا حق ہے تاہم یہ ایک ناگزیر اور اضطراری حالت ہوگی، ورنہ ٹیکس کے بارے آنحضرت ﷺ کے ارشادات سے واضح ہے کہ اسلام اس کے وجود کو برداشت نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ کے دور تک مسلمانوں پر کوئی ٹیکس عائد نہیں تھا،

ان سے صرف زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی (ترجمہ کتاب الاموال ج:۲ ص:۲۹۲) البتہ بنی امیہ کے بعض حکمرانوں نے یہ بدعت شروع کی تھی جسے خلیفہ عادل حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بند کیا اور چنگی خانوں کو ڈھادینے کا حکم دیا۔
(کتاب الاموال ج:۲ ص:۲۹۱)

سلطنت عباسیہ اور غلاموں کی سلطنت کے دور زوال میں حکام کی عیش پسندی، فوج اور انتظامیہ کے وظائف میں بے پناہ اضافہ اور سلطانی اخراجات کی گراں باری کی بنا پر عوام پر بہت سے ٹیکس لگائے گئے حتیٰ کہ حاجیوں سے "حج ٹیکس" تک وصول کیا جانے لگا، بالآخر سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ نے ان قبیح مراسم کا قلع قمع کیا (مقدمہ ابن خلدون ص:۲۸۱) محقق ابن خلدونؒ کی رائے میں سرکاری اخراجات میں بے پناہ اضافہ اور عوام پر ٹیکسوں کی بھرمار کسی قوم کی ترقی اور حکومت کے استحکام کی علامت نہیں بلکہ یہ اس کے زوال و اضمحلال کا نشان ہے جس سے پتہ چلتا ہے، کہ یہ سلطنت اپنا طبعی وقت پورا کرچکی ہے۔ اہل علم اس کے لئے مقدمہ ابن خلدونؒ، باب ثالث، فصل ۳۸ تا ۴۳ کی مراجعت فرمائیں۔

اسلامی اشتراکیت؟

فاضل مقدمہ نگار نے "اسلامی اشتراکیت" پر بھی داد تحقیق دی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

"الغرض حضرت عمرؓ نے اس طرح انفرادی مفاد کو اجتماعی مفاد پر قربان کرکے "اسلامی اشتراکیت" کو قرآن مجید

سے نہایت طویل غور وفکر اور اجتہاد کے بعد استنباط کیا۔"

(مقدمہ کتاب الاموال جلد اول ص:۸۲)

اسلامی اشتراکیت یا اسلامی سوشلزم کی بحث ہمارے خیال میں کتاب الاموال کے مباحث سے قطعی بے جوڑ اور غیر متعلق ہے، ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ موصوف نے کتاب الاموال کے مقدمہ میں اشتراکیت کی حمایت پر خامہ فرسائی کا "بلاوجہ تکلف" کیوں فرمایا؟ پھر ان کے نیاز مند قارئین کی یہ شکایت بھی بے جا نہیں کہ موصوف نے "اسلامی اشتراکیت" پر دلائل پیش کرتے ہوئے تو درازنفسی کا خاصا ثبوت دیا، نہ اطناب وتطویل سے پرہیز، نہ اعادہ وتکرار سے اجتناب، نہ کاغذ اور سیاہی کے استعمال میں بخل لیکن اس سلسلہ میں سب سے پہلے کرنے کا جو کام تھا اس کی طرف التفات نہیں فرمایا، یعنی یہ نہیں بتایا کہ "اسلامی اشتراکیت" کا مفہوم اور اس کا حدود اربعہ کیا ہے؟ یہ اصطلاح کب سے وجود میں آئی اور "اسلامی اشتراکیت" کے لفظ کو ڈکشنری میں کب سے جگہ ملی؟

غالباً یہ اصول ساری علمی دنیا میں مسلم ہے کہ جب آپ کسی موضوع کی حمایت و وکالت کے لئے کھڑے ہوں تو آپ کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ آپ اپنے دعویٰ کا مفہوم واضح کریں اور اس کے حدود کی تعیین فرمائیں، تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ آپ کے پیش کردہ دلائل اپنے موضوع سے کہاں تک مطابقت رکھتے ہیں؟ آپ کے دعویٰ کے لئے کس حد تک مفید ہیں؟ لیکن فاضل مقدمہ نگار "اسلامی اشتراکیت" "اجتماعی مفاد" اور "قومی ملکیت" جیسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے کہیں یہ نہیں بتاتے کہ اس اسلامی اشتراکیت کے صحیح حدود کیا ہیں؟ اور ان کی تعیین کے لئے فکر ونظر کا سرمایہ کہاں سے مستعار لیا جائے گا (یہ بات ہم آگے چل کر واضح کریں

گے کہ بعض چیزوں کے حکومت کی تحویل میں رہنے کو اشتراکیت یا اسلامی اشتراکیت سے تعبیر کرنا محض ابلہ فریبی ہے) اب جبکہ فاضل مصنف نے اس سلسلہ میں خاموشی اختیار کی ہے ہمارے لئے یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ موصوف کے دلائل کا جائزہ لینے سے پہلے "اسلامی اشتراکیت" کی اصطلاح پر گفتگو کریں اور یہ بتائیں کہ ہمارے یہاں یہ اصطلاح کن معنوں میں استعمال کی جاتی ہے؟

"اسلامی اشتراکیت" لفظی اعتبار سے مرکب توصیفی ہے، جس میں "اشتراکیت" کو اسلام سے منسوب وموصوف کیا گیا ہے، اس لئے اس کا لفظی مفہوم یہ ہوگا: "ایک ایسی اشتراکیت جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہو، یا اسلام سے مستنبط ہو، یا اسلام اس کا حامی اور مؤید ہو۔" یہ تو ہوا اس کا لفظی ترجمہ، اب رہی یہ بحث کہ کیا واقعتہً اشتراکیت کی کوئی ایسی نوع موجود ہے جو اسلام پر مبنی ہو؟ اس کے لئے ہمیں نفس اشتراکیت کی ماہیت کو سامنے لانا ہوگا، اشتراکیت کی تعریف یہ کی گئی ہے:

"سماجی تنظیم کا ایک ایسا نظریہ یا مسلک جو تمام وسائل پیداوار سرمایہ، زمین ملک، وغیرہ پر پورے معاشرے کی ملکیت اور اجتماعی تصرف کا مدعی ہو، اور جس کا مقصد سب کے مفاد میں ان وسائل کی تنظیم اور تقسیم ہو" (آکسفورڈ ڈکشنری، بحوالہ "چراغ راہ" سوشلزم نمبر ص۲۷) "اور یہ کام سماجی انقلاب کے ذریعہ کیا جائے گا جو مزدوروں کی راہنمائی میں برپا ہوگا۔"

(انسائیکلوپیڈیا اردو، فیروز سنز، لاہور ص:۸۵۶)

گویا اشتراکیت جس "اجتماعی مفاد" کا صور پھونکتی ہے اول سے آخر تک اس کا جائزہ لیا جائے تو اسے چھ مراحل پر تقسیم کیا جاسکتا ہے:

اول:...... طبقاتی عصبیت...... جس کا حاصل یہ ہے کہ ملک کے محنت کش طبقہ کو یہ دعوت دی جائے کہ وہ خالص محنت کشی کی بنیاد پر ایک محاذ قائم کریں، اور انہیں ان کی مظلومیت کے افسانے سنا سنا کر توڑ پھوڑ، قتل وغارت، آتش زنی اور گھیراؤ پر اس قدر برانگیختہ کردیا جائے کہ پورا معاشرہ ایک ہولناک انقلابی آتش فشاں میں تبدیل ہوجائے۔ اور سارا ملک لاقانونیت اور فتنہ وفساد کا آتش کدہ بن کر رہ جائے۔

دوم:...... سماجی انقلاب...... پھر اس عصبیتی آتش فشاں کے ذریعہ مزدور لیڈروں (کامریڈوں) کی راہنمائی میں "مزدور راج" کا نعرہ لگا کر "جبری انقلاب" برپا کردیا جائے، جو سماج کی تمام قدروں کو تہ وبالا کر ڈالے، اور معاشرے کی اخلاقی، مذہبی، روحانی خصوصیات اور روایات کو پامال کر ڈالے۔

سوم:...... قومی ملکیت اور اجتماعی تصرف...... "مزدور راج" قائم ہوجانے کے بعد تمام پیداواری وسائل افراد سے چھین چھین کر انہیں "قومی ملکیت" قرار دیا جائے، اور چند پارٹی لیڈروں کے ہاتھ میں پوری قوم کی نکیل تھمادی جائے، انہیں ہر قسم کے سیاہ وسفید کا مالک اور منصب رزاقیت پر فائز کردیا جائے وہ اپنی صوابدید کے مطابق جسے جتنا چاہیں عنایت فرمائیں، قوم کا ایک ایک فرد اسٹیٹ کا بندۂ بے دام اور کامریڈوں کا کمیرا ہو، مزدور اب بھی مزدور ہی رہے گا لیکن پہلے وہ باختیار، خود جتنی محنت چاہے کرسکتا تھا، لیکن اب مزدوری کے ساتھ اسے جبریت وتشدد کی بندگی وغلامی بھی کرنی ہوگی، بدترین غلامی، مکروہ ترین بندگی۔ حد یہ کہ "مزدور راج" میں ماں باپ کے یہاں جو بچہ پیدا ہوگا وہ بھی اسٹیٹ کا غلام زادہ اور

کامریڈوں کا ننھا کمیرا ہوگا، والدین کا اس پر کوئی اختصاصی حق نہیں، کامریڈ جسے چاہیں زندہ رکھیں اور جسے چاہیں "پارٹی کا غدار" کہہ کر تختۂ دار پر لٹکادیں۔

چہارم:...... تنظیم وسائل...... رزاق مطلق کے تخت پر نزول اجلال فرمانے کے بعد اب یہ نئے خدا وسائل کی تقسیم پر غور فرمائیں گے...... "رزاق مطلق" اور "نئے خدا" جیسے الفاظ کو مبالغہ یا طنز پر محمول نہ کیا جائے، حقیقت واقعہ یہی ہے کہ اشتراکیت میں رزاق حقیقی اور خدائے واحد کا تصور ناقابل برداشت ہے، الوہیت کے حقوق پارٹی لیڈروں میں مرتکز تسلیم کئے جاتے ہیں...... طلب ورسد کا سروے کیا جائے گا، افراد کی درجہ بندی ہوگی، ہر فرد کی صلاحیت کارکردگی کا جائزہ لیا جائے گا، اور یہ دیکھا جائے گا کہ کل آمدنی کا کتنا حصہ ترقیاتی منصوبوں اور اجتماعی مقاصد کے لئے رکھا جائے؟ اور کتنا حصہ افراد پر تقسیم کیا جائے؟ پھر ہر فرد (مرد و عورت) کی صلاحیت کے طے شدہ درجہ کے مطابق اسے گھاس ڈالنے کا فیصلہ کیا جائے، (جب پورے ملک کو ایک بڑے اصطبل میں اور وہاں کی انسانی آبادی کو بے بس حیوانوں میں تبدیل کردیا جائے، جن کے حق میں یہ فرض کرلیا جائے کہ سرکاری ڈیوٹی کے سوا ان کا کوئی مصرف، شکم پری کے علاوہ ان کا کوئی تقاضا اور اپنے لئے نیک وبد کی تمیز کا انہیں کوئی حق نہیں ہے، تو فرمایئے کہ ان کو عطا کردہ "روٹی" کے لئے "گھاس" کے علاوہ کیا تعبیر موزوں ہوسکتی ہے؟ "أُولٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ") نہ سب کا وظیفہ مساوی درجہ کا ہوگا، نہ کسی کی خواہش وضرورت کا لحاظ ہوگا۔ گویا مساوات کا وعدہ، جسے اشتراکیت کا عظیم کارنامہ باور کرایا جاتا ہے، محض سراب نکلا ـــ اور فرد کی واقعی ضروریات کو معیار قرار دینا ایک احمقانہ تجویز، انا للہ۔

پنجم:...... تقسیم...... اب ضروریات زندگی کے سرکاری ڈپو کھلیں گے، اشتراکی جنت کے باسیوں اور مزدور راج کی بے بس رعایا کو حکم ہوگا کہ آٹھ گھنٹے کی سرکاری ڈیوٹی کے بعد فلاں ڈپو سے آٹا حاصل کریں، اور فلاں فلاں سے سبزی، کپڑا وغیرہ وغیرہ ــــ مصارف زندگی کی کوالٹی کا انتخاب سرکاری منشا کے مطابق ہوگا، قیمتوں کا تعین صرف سرکار کرے گی، یہ بات خارج از بحث ہوگی کہ مطلوبہ چیز صارف کے ذوق اور پسند کے مطابق ہے یا نہیں اور اس کی قیمت خریدار کی قوت خرید کے مطابق ہے یا نہیں، وہ چیز اس کے پسند کی ہو یا نہ ہو، اور اس کی قیمت مناسب ہو یا نامناسب، اسے بہرحال قبول کرنی ہوگی۔

ششم:...... جبریت...... اور جب قومی تنظیم و تقسیم کا یہ مرحلہ طے ہوا، تو اشتراکیت کا سہانا خواب پورا ہوگیا، اب کسی کو اس نظام کے خلاف دم مارنے کی، اور پارٹی لیڈروں کے فیصلہ کے خلاف لب کشائی کی اجازت نہیں ہوگی، کوئی مزدور کارخانہ تبدیل نہیں کرسکتا (روس میں ۲۵/اپریل ۱۹۵۶ء تک یہی قانون تھا، اس تاریخ سے یعنی اشتراکی انقلاب کے چھبیس سال دوماہ بعد یہ "حق" لفظاً تسلیم کرلیا گیا کہ مزدور ایک ملازمت چھوڑ کر دوسری کرسکتا ہے، لیکن عملاً آج تک روز اول ہے) نہ وہ فریاد کرسکتا ہے کہ اس کا "حق محنت" اس کی ضروریات کے لئے ناکافی ہے، لیڈرشپ کے خلاف جو زبان حرکت میں آئے گی اسے گدی سے کھینچ لیا جائے گا، وہ سر، تن سے جدا کردیا جائے گا جسے اس کے خلاف سوچنے کا سودا ہو، وہ سینہ چھلنی کردیا جائے گا جو اس نظام سے کسک محسوس کرے، اس منہ پر آہنی قفل چڑھادئے جائیں گے جو حرف شکایت زبان پر لائے، وہ ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں گے جو اس نظام پر ایک حرف لکھنے

کے "مجرم" ہوں، پارٹی کا فیصلہ گویا خدائی فیصلہ ہوگا، جس کے خلاف نہ اپیل، نہ احتجاج، نہ مطالبہ، نہ ہڑتال، نہ جلسہ، نہ قرارداد، یہ سب کچھ افسانہ نہیں بلکہ وہ تلخ حقیقت ہے جس کا تماشہ روس، چین، ہنگری اور دوسرے اشتراکی ممالک میں چشم فلک نے سیکڑوں بار دیکھا ہے، اور جس کا مرثیہ سمرقند و بخارا کے در و دیوار سے آج نصف صدی بعد بھی سنا جاسکتا ہے، حاصل یہ کہ اشتراکیت کا عمل منافرت، طبقاتی تفریق اور توڑ پھوڑ سے شروع ہوگا اور جبریت ـــ کامل جبریت، وحشیانہ جبریت ـــ پر ختم ہوجائے گا۔

اب اگر اشتراکیت اور اسلام کی معنویت، ان کے اصولی تصورات، ان کے بنیادی مقاصد، ان کے طریق عمل اور ان کے آثار و نتائج کو الگ الگ سامنے رکھا جائے تو بادنیٰ تامل واضح ہوجاتا ہے کہ اشتراکیت اور اسلام کے مابین آسمان و زمین کا فاصلہ، مشرق و مغرب کا بعد اور دن و رات کی نسبت ہے، مسکینوں کا وہ گروہ جو بصارت و بصیرت سے محروم ہے وہ تو خیر معذور ہے، ورنہ کسی صحیح بصارت والے شخص سے جس طرح یہ ممکن نہیں کہ وہ رات کو دن اور دن کو رات کہے، اسی طرح جس کے دل کی آنکھیں روشن ہوں، وہ اسلام کو اشتراکیت اور اشتراکیت کو اسلام کہنے کی جسارت نہیں کرسکتا (پاکستان میں کوئی عالم دین ہمیں معلوم نہیں جو "اسلامی اشتراکیت" کی ترکیب کو لفظاً یا معناً صحیح سمجھتا ہو) اشتراکیت کی کوئی قسم ایسی نہیں جو اسلام سے مطابقت رکھتی ہو، نہ اسلام کا کوئی شعبہ ایسا ہے جو اشتراکیت کے اصول و مقاصد کا حامی ہو ـــ یہی وجہ ہے کہ اسلامی لغت میں "اشتراکی اسلام" یا "اسلامی اشتراکیت" کا لفظ کبھی استعمال نہیں ہوا، نہ کوئی مسلمان اس سے واقف تھا، البتہ قیام پاکستان سے چند سال پہلے بعض بزرگوں نے، جن کا نام یہاں ذکر کرنے کی ضرورت

نہیں، اسلام اور اشتراکیت کا تقابلی مطالعہ کر کے اسلام کے اجتماعی عدل اور نظریہ معیشت کے لئے "اشتراکیت" کی اصطلاح اختراع کی، یہ اطلاق محض "مجاز مشاکلت" کے طور پر کیا گیا تھا، جس سے ان بزرگوں کا مقصد یہ تھا کہ جن لوگوں کی نظریں اشتراکیت کے سراب کی ظاہری چمک دمک سے خیرہ ہو رہی ہیں، انہیں اس نئی اصطلاح کے ذریعہ اسلامی معیشت کے چشمہ حیات کی طرف متوجہ کیا جا سکے ـــ مشہور مقولہ کے مطابق بڑوں کی غلطی بھی بڑی ہوتی ہے ـــ عملی تنقید سے بہت جلد یہ واضح ہو گیا کہ اسلام کے معاشی نظام پر "اسلامی اشتراکیت" کا اطلاق سوءِ تعبیر ہے ـــ اسلام کا یہ خصوصی امتیاز ہے کہ وہ اپنے اصول و مقاصد کی تفہیم کے لئے درآمدی تعبیرات کا دست نگر نہیں، نہ اس کا روادار ہے، وہ معانی کے ساتھ اس کے تعبیری الفاظ بھی خود عطا کرتا ہے ـــ بہرحال اس تعبیر سے ان بزرگوں کا موہوم فائدہ تو حاصل نہ ہو سکا مگر اس کے دو عظیم نقصان ابھر کر سامنے آئے۔

اول یہ کہ بعض مریض ذہن کے لوگوں کے لئے خالص "اسلام" کے لفظ میں کوئی کشش نہیں رہی جب تک کہ اس کے ساتھ اشتراکیت کا پیوند نہ لگا دیا جائے، گویا ـــ معاذ اللہ ـــ مرکز جاذبیت اسلام نہیں، اشتراکیت ہے، یہ تقریباً وہی کیفیت ہے جو قرآن کریم نے منکرین آخرت کی بیان فرمائی:

"وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ." (الزمر:۴۵)

ترجمہ:...."اور جب نام لیجئے خالص اللہ کا تو رک جاتے ہیں دل ان کے جو یقین نہیں رکھتے "پچھلے گھر" کا، اور

جب نام لیجئے اس کے سوا اوروں کا تب وہ لگیں خوشیاں کرنے۔" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

دوسرا بڑا نقصان یہ ہوا کہ جب یہ اصطلاح چل نکلی تو اہل زیغ کو موقع ہاتھ آ گیا کہ "اسلامی اشتراکیت" کے سہارے جو نظریات چاہیں پھیلائیں، وہ اصل مفہوم، جس کے لئے ان مرحوم بزرگوں نے یہ اصطلاح استعمال کی تھی، بہت جلد طاق نسیان کی زینت بنا دیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مختلف نوع کی کئی "اسلامی اشتراکیتیں" وجود میں آ گئیں، آج مشکل ہی سے کوئی فرد یا گروہ ایسا ملے گا جو "اسلامی اشتراکیت" سے اسلام کا نظام عدل و معیشت مراد لیتا ہو، اس دعویٰ کی دلیل کے لئے کسی کتابی استدلال کی ضرورت نہیں، نہ کہیں باہر جانے کی حاجت ہے۔

خود اپنے ملک میں جو لوگ اسلام کے بجائے ـــ یا صحیح لفظوں میں اسلام کے مقابلے ـــ "اسلامی اشتراکیت" کا پرچار کرتے ہیں ان کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو ان کی مختلف قسمیں نظر آئیں گی، بعض لوگ اسے صرف اسلام کے قصر بلند کو تہ و بالا کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں، اور اسلامی اشتراکیت اور قرآنی نظام ربوبیت کے پردے میں صریح الحاد و زندقہ اور مارکسی دہریت کی تبلیغ کرتے ہیں، ہمیں ذاتی طور پر ایسے لوگوں کا علم ہے، جو "خلوت خاص" میں قرآن و اسلام کو دشنام طرازی کا نشانہ بناتے ہیں، شعائر اسلام کا تمسخر اڑاتے ہیں، لیکن اسٹیج پر اسلامی اشتراکیت اور خلافت راشدہ کا نعرہ لگاتے لگاتے ان کے لب خشک ہو جاتے ہیں۔

بعض حضرات اسلامی اشتراکیت کو فلاحی مملکت کے معنی میں استعمال کرنا چاہتے ہیں، اگرچہ وہ یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ اس "فلاحی مملکت" کا نقشہ کیا ہوگا، لیکن ان کی زبان و بیان، ان کی سیرت و کردار اور ان کے اخلاق و اعمال سے اتنی

بات بالکل عیاں ہے کہ وہ فلاحی مملکت کا سارا خاکہ اپنے ذہن شریف سے برآمد یا کہیں باہر سے درآمد کریں گے، اسلام کو نہ وہ جانتے ہیں، نہ اس سے ''فلاحی مملکت'' کے قیام میں کوئی مدد لینے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، اسلامی اشتراکیت کے ناطے میں وہ اسلام پر اتنا رحم ضرور کرسکیں گے کہ اسے کار مملکت سے باہر آزادی سے گھومنے پھرنے کی اجازت دیں، یا اس پر مشق اجتہاد فرما کر اس کی چولیں سیدھی کریں گے اور اسے خود ساختہ فلاحی مملکت کا پاسبان بنائیں گے۔

بعض حضرات نیک نیتی، لیکن غلط فہمی، سے یہ سمجھتے ہیں کہ مارکس کا اشتراکی نظریہ ___ جس کا عملی تجربہ اپنی بگڑی ہوئی شکل میں روس، چین اور دوسرے اشتراکی ممالک میں ہو چکا ہے ___ تقسیم دولت کی حد تک تو بہت خوب ہے کہ اس نے سرمایہ دار کے قارونی عفریت کو کچل کر رکھ دیا ہے، اور سرمایہ داری اور اکتناز دولت کے بت کو پاش پاش کر ڈالا ہے، لیکن اس میں صرف اتنا نقص ہے کہ اس کی بنا ''مادی جدلیت'' پر رکھی گئی ہے، اور روحانی اقدار، مذہبی جذبات اور تصور خدا کی نفی کر دی گئی ہے، اب اگر اشتراکیت کے اقتصادی نظام اور اسلام کے روحانی نظام کو ملا کر جمع کر دیا جائے تو دونوں کی باہم یکجائی سے ایک ایسی ''اسلامی اشتراکیت'' وجود میں آئے گی جو روسی اور چینی اشتراکیت کے تمام فوائد کی جامع ہوگی، لیکن لادین اشتراکیت کی حماقتوں سے مبرا ہوگی، ''اسلامی اشترکیت'' کا یہ تصور بظاہر بڑا سہانا اور نہایت دلکش ہے ___ شروع شروع میں اقبال مرحوم بھی اس کے فریب نظر کا شکار ہو گئے تھے ___ لیکن یہ اندر سے کتنا بھیانک ہے؟ اس کا اندازہ ذیل کے اشارات سے کیجئے (تفصیل کے لئے ایک مستقل مقالہ درکار ہے۔)

اولاً:...... اس نظریہ نے پہلے قدم پر یہ تسلیم کرلیا کہ اسلام کے پاس (خاکم

بدہن) کوئی اقتصادی نظام نہیں، اور وہ اپنی اس کمی کو پورا کرنے کے لئے مارکسیت کا دست نگر ہے (اس سے قطع نظر کہ اسلام کے بارے میں ایسا عقیدہ رکھنے سے آدمی دائرہ اسلام میں بھی رہتا ہے یا نہیں؟) کیا کوئی مسلمان اس کے لئے تیار ہوگا؟ کیا ایسا ملعون نظریہ جو اسلام کے ناقص تصور پر مبنی ہو کسی کے لئے لائق پذیرائی ہوسکتا ہے؟ کلا و رب الکعبۃ۔

ثانیاً:...... اسلام کی پہلی بسم اللہ توحید و رسالت، اور عقیدہ آخرت سے ہوتی ہے، اس کے ایک ایک مسئلہ میں ان ہی عقائد کی روح کارفرما ہے، برعکس اس کے اشتراکیت کی ''لال کتاب'' کا آغاز خدا، اور مذہب کی نفی و استہزاً سے ہوتا ہے، اور اس کے رگ و ریشے میں یہ جراثیم پھیلے ہوئے ہیں، اب جن دو نظاموں کی لائنیں نقطۂ آغاز ہی سے ایک دوسرے کی مخالف سمت چلتی ہوں، کیا کسی مرحلہ پر ان کا اجتماع یا ان کی مصالحت ممکن ہے؟ اسلام دین خداوندی ہے اور اشتراکیت دین مارکس ___ کیا ان دونوں کو صلح و اتحاد پر آمادہ کیا جاسکتا ہے؟

ثالثاً:...... اشتراکیت کی ترکیب، مادیت و جدلیت، جھوٹ و منافقت، جبر و استبداد اور فتنہ و فساد کے عناصر اربعہ سے ہوئی ہے، چنانچہ دوسرے اشتراکی یا نیم اشتراکی ممالک میں جو کچھ ہوا اس کو تو جانے دیجئے خود ہمارے ملک میں اشتراکی عناصر کے ''کارنامے'' اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں، کیا اسلام کے ساتھ اشتراکیت کا جوڑ لگانے کے لئے ہم اشتراکیت کے ان عناصر اربعہ کی قیمت ___ جو عموماً لاکھوں بے گناہ انسانوں کا خون، اور ہزاروں عصمتوں کی قربانی ہوتا ہے ___ دینے کے لئے تیار ہوں گے؟ اور کیا اسلام، اشتراکیت کی ان درندگیوں کو برداشت کرتا جائے گا؟

رابعاً:...... اشتراکیت کی تاریخ یہ ہے کہ اسے جن ممالک میں تسلط نصیب ہوا

وہاں دین اور اہل دین کو ''رجعت پسند'' اور سرمایہ داروں کے محافظ کہہ کر کچل دیا گیا، اشتراکیت کو اسلام کے حبالۂ عقد میں لانے سے پہلے ہم یہ اطمینان کیسے کرلیں کہ یہ ناگن اسلام کے گھر (دارالاسلام) آتے ہی اپنی خوبو چھوڑ بیٹھے گی، اور اپنی فطرت کے خلاف وہ یہاں کے لوگوں سے رحمت و شفقت کرے گی؟ اشتراکیت نے کبھی اپنے سپوتوں کو بھی نہیں بخشا، وہ دوسروں سے کیوں کر رعایت کرے گی؟

خامساً:...... اشتراکیت کا سب سے زیادہ خوش آئند پہلو ''اقتصادی مساوات'' کو قرار دیا جاتا ہے، جس کی بنیاد انفرادی ملکیت کی نفی پر ہے (یعنی ملک کی کسی چیز پر فرد کا کوئی حق نہیں، وہ صرف حکومت کی ملکیت ہے)۔

جب کسی ملک میں اقتصادی عدم توازن پایا جائے کہ بعض افراد لاکھوں کے مالک ہوں، اور بعض ضروریات زندگی سے محروم ــ تو اس کی اصلاح کی ایک صورت تو یہ ہے کہ امراً کو ــ قانوناً یا اخلاقاً ــ حکم دیا جائے کہ وہ اپنے بال بچوں کی طرح غرباً کی کفالت کریں، اور اپنی فاضل دولت اپنے پسماندہ بھائیوں پر تقسیم کردیں، یہاں تک کہ معاشرہ کے کسی فرد کو یہ شکایت نہ رہے کہ اسے زندگی کے حوائج ضروریہ میسر نہیں، نہ کسی غریب کو کسی امیر سے گلہ شکوہ کی گنجائش رہے، یہ تو ہے اخوت و مؤاسات کا وہ نمونہ جو آنحضرت ﷺ کے فیض صحبت اور آپ ﷺ کی تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں حضرات مہاجرینؓ و انصارؓ نے قائم کرکے دکھایا، انصارؓ نے مہاجرینؓ کی خدمت میں اپنی تمام املاک کا نصف پیش کردیا، بلکہ اگر کسی کے یہاں دو بیویاں تھیں تو ایک کو طلاق دے کر مہاجر بھائی کے حوالہ کرنے پر تیار ہوگیا، انسانیت کی پوری تاریخ اس اخوت و مؤاسات کا نمونہ پیش کرنے سے عاجز ہے، اور اگر آج صحیح اسلام کو نافذ کردیا جائے تو دس بیس سال یا اس سے بھی کم عرصہ میں ان برکات کا مشاہدہ کیا

جاسکتا ہے، اور اس اقتصادی تفاوت کو مٹانے کی دوسری صورت یہ ہے کہ آپ دونوں کے تمام املاک ضبط کرکے حکومت کے حوالے کردیں، جس کے نتیجہ میں پوری سوسائٹی فقیر و قلاش بن کر چند کامریڈوں اور افسر شاہی کے رحم و کرم پر رہ جائے، جو کہ موٹی موٹی تنخواہیں لیتے ہیں، یہ ہے اشتراکی مساوات، جس میں ملک کی ساری دولت پر مطلق العنان آمریت کا قبضہ ہوتا ہے اور پوری قوم نہایت حقیر معاوضہ پر ان کی نوکر۔

اسلام، اخوت و مؤاسات اور اجتماعی عدل کی بنیاد پر ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے، جس میں کوئی غریب نہ رہے، اور اگر کوئی نادار شخص رات فاقہ سے گزار دے تو پوری قوم کو اس کا مجرم قرار دیا جائے۔ برعکس اس کے اشتراکیت ایسا معاشرہ وجود میں لاتی ہے جسے فقر وفاقہ میں ''مساوات'' کا درجہ حاصل ہو، گویا اشتراکیت کا دعویٰ مساوات صحیح ہے، مگر مالداری میں نہیں بلکہ غربت و افلاس اور فقر وفاقہ اور جبریت و مظلومیت میں۔

یہاں ہمیں اس سے بحث نہیں کہ آیا یہ معاشی مسئلہ کا صحیح حل ہے یا نہیں، یہاں ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ جب ملک کی ایک ایک پائی سے افراد کی ملکیت سلب کرلی جائے، تو کیا اسلام اپنے وہ ہزاروں احکام واپس لے لے گا جن کا تعلق زکوٰۃ، حج، قربانی، انفاق، بیع، شرا، صدقہ، ہبہ، وصیت، وراثت وغیرہ کے ابواب سے ہے؟ ''اسلامی اشتراکیت'' کی فرماں روائی میں یہ ابواب اسلامی احکام کے تحت آئیں گے یا اشتراکیت کی قربان گاہ پر ذبح ہوں گے؟

سادساً:...... اشتراکیت کو مجرد ''اقتصادی نظام'' سمجھنا بھی خود فریبی ہے، اشتراکیت پہلے قدم پر اپنے ساتھ ایک ''جابرانہ سیاسی نظام'' لے کر چلتی ہے، جس میں فرد کی عزت نفس، اس کے جذبات و عواطف، اس کی فطری و ذہنی، روحانی و مذہبی

خواہشات کو کچل کر اسے حیوان سے بدتر درجہ دیا جاتا ہے کیا اسلام، اشرف المخلوقات کی اس تذلیل سے اتفاق کرلے گا؟ اور سچ تو یہ ہے کہ ''اشتراکیت'' کو اقتصادی نظام کہنا غلط ہے وہ خالص ایک سیاسی نظام ہے مگر ایسا جابرانہ اور ظالمانہ کہ اس کے سامنے قدیم مصر کا فرعون بھی شرمندہ ہے، جہاں تک اقتصادی خوشحالی کا تعلق ہے، اشتراکی ممالک میں مزدور، کسان اور غریب طبقہ کی حالت سرمایہ دار ممالک سے بھی بدتر اور گھناؤنی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جو حضرات اسلام اور اشتراکیت کے مصنوعی ملغوبہ کو ''اسلامی اشتراکیت'' کا نام دیتے ہیں، خواہ وہ اپنی جگہ کتنے ہی نیک نیت اور مخلص ہوں ان کا موقف کسی حقیقت پسندی پر مبنی نہیں، اور نہ وہ اسلام اور اشتراکیت کے مزاج سے واقف ہیں۔

بعض حضرات ''اسلامی اشتراکیت'' کو محض سیاسی زینہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں، وہ خود چونکہ اچھے خاصے ''سرمایہ دار'' ہیں اس لئے محنت کش طبقہ کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے یہ نعرہ لگاتے ہیں، ان حضرات کو اپنی سیاست سے آگے، نہ اسلام سے دلچسپی ہے نہ اشتراکیت سے، بلکہ صرف اپنی آمریت سے۔

بعض حضرات ''اسلامی اشتراکیت'' کی حمایت اس لئے کرتے ہیں کہ ہمارے ملک کے پسماندہ طبقہ کو جو سرمایہ داروں کے ظلم وستم سے مفلوج ہوکر رہ گیا ہے کسی طرح سرمایہ داری کے چنگل سے نجات دلادی جائے، اور سفید سامراج کی پیدا کردہ معاشی ناہمواریوں کو ختم کردیا جائے تو اسلام کے عدل اجتماعی کے لئے زمین تیار ہوسکتی ہے، گویا ان کے نزدیک اسلامی اشتراکیت یا اسلامی سوشلزم کا مفہوم یہ ہے کہ: ''اشتراکیت کا وہ راستہ جو اسلام تک پہنچادے۔'' لیکن یہ ان حضرات کا خیال ہی

خیال ہے، عالم وجود میں اشتراکیت کی کوئی ایسی قسم اب تک دریافت نہیں ہوسکی، نہ آئندہ ایسے انکشاف کی توقع ہے جو سیدھی اسلام پر جاکر رکتی ہو، ہمیں یقین ہے کہ یہ حضرات اسی راہ پر گامزن رہے تو کچھ مدت بعد ان کے سامنے کعبہ کے بجائے ترکستان ہوگا۔ ولا فعل اللہ ذالک۔

اس کے بالکل برعکس بعض لوگ ''اسلامی اشتراکیت'' کا نام اس لئے لیتے ہیں کہ اس کے ذریعہ مارکسی اشتراکیت کے لئے راستہ ہموار کیا جائے، انہیں معلوم ہے کہ ہمارے ملک کا ذہن خالص مذہبی ہے، یہاں کے عوام عملی کوتاہی کے باوجود اسلام پر غیر متزلزل ایمان ویقین رکھتے ہیں، اسلام اور شعائر اسلام کی محبت ان کے دل کی گہرائیوں میں اسقدر راسخ ہے کہ وہ ہر چیز برداشت کرسکتے ہیں لیکن یہ بات ان کے لئے ناقابل برداشت ہے کہ انہیں دین سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی جائے، یہاں کسی گمراہ کو کھل کر اپنے نظریات اگلنے کی ہمت نہیں ہوتی، بلکہ اسے ''اسلامیت'' کا لبادہ اوڑھ کر اور قرآن وحدیث کے غلط سلط حوالے دے کر دام ہمرنگ زمین پھیلانا ہوتا ہے، اشتراکیت پسند، یہاں کے عوامی مزاج سے خوب واقف ہیں، اس لئے وہ ہمارے ملک کی فضا میں ''اسلامی اشتراکیت'' ہی کو غنیمت سمجھتے ہیں، تاکہ عوام کو یہ سمجھایا جاسکے کہ اسلام اور اشتراکیت کے درمیان کوئی تصادم نہیں، ان لوگوں کے یہاں ''اسلامی اشتراکیت'' کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ: ''ایسی اشتراکیت جس کے لئے اسلام کو زینہ بنایا جاسکے۔'' یہ اسلام کی ایسی تعبیر وتشریح کرنا چاہتے ہیں جو مارکسی اشتراکیت پر ٹھیک ٹھیک منطبق ہو۔

اور واقعتاً ہمارے یہاں ایسے حضرات بھی موجود ہیں، جو ''اسلامی اشتراکیت'' کے حسین نعروں سے متاثر ہوکر ''اسلامی سوشلزم'' پر ایمان بالغیب رکھتے

ہیں، انہیں کچھ خبر نہیں، نہ اس کی ضرورت انہوں نے محسوس کی ہے، کہ اسلامی اشتراکیت دراصل کیا ہے؟ اس کے نتائج وعواقب کہاں تک جائیں گے، کسی "بڑے لیڈر" کی زبان فیض ترجمان سے انہوں نے یہ سن لیا کہ "اسلامی اشترکیت ہی ہماری تمام معاشی الجھنوں کا واحد حل ہے ہم اسلامی سوشلزم کے ذریعہ یہاں خلافت راشدہ کا نمونہ قائم کریں گے۔" بس یہ سنتے ہی انہوں نے آمنا و صدقنا پڑھ کر "اسلامی اشتراکیت" کا وظیفہ شروع کردیا اور اس کے لئے قرآن و حدیث اور اسلاف کے حوالے پیش کئے جانے لگے، فاضل مقدمہ نگار کے علم وفضل کے پیش نظر یہ خیال کرنا بے ادبی ہے کہ ان کا تعلق بھی شاید اس گروہ سے ہوسکتا ہے۔

اسلامی اشتراکیت کی ان مختلف اور متضاد قسموں میں سے فاضل مقدمہ نگار کی پسندیدہ "اسلامی اشتراکیت" کون سی ہے اس کا تعین بڑا مشکل ہے، تاہم ان کے دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ مکمل اشتراکیت کو جائز رکھتے ہیں اور اس اشتراکیت کو جب مسلمان اور اسلامی حکمران اختیار کریں گے تو وہ آپ سے آپ اسلامی اشتراکیت بن جائے گی (ذہن میں بھی رہنا چاہئے کہ محترم مقدمہ نگار کا تعلق لاہور کے محکمہ "نظام ربوبیت" سے رہ چکا ہے، اور وہاں سے سیدھے ادارہ تحقیقات اسلامی پہنچے ہیں۔ناقل) اب آیئے انکی اشتراکیت اور اس کے دلائل پر غور کریں۔

فاضل مقدمہ نگار جناب سورتی صاحب نے "اسلامی اشتراکیت" کی دلیل یہ پیش کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق و شام اور مصر کی مفتوحہ اراضی کو "فئ" قرار دیا تھا اس واقعہ کی تفصیل خود موصوف کے قلم سے یہ ہے:

"عراق وشام ومصر کی مفتوحہ اراضی کو جب حضرت عمرؓ نے فاتح مجاہدوں کے مطالبہ پر غنیمت کی طرح بانٹنے سے انکار

کردیا، اور کہا کہ یہ تمام اراضی اور ان پر کام کرنے والے غیر عرب مسلمانوں کی فئ ہیں، اور ہوسکتا ہے کہ آئندہ ایسے زرخیز علاقے مسلمانوں کو حاصل نہ ہوسکیں، اگر ہم انہیں بانٹ دیں گے تو اسلامی مملکت کے دفاع اور عام مسلمانوں کی حالت سدھارنے کے لئے جن مجاہدین کے اہل وعیال اور بیوائیں شامل ہیں کس مد سے انتظام ہوگا؟ یہ تقسیم کی تجویز تو غیر معقول ہے، بعد ازاں حضرت عمرؓ نے مہاجرین اولینؓ سے مشورہ کیا، ان میں اختلاف تھا، حضرت عبدالرحمن ابن عوفؓ تقسیم کے قائل تھے، اور حضرت عثمان وعلی وطلحہ وابن عمر رضوان اللہ علیہم اجمعین حضرت عمرؓ کے ہم خیال تھے، بعد ازاں انہوں نے دس کبار انصار کو بلوایا جن میں سے پانچ اوس قبیلہ کے اور پانچ خزرج کے تھے، جب وہ جمع ہوگئے تو حضرت عمرؓ نے اللہ کی حمد وثنا کے بعد ان سے یوں خطاب کیا:

"میں نے آپ لوگوں کو یہاں آنے کی زحمت اس لئے دی ہے کہ مجھ پر آپ لوگوں کے انتظام کا جو بار امانت ہے اس کے اٹھانے میں میری مدد کریں جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں آپ میں سے ایک ہوں اور آپ ہی لوگوں کو آج حق کا فیصلہ کرنا ہے میری تجویز کے مخالفین اور موافقین کا آپ کو علم ہے میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ لوگ اس معاملہ میں میری خواہش کی تائید کریں، آپ کے پاس اللہ کی کتاب ہے جو ناطق بالحق ہے،

اللہ کی قسم اگر میں نے کوئی بات کہی ہے تو اس سے میری غرض صرف حق ہے۔" حاضرین نے کہا "یا امیرالمومنین اپنا مؤقف پیش فرمایئے ہم سنیں گے۔" چنانچہ حضرت عمرؓ نے فرمایا "آپ لوگ ان لوگوں کی بات سن چکے ہیں جن کا خیال ہے کہ میں ان کے حقوق چھین کر ان پر ظلم کر رہا ہوں معاذ اللہ کہ میں ظلم کروں، اگر میں ان سے کوئی ایسی چیز، جو ان کی ہے، چھین کر دوسروں کو دے رہا ہوں تو میری بدبختی میں کیا شبہ ہوسکتا ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ مملکت کسریٰ کو فتح کرنے کے بعد اب کچھ باقی نہیں رہا، اللہ نے ہمیں ان کے اموال و اراضی اور کاشتکار بطور غنیمت عطا فرمادیئے، میں نے اموال تو غنیمت کی طرح ان میں تقسیم کردیئے لیکن اراضی کے متعلق میرا خیال ہے کہ انہیں ان پر کام کرنے والے غیر عرب کاشتکاروں کے ساتھ روک رکھوں، ان پر فی کس جزیہ مقرر کردوں جو مسلمانوں کے لئے "فئے" بن جائے، یعنی مسلمان فوجیوں اور اہل و عیال اور بعد میں نئے آنے والے تمام مسلمان سب اس میں شریک رہیں، آپ کو معلوم ہے کہ سرحدوں کی حفاظت کے لئے وہاں فوج رہنا ضروری ہے، پھر یہ شام، جزیرہ اور کوفہ، بصرہ و مصر جیسے وسیع و عریض علاقے متقاضی ہیں کہ ان میں فوج رکھی جائے، اور اسے تنخواہیں دی جائیں، آخر انتظامات کے لئے رقم کہاں سے آئے گی؟ جبکہ ہم ان اراضی اور ان کے کاشتکاروں کو تقسیم کرچکیں

گے؟ سب نے بیک آواز کہا واقعۃً آپ کی تجویز بالکل درست ہے، آپ کا خیال اور آپ کی بات بہت عمدہ ہے، اگر سرحدوں اور بڑے شہروں میں فوج کا انتظام نہ رکھا گیا اور انہیں اخراجات نہ ملتے رہے تو کفار پھر اپنے علاقوں کو واپس لے لیں گے۔"

"سوادِ عراق فتح ہونے پر حضرت عمرؓ نے لوگوں سے مشورہ کیا تو اکثریت اس کے (غنیمت کی طرح) تقسیم کرنے کے حق میں تھی، بلال ابن ابی رباح اس مطالبے میں سب سے زیادہ آگے بڑھے ہوئے تھے، حضرت عمرؓ اسے باقی رکھنے اور تقسیم نہ کرنے کے حق میں تھے چنانچہ انہوں نے دعا کی "اے اللہ بلال اور ان کے ساتھیوں کے مقابلہ میں میری مدد فرما" اسی شش و پنج میں دو تین دن گزر گئے پھر حضرت عمرؓ نے کہا "میں نے اپنی تجویز کی تائید میں قرآن مجید سے حجت پالی ہے دیکھو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے: (اس موقعہ پر آپؓ نے سورۃ الحشر کی پانچ آیات (۶۔۱۰) تلاوت فرمائیں، اور آخری آیت "وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ." کے بارے میں فرمایا:)

"اس طرح یہ آیت ان تمام لوگوں کو اپنے اندر شامل کرلیتی ہے جو ان کے بعد آئیں گے، چنانچہ یہ فئے ان تمام مذکورہ حقداروں کی ہوگی، ہم کیونکر اسے (حاضر) لوگوں میں تقسیم کرسکتے ہیں، اور ہمیں کیا حق ہے کہ ہم ان کے بعد آنے والوں کو تقسیم سے محروم کرجائیں، چنانچہ انہوں نے اسے وقف کرنے

کا عہد کرلیا اور اس کا خراج اکٹھا کیا۔"

(مقدمہ کتاب الاموال جلد اول ص ۸۰ تا ۸۴)

مناسب ہوگا کہ فاضل محترم اس واقعہ سے "اسلامی اشتراکیت" کا استخراج کرنے سے پہلے مندرجہ ذیل نکات پر غور فرمائیں۔

اول:...... حربی کافروں کا جو مال مسلمان فاتحین کے ہاتھ آتا ہے قرآن حکیم میں اسکی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں، غنیمت اور فئ۔ غنیمت کا حکم یہ بتایا گیا ہے کہ خمس (1/5) نکالنے کے بعد اسے فاتحین پر تقسیم کیا جائے گا جب کہ "فئ" کے مستحق صرف فاتحین کو نہیں بلکہ تمام ضرورت مند مسلمانوں کو قرار دیا گیا ہے، خواہ انہوں نے جہاد میں حصہ لیا ہو یا نہ لیا ہو۔ کفار کی مفتوحہ اراضی پر قانون غنیمت کا اطلاق ہوگا یا قانون فئ کا؟ یہ تھا وہ سوال جو عراق وشام اور مصر کی فتح کے موقع پر پیش آیا، حضرت بلالؓ اور ان کے رفقاء کا کہنا یہ تھا کہ دوسرے اموال کی طرح مفتوحہ اراضی بھی قانون غنیمت کے تحت آتی ہیں، کیونکہ انہیں بزور شمشیر فتح کیا گیا ہے، اس لئے انہیں اصرار تھا کہ یہ اراضی صرف فاتحین کا حق ہے، اور ان پر ان کو تقسیم کیا جانا چاہیے، اس کے برعکس حضرت عمرؓ کا موقف یہ تھا کہ "قانون غنیمت" کا اطلاق صرف اموال منقولہ تک محدود ہے، غیر مسلموں کی مفتوحہ اراضی اور غیر منقولہ جائداد قانون غنیمت کے تحت نہیں بلکہ "قانون فئ" کے تحت آتی ہے اور وہ صرف فاتحین کا حق نہیں بلکہ تمام مسلمان اس پر مساوی حق رکھتے ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ اسے فاتحین پر تقسیم کرکے باقی تمام مسلمانوں کو اس سے محروم کردیا جائے...... اس اختلاف کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جب عدالت میں کوئی پیچیدہ کیس پیش ہوتا ہے، تو قانون دانوں کے درمیان یہ اختلاف پیدا ہوجاتا ہے کہ اس پر کونسی دفعہ کا اطلاق ہونا چاہیے؟...... حضرت عمرؓ

باوجودیکہ خلیفہ راشد تھے، امت کے سب سے بڑے فقیہ اور اپنے علم وفضل اور فقہ واجتہاد کے اعتبار سے سب پر فائق تھے، حضرت بلالؓ اور ان کے رفقاء کے مقابلہ میں ہی نہیں بلکہ پوری امت کے مقابلہ میں آپ کی فقاہت کا پلہ بھاری تھا، لیکن انہوں نے اپنے اجتہاد کو زبردستی نہیں ٹھونسا بلکہ فقہاء صحابہ کی ایک جماعت کے سامنے اس کیس کو رکھا اور ان سے فیصلہ طلب کیا، اپنے دلائل پیش کئے اور مخالف نقطہ نظر کے استدلال کا جواب دیا، ایک دو کو چھوڑ کر باقی تمام فقہاء صحابہؓ نے ان کے موقف کی تصویب کی اور فیصلہ ان کے حق میں دیا، اور اس کے باوجود بھی جب دوسرے بزرگوں کی تشفی نہیں ہوئی تو دعا کی "اے اللہ! بلالؓ اور ان کے ساتھیوں کے مقابلہ میں میری مدد فرما۔"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے کسی کا حق چھین کر اسے "قومی ملکیت" نہیں بنایا، بلکہ ان کا موقف یہ تھا کہ یہ اراضی غنیمت نہیں بلکہ "فئ" ہیں، قانون فئ کے مطابق ان سے کسی فرد یا گروہ کا حق متعلق ہی نہیں ہوا کہ اسے سلب کیا جائے، بلکہ شروع ہی سے ان کی حیثیت اموال عامہ کی ہے، اب اس سے استدلال تو بجا ہے کہ جن اموال کی حیثیت اموال عامہ کی ہو اور جو کسی خاص فرد کی ملک میں نہ ہوں، سربراہ مملکت کو حق حاصل ہے کہ انہیں افراد پر تقسیم نہ کرے بلکہ انہیں مصالح مسلمین کے لئے وقف رکھے۔

اگر فاضل مصنف اسی کو اسلامی اشتراکیت، سے تعبیر فرماتے ہیں تو انہیں اطمینان رہنا چاہیے کہ تمام اسلامی وغیر اسلامی اور اشتراکی وغیر اشتراکی معاشروں میں اس پر عمل ہے، "من اقدم العصور الی یومنا ھذا"

مگر علم وعقل سے بڑی بے انصافی ہوگی اگر ہم اس سے یہ ثابت کرنے بیٹھ

جائیں کہ لوگوں کی املاک چھین چھین کر ''قومی ملکیت'' کا ڈھونگ رچانا عین منشأ اسلام ہے اور حکام کو اس کی کھلی چھٹی ہے کہ وہ جب چاہیں بحق سرکار لوگوں کے املاک ضبط کرسکتے ہیں، جیسا کہ فاضل مقدمہ نگار فرماتے ہیں:

> ''اس زمانے میں زمین ہی سب سے بڑا ذریعہ آمدنی تھا، آج اگر اس پر قیاس کرتے ہوئے دیگر اہم اور بنیادی ذرائع آمدنی، جن پر افراد کا قبضہ ہے، عامۃ المسلمین کی فلاح و بہبود اور عمومی مصلحت کی بنا پر حکومت کی نگرانی میں لے لئے جائیں تو یقیناً یہ عمل قرآن مجید اور حضرت عمرؓ کے قرآنی استنباط کا مظہر ہوگا'' (مقدمہ کتاب الاموال جلد اول ص:۸۴)

ماشاءاللہ! چشم بد دور! کیا خوب اجتہاد ہے، جس ''نظیر'' پر قیاس کیا جاتا ہے اس کا تعلق تو ان اموال عامہ سے ہے جو کسی ''فرد'' کی ملک نہ تھے، نہ ان پر کسی کا قبضہ تھا، نہ ان سے کسی خاص فرد کا حق متعلق تھا، اور اس پر قیاس کیا جاتا ہے ان اموال کو جنہیں لوگوں کی ذاتی اور نجی ملکیت سے چھین چھین کر ''افسر شاہی'' کے حوالے کیا جائے گا، اس نوعیت کے ''اجتہاد'' کے لئے نہ علم اصول کی پابندی کی ضرورت ہے، نہ مقیس اور مقیس علیہ کے درمیان کسی علت جامعہ اور قدر مشترک کی حاجت، نہ تنقیح مناط اور تحقیق مناط تلاش کرنے کی فکر، نہ قیاس مع الفارق سے احتراز کا خیال:

''بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است''

اور یہ ''عامۃ المسلمین کی فلاح و بہبود'' اور ''عمومی مصلحت'' کی بھی خوب کہی، فاضل محترم کو شاید معلوم نہیں کہ اسلام میں ''مصلحت عامہ'' اور ''ملکیت فرد'' دونوں کا دائرہ الگ الگ کیا گیا ہے اور دونوں کے حدود متعین کردئے گئے، جس طرح

''فرد'' کو یہ اجازت نہیں کہ مصلحت عامہ کو پامال کرے، اسی طرح مصلحت عامہ کے نگرانوں (حکام) کو بھی یہ اجازت نہیں کہ مصلحت عامہ کے نام پر افراد کے جان و مال پر ہاتھ صاف کرنے اور ''مسلمانوں کی فلاح و بہبود'' کے ہتھیار سے مسلمانوں کو ہی ذبح کرنے لگیں، موصوف خود اپنے قلم سے حضرت عمرؓ کا یہ فقرہ نقل کرتے ہیں (اوپر کی عبارت میں خط کشیدہ سطریں ملاحظہ ہوں):

> ''آپ لوگ ان لوگوں کی بات سن چکے ہیں، جن کا خیال ہے کہ ان کے حقوق چھین کر ان پر ظلم کر رہا ہوں، معاذ اللہ کہ میں ظلم کروں، اگر میں ان سے کوئی ایسی چیز، جو ان کی ہے، چھین کر دوسروں کو دے رہا ہوں تو میری بدبختی میں کیا شبہ ہوسکتا ہے؟''

لیکن موصوف کی قوت یادداشت، سرعت فہم اور بالغ نظری قابل داد ہے کہ جس چیز کو حضرت عمرؓ بدترین ظلم کہتے ہیں، جسے حکام کی سب سے بڑی بدبختی بتاتے ہیں اور جس سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں فاضل محترم کے تحقیقی اجتہاد سے چند سطر بعد ٹھیک وہی عمل قرآن مجید اور حضرت عمرؓ کے ''قرآنی استنباط کا مظہر'' بن جاتا ہے۔

دوم:...... حضرت عمرؓ کا یہ واقعہ کسی غار سے نکل کر آج پہلی بار یکایک ہمارے سامنے نہیں آگیا، فقہائے امت کے سامنے یہ واقعہ موجود رہا ہے اور وہ اس پر پوری طرح غور و فکر کے بعد اس سے شرعی مسائل کا استنباط کرچکے ہیں، ''اسلامی اشتراکیت'' کی اختراع سے پہلے فاضل محترم کو یہ بھی دیکھنا چاہئے تھا کہ کسی فقیہ و مجتہد نے اس سے یہ نکتہ بھی پیدا کیا کہ محض مصلحت عامہ کے لئے مسلمانوں کی تمام املاک کو بحق سرکار ضبط کیا جاسکتا ہے؟ آیئے اس واقعہ کے بارے میں فقہائے امت کا نقطۂ

نظر معلوم کریں:

عراق و شام اور مصر کی یہ زمینیں، جنہیں حضرت عمرؓ نے اسلامی فوج پر تقسیم کرنے کے بجائے ان کے ذمی کاشتکاروں ہی کو ان پر بحال رکھا تھا، ان کی اصل نوعیت کیا تھی؟ اس سلسلہ میں ہمیں فقہائے امت کے تین مسلک معلوم ہوسکے ہیں،

امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ ان کو قانوناً غانمین پر تقسیم ہونا چاہیے تھا لیکن حضرت عمرؓ نے ان حضرات کو اس بات پر راضی کرلیا تھا کہ یہ زمینیں تقسیم نہ کی جائیں، بلکہ ان کے سابق کاشتکاروں کو ان پر بحال رکھا جائے، امام ابوعبیدؒ نے اسی نقطہ نظر کی سختی سے تردید کی ہے (ترجمہ کتاب الاموال :عبدالرحمٰن سورتی صفحات ۱۸۹ و مابعد) اور جمہور امت نے اسے قبول نہیں کیا بلکہ اسے خلاف ''اجماع'' قرار دیا۔

(فتح القدیر: ابن ہمامؒ طبع ۱۹۱۶ء مصر)

امام ابو حنیفہؒ ان اراضی کو ''فئی'' قرار دیتے ہیں، جو اپنی اصل وضع کے اعتبار سے اموال عامہ کی حیثیت رکھتی ہیں، البتہ ان کے نزدیک امام (سربراہ مملکت) کو یہ حق حاصل ہے کہ:

الف:...... ان کو اموال عامہ، شاملات اور سرکاری زمینوں کی حیثیت سے مصالح عامہ کے لئے وقف رکھے۔

ب:...... یا مسلم فاتحین پر تقسیم کردے۔

ج:...... یا غیر مسلم ذمیوں کو مالکانہ حقوق دے کر ان پر بحال رکھے۔

(فتح القدیر)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق و شام اور مصر کی مفتوحہ اراضی میں یہی

آخری صورت اختیار فرمائی تھی، ان اراضی پر ان کے پہلے مالکوں کو بحال رکھا، انہیں مالکانہ حقوق دیئے، اور ان پر جو خراج عائد کیا تھا وہ اسلامی حکومت کا مالیانہ تھا جو غیر مسلم اراضی سے وصول کیا جاتا ہے۔

امام مالکؒ ان اراضی میں صرف پہلی اور دوسری صورت کو جائز سمجھتے ہیں (بدایۃ المجتہد: ابن رشد) وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ زمینیں ان کے غیر مسلم مالکوں کے پاس تو رہنے دی تھیں لیکن ان کو مالکانہ حقوق نہیں دیئے تھے، بلکہ یہ زمینیں وقف تھیں جس میں کسی کو حق ملکیت حاصل نہیں ہوتا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان پر جو خراج مقرر کیا تھا وہ زمین کا کرایہ (ٹھیکہ) تھا، اکثر فقہا محدثین کا یہی مسلک ہے اور امام ابوعبیدؒ نے اس کی پرزور حمایت کی ہے۔

(ترجمہ کتاب الاموال ج:۱ ص:۱۹۱)

گویا تمام علمائے امت اور فقہائے ملت اس نکتہ پر متفق ہیں کہ اس واقعہ میں حضرت عمرؓ نے کسی کا حق جبراً چھین کر اسے مصلحت عامہ کے لئے وقف نہیں کیا، لیکن ان سب کے برعکس ترجمہ نگار جناب سورتی صاحب یہ انکشاف فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ اشتراکیت کے سب سے پہلے علمبردار تھے، اور اسی بنا پر انہوں نے لوگوں کے حقوق ان کی طرف لوٹانے کی بجائے انہیں ''قومی ملکیت'' قرار دیا، ہم یہ فیصلہ خود سورتی صاحب کے انصاف پر چھوڑتے ہیں کہ تمام علمائے امت کا موقف حضرت عمرؓ کی شان عدل و عدالت کی صحیح ترجمانی کرتا ہے، یا سورتی صاحب کی ''اسلامی اشتراکیت''؟ ہماری گزارش یہ ہے کہ وہ یہ فیصلہ دیتے ہوئے حضرت عمرؓ کے اس فقرے کو کبھی نہ بھولیں:

''معاذ اللہ کہ میں ظلم کروں، اگر میں ان سے کوئی ایسی

چیز، جو ان کی ہے، چھین کر دوسروں کو دے رہا ہوں تو میری
بدبختی میں کیا شبہ ہوسکتا ہے؟"

مسجد نبوی کی تعمیر و توسیع سے بڑھ کر مسلمانوں کی "مصلحت عامہ" کیا ہوگی، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مسجد نبوی کی توسیع کے لئے حضرت عباسؓ کے مکان کو شامل کرنے کی ضرورت ہوئی، حضرت عمرؓ نے انہیں بڑے سے بڑا معاضہ دینا چاہا مگر وہ کسی قیمت پر راضی نہ ہوئے، آخر مقدمہ حضرت ابی بن کعبؓ کے پاس گیا، انہوں نے فیصلہ کیا کہ "حضرت عمرؓ کو بجز خریدنے کے کوئی حق نہیں۔" اور حضرت عمرؓ نے اس فیصلہ پر سر جھکا دیا، یہ دیکھ کر حضرت عباسؓ نے فرمایا: "اب میں بلا قیمت، عامۂ مسلمین کے لئے دیتا ہوں۔" گویا حضرت عباس کو اس مقدس مقصد کے لئے اپنا مکان وقف کرنے سے گریز نہیں تھا، لیکن وہ یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ اسلام میں کسی خلیفہ اور حاکم کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی فرد کی ملکیت کو جبراً وہ معاوضہ دے کر یا بلا معاوضہ، مصالح عامہ کے لئے وقف کردے، یا اسے اجتماعی ملکیت کی بھینٹ چڑھا دے۔

سوم:...... فاضل محترم نے صرف اتنی بات دیکھ کر کہ حضرت عمرؓ نے عراق و شام اور مصر کی مفتوحہ اراضی کو مسلم فاتحین پر تقسیم کرنے سے انکار کردیا تھا، "اسلامی اشتراکیت" کا نکتہ پیدا کرلیا، مگر یہ نہیں دیکھا کہ پھر ان زمینوں کا کیا کیا؟ انہیں "اجتماعی کھیتوں" کی شکل میں تبدیل کر کے ان کاشتکاروں کو "قومی ملازم" رکھ لیا تھا؟ (واضح رہے کہ اشتراکیت، قومی ملکیت اور اجتماعی تصرف کا یہی تصور پیش کرتی ہے) سب کو معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہوا، بلکہ حضرت عمرؓ نے ان زمینوں کے سابق کاشتکاروں کو مالکانہ یا کم از کم موروثی حقوق دے کر انہیں حکومت کے عمل دخل سے بالکل آزاد کردیا، حکومت کا تعلق بس اتنا تھا کہ خراج کی وہ معمولی مقدار جو ان پر تجویز کی گئی تھی،

اسے وصول کرلیا جاتا، اس کے علاوہ ان سے کوئی مطالبہ نہیں تھا، نہ حکومت ان کے کسی تصرف میں مداخلت کرتی تھی، وہ نسلاً بعد نسل ان زمینوں کے وارث قرار دیئے جاتے تھے، بعض صورتوں میں وہ فروخت کرنا چاہتے تو فروخت تک کرسکتے تھے، البتہ اب خریدار کو اس کا خراج دینا ہوتا تھا، اس لئے مسلمانوں کے لئے ان اراضی کی خریداری کو پسند نہیں کیا جاتا تھا، اس کے علاوہ اس ناپسندیدگی کے دوسرے وجوہ بھی تھے۔

اب فاضل محترم فرمائیں کہ کیا اس کا نام اشتراکیت ہے؟ اور کیا آج کی اصطلاح میں اجتماعی مفاد، قومی ملکیت، اور سوشلزم کا یہی مفہوم لیا جاتا ہے؟

فاضل محترم علم و انصاف سے غور کرتے تو انہیں نظر آتا کہ حضرت عمرؓ نے اپنے اس طرز عمل سے جاگیرداری کے ساتھ ساتھ آج کی نام نہاد اشتراکیت (اسے اسلامی کہہ لیجئے یا غیر اسلامی) کے بت کو بھی پاش پاش کر ڈالا تھا، مثلاً اشتراکی زراعت کا حاصل کیا ہے؟ ملک کی تمام اراضی کو بڑے بڑے "اجتماعی کھیتوں" میں تبدیل کر کے ان کی نگرانی اور انتظام اور انصرام کا کام افسر شاہی کے سپرد کردیا جاتا ہے، وہ کاشتکاروں سے بیل گدھوں کی طرح کام لیتے ہیں، اور روزانہ یا ماہانہ کی (جیسی بھی صورت ہو) کارکردگی کا ایک حقیر معاوضہ انہیں تھمادیا جاتا ہے، ان کا نہ زمین پر کوئی حق، نہ پیداوار میں کوئی دخل، بلکہ ان کی حیثیت مجبور و مقہور کارندوں کی ہوتی ہے، اور "کھیت کا نگراں" کامریڈ، ان میں سے کسی غریب کی شکایت کردے تو اس کی زندگی تباہ ہو کر رہ جاتی ہے اب دیکھئے کہ اسلامی فتوحات سے پہلے ٹھیک یہی حالت عراق و شام اور مصر کے ان کاشتکاروں کی تھی، مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں:

"سب سے بڑا انقلاب جو حضرت عمرؓ نے اس صیغے
میں کیا اور جس کی وجہ سے رعایا کی بہبودی اور خوشحالی دفعتہً

نہایت ترقی کر گئی، یہ تھا کہ زمینداری اور ملکیت زمین کا جو قدیم قانون قائم تھا اور بالکل جابرانہ تھا، مٹادیا، رومیوں نے جب شام اور مصر پر قبضہ کیا تو تمام اراضیات اصلی باشندوں سے چھین کر کچھ افسران فوج اور کچھ اراکین دربار کو دے دیں، کچھ شاہی جاگیریں قرار پائیں، کچھ کلیسا اور چرچ پر وقف کر دی گئیں، اصلی باشندوں کے ہاتھ میں ایک چپہ زمین بھی نہیں رہی، وہ صرف کاشتکاری کا حق رکھتے تھے، اور اگر مالک زمین ان کی کاشتکاری کی زمین کو کسی کے ہاتھ منتقل کرتا تھا تو زمین کے ساتھ کاشتکار بھی منتقل ہو جاتے تھے......"

(الفاروق حصہ دوم ص: ۴۳ مطبوعہ ۱۹۱۴ء دہلی)

گویا آج کے اشتراکی ممالک میں "اجتماعی کھیتوں" کے ذریعہ غریب کاشتکاروں کی جو مٹی پلید کی جارہی ہے کچھ اسی سے ملتی جلتی (یا شاید اس سے بہتر) حالت اس وقت کے شامی اور مصری کاشتکاروں کی تھی، جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے، اسلام کے زیر نگین آجانے کے بعد ان زمینوں کی حیثیت مسلمانوں کی "فئ" اور اموال عامہ کی ہو گئی، حضرت عمرؓ چاہتے تو بڑی آسانی سے اسے "اجتماعی کھیتوں" میں تبدیل کر سکتے تھے، اور ایسا کرنے میں شرعاً و اخلاقاً وہ حق بجانب ہوتے، اور بظاہر یہ صورت مسلمانوں کے "مفاد عامہ" کے حق میں ہوتی، کیونکہ اس صورت میں ان کاشتکاروں کو ان کی کارکردگی کی تنخواہ دینے کے بعد کل کی کل آمدنی بیت المال میں جمع ہوتی، لیکن حضرت عمرؓ نے یہ زمین ذمی رعایا کے سپرد کر کے مسلمانوں کے لئے خراج کی معمولی رقم کو کافی سمجھا، اور اس کی جو برکات ظاہر ہوئیں ان سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف

ہے۔

غالباً فاضل محترم اس سے اتفاق کریں گے کہ اگر اشتراکیت (یا ان کی اسلامی اشتراکیت) اسلام کے عدل و انصاف سے میل کھاتی اور ملت اسلامیہ کے مزاج کو راس آتی تو حضرت عمرؓ ان زمینوں پر غیر مسلم ذمیوں کو مالکانہ حقوق نہ دیتے، آج جس اشتراکیت کے ڈھول پیٹے جارہے ہیں، اور اسے مسلمانوں کو ہضم کرانے کے لئے کبھی اسلامی اشتراکیت اور اسلامی سوشلزم کے نام سے اور کبھی اسلامی مساوات کے عنوان سے پیش کیا جاتا ہے، وہ بندگان حرص و آز کے اپنے ذہنوں کی پیداوار ہے، خدا، رسول اور اسلام کا اس سے کوئی تعلق نہیں، اسلام کیپٹل ازم اور سوشلزم دونوں سے اپنی برأت کا اعلان کرتا ہے۔

حمی کی بحث:

فاضل مترجم جناب سورتی صاحب نے آنحضرت ﷺ کے ارشاد "لا حمی الا للّٰہ و لرسولہ" سے بھی اشتراکیت کا نسخہ کیمیا دریافت کیا ہے، اور اس "دریافت" کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے، کہ موصوف نے پہلے "اقطاع" پر گفتگو کرتے ہوئے یہ تسلیم کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ اور خلفائے راشدینؓ نے بہت سے حضرات کو جاگیریں دی تھیں، علاوہ ازیں یہ اعلان عام تھا:

"من احیی ارضا میتۃ فھی لہ۔" (جو کسی غیر آباد اور غیر مملوکہ زمین کو آباد کرلے وہ اسی کی ملک ہے)۔

اس بحث کے مطالعہ کے بعد ہر قاری اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اسلام میں ہر شخص کو جاگیر رکھنے کی اجازت دی گئی ہے، البتہ اس کے لئے یہ لازم ہوگا کہ وہ ان

قابل استعمال ہو) اور اس سے منع بھی کرسکتا ہے، مگر کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے کی ملک میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرے، اور جب معلوم ہے کہ جنگلات کی خود رو گھاس، پانی اور ایندھن کسی فرد خاص کی ملک نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہے، (حجۃ اللہ البالغۃ ج:۱ ص:۱۰۳) (یہ بات آنحضرت ﷺ کے ایک دوسرے ارشاد میں بیان فرمائی گئی، اس پر بحث آئندہ آرہی ہے) لہٰذا اس کی اجازت یا منع کا حق بھی صرف اسی کو حاصل ہے، یہ اسی کا حق ہے کہ وہ اپنے رسول ﷺ کے ذریعہ کسی مخصوص ایسے علاقہ کو "رکھت" قرار دے اور عام لوگوں کو اس میں تصرف سے منع کردے، اور یہ بھی اسی کا حق ہے کہ کسی ایسے علاقہ سے انتفاع کی اجازت عام انسانوں کو بھی مرحمت فرمائے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے جس خطہ کو "حمی" (رکھت) بنایا ہوا ان کی اجازت کے بغیر اس میں تصرف کا کوئی شخص مجاز نہیں، اور جس علاقہ کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے عام انسانوں کے لئے مباح الاصل قرار دیا ہو، اس کو اپنے لئے رکھت بنانے اور دوسروں کو انتفاع سے محروم کرنے کا بھی کوئی شخص مجاز نہیں۔

حافظ بدرالدین عینیؒ، شیخ ابن بطالؒ سے نقل کرتے ہیں:

"اصل الحمیٰ المنع: یعنی لا مانع لما لا مالک له من الناس من ارض او کلاء الا اللہ و رسوله"

(عمدۃ القاری جز:۱۲ ص:۲۱۳)

ترجمہ:...... "حمی کے اصل معنی منع کرنے اور روکنے کے ہیں، حدیث کا مطلب یہ ہے جو زمین یا گھاس کسی انسان کی ملک نہیں اس سے روکنے کا حق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول

ﷺ کے سوا کسی کو نہیں۔"

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے حدیث کے بہت لطیف معنی بیان فرمائے ہیں، وہ حمی کے بارے میں جاہلیت کی رسم کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"...... پس آنحضرت (ﷺ) منع کرد ازاں، وفرمود: نیست گرد کردن زمین را مگر برائے اسپاں وشتراں کہ جہاد کردہ شود وسواری کردہ شود درراہ خدا برآں، و چرایندہ شود درآں مواشی صدقہ واضافت بخدا و رسول بجہت تشریف است۔"

(اشعۃ اللمعات ج:۳ ص:۲۷)

ترجمہ:...... "چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا: اور ارشاد فرمایا کہ زمین کی رکھت جائز نہیں، مگر ان گھوڑوں کے لئے جن پر اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کیا جائے، اور ایسی زمین جس میں صدقہ کے مویشی چرائے جائیں، خدا و رسول کی طرف اضافت اظہار شرافت کے لئے ہے۔"

حاصل یہ کہ "رکھت" صرف دو چیزوں کے لئے جائز ہے، ان گھوڑوں کے لئے جو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے وقف رہتے ہیں، اور صدقہ کے مواشی کے لئے، اور یہ دونوں چیزیں چونکہ کسی انسان کی ملک نہیں، اس لئے "اللہ کا مال" کہلاتی ہیں، اس لئے "حمی للہ ورسولہ" کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کی زمین کو "اللہ کے مال" کے لئے رکھت بنایا جاسکتا ہے، اور چونکہ یہ رکھت "مال اللہ" کے لئے بحکم خداوندی ہے، اس لئے اظہار شرف کے لئے اس کو للہ ولرسولہ کے عنوان سے تعبیر فرمایا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جہاد کے وقف گھوڑوں اور صدقہ کے مویشیوں

کے لئے جب کچھ علاقہ مخصوص کرلیا تو بعض لوگوں نے اس پر اعتراض کیا، حضرت عمرؓ نے اس کا جواب دیتے ہوئے جو فرمایا تھا: "بلاد الله حميت لمال الله."

(عمدۃ القاری جز:۱۲ ص:۲۱۳)

اللہ کی زمین کو میں نے اللہ کے مال کے لئے رکھت بنالیا ہے۔

اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ جنگلات کی یہ مباح الاصل زمین جس میں کسی انسان کا حق ملک ثابت نہیں ہوا، اصل ملک خداوندی پر ہے، ادھر جہاد کے وقف گھوڑے اور صدقہ کے مویشی بھی کسی انسان کی ملک نہیں بلکہ ملک خداوندی ہیں، اس لئے خدا کی زمین کو خدا کے مال کے لئے مخصوص کرلینا کسی طرح غیر مناسب نہیں۔

امام ابوعبیدؒ فرماتے ہیں: "حمیٰ للہ ورسولہ" کی دو ہی صورتیں ہیں ایک یہ کہ اسے جہاد کے وقف گھوڑوں کے لئے مخصوص رکھا جائے، دوم یہ کہ صدقہ کے مویشیوں کے لئے۔ (کتاب الاموال ص:۲۹۸)

خلفاءؒ کے لئے حمی کا حکم:

اوپر کی بحث کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ رکھت صرف بحکم خداوندی بنائی جاسکتی ہے، صرف اللہ کے مال کے لئے بنائی جاسکتی ہے، اور اس کے اختیارات اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو عطا کئے کہ آپ ﷺ جس علاقہ کو چاہیں اللہ کے مال کے لئے رکھت بنائیں، رہا یہ سوال کہ آپ ﷺ کے نائبین اور خلفاءؒ کے لئے بھی یہ حق بطور نیابت حاصل ہوگا؟ یا یہ صرف آپ ﷺ ہی کے ساتھ خاص تھا؟ اس سلسلہ میں امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے، کہ یہ حق صرف آپ ﷺ ہی کے ساتھ خاص تھا، آپ ﷺ نے جس خطہ کو حمی بنایا بوقت ضرورت اسی کو حمی بنایا جائے، اس کے علاوہ کسی

دوسرے خطہ کو "حمی" بنانا جائز نہیں (کتاب الاموال ص:۳۰۰)، بظاہر یہ مسلک حدیث کے الفاظ سے اقرب ہے۔ (فتح الباری ج:۵ ص:۴۴)

حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا رجحان بھی اسی طرف ہے وہ لکھتے ہیں:

"لماكان الحمى تضييقاً على الناس وظلماً عليهم واضراراً نهي عنه، وانما استثنىٰ الرسول، لانه اعطاه الله الميزان وعصمه من ان يفرط منه ما لا يجوز وقد ذكرنا ان الامور التي مبناها على المظان الغالبة يستثنىٰ منها النبي صلى الله عليه وسلم، وان الامور التي مبناها على تهذيب النفس وما يشبه ذالک فالامر لازم فيها للنبي وغيره سواء." (حجۃ اللہ البالغہ طبع مصر ج:۲ ص:۱۰۴)

ترجمہ:..... "چونکہ حمی بنانے سے لوگوں کو تنگی ہوتی ہے، اور یہ ان پر ظلم، اور اس سے انہیں نقصان پہنچتا ہے اس لئے اس سے ممانعت فرمائی، اور رسول اللہ ﷺ کو اس بنا پر مستثنیٰ کیا گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو میزان (عدل) عطا کی تھی اور اس بات سے معصوم پیدا کیا تھا کہ آپ ﷺ سے کوئی ناروا چیز صادر ہو، ہم اس سے پہلے ذکر کرچکے ہیں کہ جن امور کی بنیاد "امور غالبہ" پر ہو ان سے آنحضرت ﷺ کو مستثنیٰ رکھا جاتا ہے، اور جن امور کا مبنیٰ تہذیب نفس جیسی چیزوں پر ہو، وہ نبی اور غیر نبی دونوں کو یکساں لازم ہیں۔"

لیکن جمہور ائمہ کے نزدیک آنحضرت ﷺ کی نیابت میں خلفاءؒ کو بھی حق حمی حاصل ہے، چنانچہ خلفاءؒ راشدینؓ کے عمل سے ثابت ہے، البتہ اس کے لئے چند شرائط کا ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا۔

شرائط حمی:

اول:...... یہ حمی جہاد فی سبیل اللہ کے گھوڑوں اور صدقہ کے مویشیوں کے لئے ہو، کسی فرد کی اپنی ذات کے لئے نہ ہو، نہ امراءؒ اور حکام کا اس حمی سے خصوصی مفاد وابستہ ہو، مسلمانوں کے مصالح عامہ کے لئے حمی بنانے کو بعض نے قیاساً جائز کہا ہے اور بعض نے ناجائز۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہ فرماتے ہیں:

''ونیست ہیچ یکے از ائمہ را بعد از آں حضرت کہ گرد کند آنرا برائے نفس خود، واختلاف کردہ اند در گرد کردن آں برائے مصالح عامہ، پس بعضے گفتہ اند درست است، چنانکہ آنحضرت ﷺ کرد، وبعضے گفتہ اند کہ درست نیست وقتیکہ باعث گردد بر تنگی اہل بلد۔'' (اشعۃ اللمعات ج:۳ ص:۷۲)

ترجمہ:......''آنحضرت ﷺ کے بعد کسی امام (خلیفہ) کے لئے یہ جائز نہیں کہ اپنی ذات کے لئے کسی خطہ کو ''حمی'' بنائے، اور علماءؒ کا اس میں اختلاف ہے کہ مصالح عامہ کے لئے ''رکھت'' بنانا جائز ہے یا نہیں، چنانچہ بعض نے کہا کہ جائز ہے، جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے حمی بنائی تھی، اور بعض

کہتے ہیں جائز نہیں، جبکہ اہلیان شہر کے لئے تنگی کا باعث ہوجائے۔''

دوم:...... حمی کے لئے دوسری شرط یہ ہے کہ وہ زمین کسی کی مملوکہ نہ ہو آنحضرت ﷺ اور حضرات خلفائے راشدینؓ نے ''موات'' یعنی غیر آباد اور غیر مملوکہ جنگلات ہی کو ''حمی'' بنایا تھا، اور کسی امام اور فقیہ نے کبھی یہ فتویٰ نہیں دیا کہ کسی کی مملوکہ زمین کو ''حمی'' بنانا جائز ہے، حافظ بدرالدین عینیؒ لکھتے ہیں:

''وانما یحمی الامام مالیس بملک لاحد مثل بطون الاودیة والجبال، والموات وان کان ینتفع المسلمون بتلک المواضع فمنافعهم فی حمایة الامام اکثر.'' (عمدۃ القاری جز:۱۲ ص:۲۱۳)

ترجمہ:......''امام (خلیفہ) صرف ایسی زمین کو حمی بنا سکتا ہے جو کسی کی ملک نہ ہو جیسے وادیوں کے اندرونی حصے، پہاڑ اور غیر آباد زمینیں، اگرچہ ان مقامات سے بھی مسلمان منتفع ہوتے ہیں، تاہم ان کے منافع امام (خلیفہ) کی زیر نگرانی زیادہ ہی ہوں گے۔''

سوم:...... حمی کے لئے ایسی زمین منتخب کی جائے، جس سے عام لوگوں کے مویشیوں کو تنگی نہ ہو مثلاً وہ آبادی کے قریب نہ ہو، امام خطابیؒ لکھتے ہیں:

''وللائمة ان یفعلوا ذلک علی النظر ما لم یضق منه علی العامة المرعی.'' (معالم السنن ج:۴ ص:۲۷۰)

ترجمہ:......''امام (خلفاءؒ) بھی مصلحت کے پیش نظر

"حمی" بنا سکتے ہیں بشرطیکہ اس سے عوام الناس کے لئے چراگاہ
میں تنگی لاحق نہ ہو۔"

چہارم:...... اگر خشک سالی کی وجہ سے چارہ کی قلت ہو جائے عوام الناس کو تنگی لاحق ہو تو ضرورت مندوں کو سرکاری چراگاہوں میں مویشی چرانے یا چارہ حاصل کرنے کی اجازت دی جائے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ربذہ کی چراگاہ کے متولی کو یہ ہدایت فرمائی تھی۔ (کتاب الاموال ص:۲۹۸ فقرہ: ۷۴۰)

"حمی" سے متعلق ان ضروری مباحث کے بعد اب ہم فاضل موصوف جناب سورتی صاحب کے خیالات کا مطالعہ کرتے ہیں، موصوف نے اس حدیث: "لا حمی الا للہ ولرسولہ" سے اشتراکیت کے استخراج کی بنیاد تین مغالطوں پر رکھی ہے:

اول یہ کہ موصوف نے مطلب براری کے لئے "حمی" کے مفہوم میں تحریف کی، چنانچہ لکھتے ہیں:

> "عربی میں ہر وہ چیز، جسے کوئی فرد یا جماعت اپنے مفاد کے لئے مخصوص کرلے اور اس میں دوسروں کی دخل اندازی ممنوع ہو "حمی" کہلاتی ہے۔"

زیر بحث حدیث میں "حمی" کی یہ تفسیر موصوف کی خود ساختہ اور طبع زاد ہے، علمائے لغت اور شارحین حدیث میں سے کسی نے یہ معنی بیان نہیں کئے، اور یہ عقل صریح کے بھی خلاف ہیں (المغرب کی عبارت، عمدۃ القاری کے حوالے سے اوپر نقل کرچکا ہوں اسے ایک بار پھر دیکھ لیجئے) اگر اسلام میں اس بات کی ممانعت ہوتی کہ کوئی شخص کسی چیز کو اپنے مفاد کے لئے مخصوص کرلے تو اسلام کے وہ تمام احکام جن کا

تعلق کسی فرد کی ذاتی املاک سے ہے، یکسر معطل قرار پاتے، تو حج و زکوۃ سے لے کر بیوی بچوں کے نفقہ و سکنی تک کے احکام آخر کس چیز سے متعلق ہیں؟ موصوف بصد شوق اشتراکیت اور نیشنلزم کے نکات قرآن و حدیث کی گہرائیوں سے نکالیں لیکن یہ بڑی علمی خیانت ہے کہ وہ اپنے مطلب کے لئے قرآن و حدیث کے مطالب کو بدل ڈالیں اور اسلام کے اہم ترین قواعد وضوابط سے آنکھیں موندھ لیں۔

موصوف کا دوسرا نکتہ، حدیث کے لفظ "للہ ولرسولہ" کی عجیب و غریب "پرویزی تفسیر" ہے ارشاد ہوتا ہے:

اللہ ورسول سے یہاں مراد "اسلامی حکومت" ہے (موصوف نے جن دنوں یہ فقرہ لکھ کر "اسلامی حکومت" کے سر پر "خدائی اور رسالت" کا تاج رکھا تھا، ان دنوں جناب فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب بالقابہ کی "اسلامی حکومت" کا ڈنکا بجتا تھا، جناب سورتی صاحب ہی نہیں ان کے علاوہ بھی خدا جانے کن کن "دانشوروں" نے ان کو "خدا اور رسول" کہہ کر انہیں "مرکز ملت" اور "مرکز ایمان وعقیدت" قرار دیا تھا، مگر جھوٹے خداؤں اور ان پر ایمان لانے والوں کا دنیا میں جو حشر ہوا، سب کے سامنے ہے اور آخرت میں جو ہوگا اسے دنیا دیکھے گی، "حذر! اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں"۔ ناقل)۔

راقم الحروف کے نزدیک موصوف کا یہ فقرہ غیر علمی ہے، جو کسی سنجیدہ علمی تنقید کا مستحق نہیں، مسلمانوں نے چودہ صدیوں میں کبھی کسی "اسلامی حکومت" کو اللہ و رسول کا درجہ نہیں دیا، مسلمان بس ایک ہی خدا کو اور ایک ہی رسول کو بحیثیت آخری رسول کے جانتے اور مانتے ہیں، جن کا کلمہ طیبہ: "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" میں ذکر ہے ـــ یہ مسلمان صرف ان ہی پر ایمان رکھتے ہیں، ان ہی کی دل سے

تصدیق اور زبان سے اقرار کرتے ہیں، قرآن مجید یا حدیث پاک میں جہاں کہیں "اللہ اور اس کے رسول" کا نام یا ذکر آیا ہے، وہاں یہی کلمہ طیبہ والے "خدا اور رسول" مراد ہیں، ان کے علاوہ کسی اور کو "خدا اور رسول" کا مصداق ٹھہرانا ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے بدترین جسارت اور بدتمیزی ہے۔ "وسیعلم الذین ظلموا أی منقلب ینقلبون"

البتہ فاضل محترم کو اختیار ہے کہ وہ لیلائے اشتراکیت کی محبت میں کسی اسلامی یا غیر اسلامی حکومت کو "اللہ و رسول" کے مرتبہ پر فائز کریں، یا کسی ڈکٹیٹر کے سامنے آداب بندگی بجالائیں، یہ ان کا خالص نجی اور ذاتی معاملہ ہے، اس دور آزادی میں کون ہے جو ان کے ہاتھ سے قلم چھین لے؟ بالخصوص جب ارباب اقتدار کو "خدا و رسول" کے خطاب سے نواز کر اس کے صلہ میں "قلمی تحفظ" حاصل کرلیا جائے، بقول اکبر مرحوم:

گورنمنٹ کی خیر مناؤ یارو!
انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

لیکن انہیں یہ وسوسہ دل سے نکال دینا چاہئے کہ کوئی سیدھا سادہ مسلمان ان کی اس غلط منطق سے اتفاق کرے گا کہ "اللہ و رسول سے مراد اسلامی حکومت ہے۔" البتہ ان کا یہ فلسفہ اشتراکیت کے مزاج کے عین مطابق ہے، کیونکہ اشتراکیت بھی پارٹی لیڈروں کے علاوہ کسی خدا اور رسول کی قائل نہیں، اور اگر فاضل محترم اپنا فقرہ ادھورا نہ چھوڑ دیتے، اور یوں فرماتے:

"اللہ و رسول سے مراد حکومت ہے، اور حکومت عوام کی ہے لہٰذا عوام ہی ہمارا خدا و رسول ہے۔"

تو یہ بات قائد اشتراکیت جناب ماؤزے تنگ کی تعلیم کے عین مطابق ہوتی، امید ہے کہ موصوف اس فروگزاشت پر متنبہ ہوکر آئندہ ایڈیشن میں اپنا فقرہ مکمل کرلیں گے۔

موصوف کا تیسرا نکتہ یہ ہے کہ جاہلیت میں جو لوٹ کھسوٹ اور جور و ظلم روا رکھا جاتا تھا اس کی کسی اور کو تو اجازت نہیں لیکن "اللہ و رسول" کو جاہلی ظلم و جور کی ہر طرح اجازت ہے، وہ جب چاہیں، "قومی مفاد" کے نام پر لوگوں کے املاک "بحق سرکار" ضبط کرلیں، ارشاد ہوتا ہے:

"اگر حمی کا جاہلی مفہوم سامنے رکھا جائے جس میں ایک قوی فرد کسی دوسرے قبیلہ کی زمین یا غیر مملوکہ زمین رکھت بنانے کا حق رکھتا تھا، تو اس سے اسلام میں صرف اللہ و رسول ہی کا یہ حق کہ وہی کسی دوسرے کی ملکیت کو حمی بنا سکتے ہیں، آج بھی قابل غور مسئلہ بن سکتا ہے، اور اس بنا پر حکومت کو یہ اختیار حاصل ہوسکتا ہے کہ وہ بعض لوگوں کی ملکیت کو قومی مفاد کی خاطر اپنی تحویل میں لے لے۔" (مقدمہ کتاب الاموال جلد اول ص:۱۰۵)

اس سلسلہ میں اتنی گزارش کافی ہے، کہ موصوف اگر اس جاہلی ظلم و جور اور لوٹ کھسوٹ کو اپنے "خدا و رسول" (حکومت) کے لئے جائز سمجھتے ہیں، تو وہ جانیں اور ان کا خدا و رسول، آخر موصوف کے فلسفۂ اشتراکیت میں خدا سے خدائی اور رسول سے رسالت چھین کر (خاکم بدہن) انہیں حکومت کی تحویل میں دیا جاسکتا ہے، اور حکومت کو "اللہ و رسول" کہا جاسکتا ہے، تو بندے تو بیچارے پھر بندے ہیں، اگر ان کے املاک ضبط کرنے کی اجازت موصوف کی جانب سے مرحمت ہوجائے تو تعجب

کیوں کیجئے!

البتہ موصوف کو اطمینان رہنا چاہئے کہ مسلمانوں کے "اللہ تعالیٰ و رسول" کا یہ ارشاد رسم جاہلیت کو جاری کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس جاہلی ظلم کو مٹانے کے لئے ہے جس کی اجازت آں محترم، حکومت کو عطا کر رہے ہیں، امام خطابی فرماتے ہیں:

"وفیہ ابطال ماکان اھل الجاھلیۃ یفعلونہ من ذالک" (معالم السنن ج:۳ ص:۴۹)

ترجمہ:......"اس حدیث کے ذریعہ اس عمل کو باطل قرار دیا گیا ہے، جس میں اہل جاہلیت مبتلا تھے۔"

موصوف کی خوش فہمی کا عجیب نمونہ ایک اور ملاحظہ فرمایئے:

"حضرت عمرؓ نے مقام "ربذہ" میں جہاد فی سبیل اللہ کے وقف گھوڑوں کے لئے "حمی" مخصوص چراگاہ بنانا چاہی تو بعض حضرات نے اس پر اعتراض کیا کہ آپ مسلمانوں کے مویشیوں کو چرائی کے حق سے محروم کیسے کرسکتے ہیں، جبکہ اس خطہ کی حیثیت اسلام سے پہلے بھی املاک عامہ کی تھی اور اسلام کے بعد بھی تمام مسلمانوں کا مفاد اس سے متعلق ہے، حضرت عمرؓ نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد فرمایا: "بلاد اللہ حمیت لمال اللہ" (عمدۃ القاری ص:۲۹)

ترجمہ: جنگلات کی یہ زمین اللہ کی ہے، میں نے اسے "اللہ کے مال" کے لئے محفوظ کرلیا ہے۔

اور ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

"المال مال اللہ، و العباد عباد اللہ، واللہ لولا ما احمل علیہ فی سبیل اللہ ما حمیت الارض شبراً فی شبر." (کتاب الاموال ص:۲۹۹)

ترجمہ:......"یہ مال بھی اللہ ہی کا ہے، اور بندے بھی اللہ ہی کے ہیں، بخدا! اگر یہ وقف کے گھوڑے نہ ہوتے جن کو میں جہاد فی سبیل اللہ کے لئے سواری کے طور پر دیتا ہوں تو میں ایک بالشت زمین کو بھی "حمی" نہ بناتا۔"

حضرت عمرؓ کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا، کہ یہ غیر آباد زمینیں، جنہیں "اموات" کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں، کسی فرد خاص کا ان سے حق متعلق نہیں، ادھر جہاد فی سبیل اللہ کے لئے جو گھوڑے وقف ہیں وہ بھی "اللہ ہی کا مال" ہے اس لئے "اللہ کی زمین" کو "اللہ کے مال" کے لئے وقف کردینا "اللہ کے بندوں" کے لئے قابل اعتراض نہیں ہونا چاہئے، پھر خود رسول اللہ ﷺ نے بھی "اللہ کے مال" کے لئے "اللہ کی زمین" کو وقف کیا تھا آپ ﷺ کی سنت کی پیروی میرے لئے موجب اعتراض کیوں کر ہوسکتی ہے؟ بخدا اگر یہ جہاد کے وقف گھوڑے نہ ہوتے تو میں کسی اور مصلحت کے لئے ایک انچ زمین بھی سرکاری تحویل میں نہ رکھتا۔

حضرت عمرؓ کے اس ارشاد میں نہ صرف یہ کہ اشتراکیت کے لئے کوئی گنجائش نہیں بلکہ اس کے برعکس اس سے اشتراکیت کی تردید ہوتی ہے، لیکن ہمارے فاضل محترم سورتی صاحب "استدلال بالضد" کے مشاق ہیں، آپ نے حضرت عمر رضی اللہ کے اس ارشاد سے بھی اشتراکیت کا کھوج نکال ڈالا، فرماتے ہیں:

"اس واقعہ سے ظاہر ہورہا ہے کہ حضرت عمرؓ نے

لوگوں کی مملوکہ زمینوں کو (یا کم از کم ایسی زمینوں کو جسے وہ اپنی ملکیت سمجھتے تھے) مملکت اسلامی کے اجتماعی مفاد کی خاطر حکومت کی تحویل میں لے لیا تھا اور کوئی وجہ نہیں جو اسلامی حکومت کو آئندہ اجتماعی مفادات کے تحفظ کے لئے اس قسم کے اقدام کے اعادہ سے محروم کردے۔"

اسی سلسلہ میں حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"حضرت عمرؓ کا یہ جملہ بتا رہا ہے کہ "مال اللہ اور عباد اللہ پر اسلامی حکومت کو بڑے اختیارات حاصل ہیں اور وہ ان کی مصلحت اور مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ لوگوں سے ان کی ملکیت چھین سکتی ہے۔"

حضرت عمرؓ کے اس ارشاد میں "مال اللہ" "بلاد اللہ" اور "عباد اللہ" کے الفاظ کا مفہوم اوپر عرض کیا جاچکا ہے، لیکن موصوف نے اس ارشاد میں جو اشتراکی "سوفسطائیت" پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اس کی مثال ٹھیک وہی ہے جو مولانا رومؒ نے ذکر فرمائی ہے کہ ایک "اشتراکی مفکر" کسی کے باغ میں جا گھسے، اور باغ کے پھلوں سے بلاتکلف کام و دہن کی ضیافت شروع کردے، باغ کے مالک نے دریافت کیا کہ یہ کیا؟ بولے: باغ بھی خدا کا، میں بھی خدا کا، پھل بھی خدا کے، تم کون ہوتے ہو منع کرنے والے؟ مالک نے سوچا یہ اشتراکی سوفسطائیت کے قائل ہیں، انہیں اسی زبان میں جواب دینا چاہئے، انہوں نے رسی اور لاٹھی منگوائی، ان کو رسی سے باندھ کر پیٹنا شروع کیا، اب وہ چیخے کہ ارے یہ کیا کرتے ہو، مالک نے کہا: رسی بھی خدا کی، لاٹھی بھی خدا کی، میں بھی خدا کا، تمہارا سر بھی خدا کا، چیختے کیوں ہو؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد "موات" اور غیر مملوکہ زمینوں کے متعلق تھا، کہ وہ صرف اللہ کی ملک ہیں، کسی انسان کی ملک نہیں لیکن موصوف کو اس میں بھی اشتراکی سوفسطائیت نظر آتی ہے، جب عقل و ایمان اور علم و فہم رخصت ہوجائیں تو آدمی بالکل واضح حقائق کو بھی اپنے ذہنی وساوس ہی کے رنگ میں ڈھال لیتا ہے۔

امام ابوعبیدؒ نے کتاب الاموال (ص:۲۹۴) میں یہ حدیث نقل کی ہے:

"حبان بن زید شرعبی اپنی قوم کے ایک شخص سے روایت کرتے ہیں یہ شخص جلد باز تھا اور ایک جنگ میں حصہ لے رہا تھا، وہ اپنے پڑاؤ کے مقام سے دوسرے جانوروں کو ہٹا رہا تھا ان کے اس عمل پر اسے ایک مہاجر نے ڈانٹا، لیکن اس نے اس مہاجر اور اس کی تنبیہ کو درخور اعتنا نہ سمجھا، جس پر اس مہاجر نے کہا "میں تین سال رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں رہا ہوں۔" جب اس شخص نے رسول اللہ ﷺ کا ذکر سنا تو ٹھٹکا اور شرمندہ ہوکر معافی مانگنے لگا، تب انہوں نے کہا "میں تین سال رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں رہا ہوں اور میں نے آپ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے:

"الناس شرکاء فی الماء و الکلاء و النار"

ترجمہ: "تمام لوگ پانی، گھاس اور آگ میں شریک ہیں۔"

صاحب مشکوٰۃ المصابیح نے اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ کی روایت سے اور الجامع الصغیر میں حافظ جلال الدین السیوطیؒ نے مسند احمد اور سنن ابی داؤد کے حوالہ سے

ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

"المسلمون شرکاء فی ثلث فی الماء، والکلاء و النار"

ترجمہ......"تمام مسلمان تین چیزوں میں شریک ہیں پانی، گھاس، آگ۔"

تمام علماءؒ اس پر متفق ہیں کہ یہاں پانی سے مراد ایسا پانی ہے جو کسی کی ملک نہ ہو، مثلاً دریاؤں اور غیر مملوکہ چشموں کا پانی اور گھاس سے مراد وہ، خودرو گھاس ہے، جو جنگلات اور چراگاہوں میں پائی جاتی ہے، اور آگ سے مراد جنگل کا ایندھن ہے، اور آگ میں شرکت کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک شخص نے آگ روشن کر رکھی ہو اس کے لئے یہ جائز نہیں کہ دوسروں کو اس سے چراغ روشن کرنے سے یا اس کی روشنی سے استفادہ کرنے سے منع کرے، البتہ لکڑی یا انگارہ لیجانے سے منع کرسکتا ہے، شیخ عبدالرؤف مناوی جامع صغیر کی شرح میں لکھتے ہیں:

"قال البیضاوی: المراد من الاشتراک فی النار انه لا یمنع من الاستصباح منها والاستضاءة بضوئها، لکن للموقد ان یمنع اخذ جذوة منها، لانه ینقصها و یؤدی الی اطفائها."

(فیض القدیر شرح الجامع الصغیر ج:۶ ص:۲۷۲)

ان تین چیزوں میں تمام انسانوں یا تمام مسلمانوں کے شریک ہونے کا منشاء یہ ہے کہ اس قسم کے پانی، گھاس اور ایندھن سے چونکہ کسی فرد خاص کی ملکیت متعلق نہیں ہوتی، اس لئے یہ اصل ملک خداوندی پر ہونے کی وجہ سے سب کے لئے "مباح

الاصل" ہیں اور ان سے ہر شخص کو بقدر ضرورت استفادہ کا حق ہے، لیکن اسے دوسروں کو روکنے کا حق نہیں، اگر کوئی شخص دریا سے یا نہر سے اپنے برتن میں پانی بھر لائے، یا جنگل سے گھاس اور ایندھن لے آئے تو وہ اس کا مالک ہوگا، اور اس میں مالکانہ تصرف کا اسے ہر طرح حق حاصل ہوگا، امام ابوعبیدؒ اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"ان اشیاء کے مباح ہونے کے معنی یہ ہیں کہ کچھ لوگ سفر میں بادیہ پیمائی کرتے ہوئے کسی ایسی زمین میں پڑاؤ کریں، جس میں ایسا سبزہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے چوپاؤں کے لئے اگایا ہو، اس پر کسی انسان نے کاشتکاری، شجرکاری یا سیرابی کی محنت صرف نہ کی ہو، تو جو شخص وہاں پہلے پہنچ جائے وہی اس کا مالک ہوجائے گا، اور کسی کو یہ حق نہیں ہوگا کہ وہ دوسروں کو اس کے کسی حصہ کے استعمال سے منع کرے بلکہ ان سب کے جانور اور مویشی ایک ساتھ مل کر وہاں چرتے رہیں گے، اور وہاں جو پانی ہوگا اس سے بھی سب پئیں گے، یہ معنی ہیں آپ ﷺ کے اس ارشاد کے کہ: "سب لوگ پانی اور گھاس میں شریک ہیں۔" نیز آپ ﷺ کے اس ارشاد کے کہ "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اور دونوں کو پانی اور درخت کفایت کرتا ہے۔" پس آنحضرت ﷺ نے ان میں سے کسی چیز کو لوگوں پر بند کردینے سے منع فرمادیا، البتہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی حمی اس سے مستثنیٰ ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے یہ شرط عائد فرمادی، اور اس کا

تذکرہ ہم باب کے شروع میں کر آئے ہیں۔"

اس حدیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ:

الف: ...... جنگل کی خود رو گھاس دریاؤں بڑی نہروں اور جنگلی چشموں کا پانی اور جنگلی ایندھن کسی فرد خاص کی ملک نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے وقف ہیں۔ (خود رو گھاس اگر کسی کی مملوکہ زمین میں ہو، تو شرعاً وہ بھی مالک زمین کی ملک نہیں، بلکہ ہر شخص کو اسے کاٹ لیجانے کا حق حاصل ہے، اور اگر لوگوں کی آمد و رفت سے زمین کے مالک کو ضرر پہنچتا ہو تو خود کاٹ کر لوگوں کے حوالے کر دے)۔

ب: ...... ان سے ہر شخص استفادہ کر سکتا ہے، اور جو شخص انکے جتنے حصے پر قابض ہو جائیگا، وہ اس کی ملک تصور کیجائے گی، اور اس میں منازعت کا کسی کو حق نہیں ہوگا۔

ج: ...... خدا اور رسول کی اجازت کے بعد کسی فرد یا ادارہ کو یہ حق نہیں کہ دوسروں کو اس سے منع کرے اور ان سے مستفید ہونے کا موقع نہ دے۔

د: ...... البتہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کسی ایسے علاقے کو "مال اللہ" کے لئے مخصوص کر سکتے ہیں۔

اسی طرح آپ ﷺ کی نیابت میں خلفائے اسلام بھی جہاد کے گھوڑوں اور صدقات کے مویشیوں کے لئے ایسے علاقہ کو حمی بنا سکتے ہیں، اس کی شرائط پر اس سے پہلے بحث گزر چکی ہے، اس وضاحت کے بعد اس حدیث کو نہ اشتراکیت سے کوئی تعلق ہے، نہ یہ آج کے معروف معنی میں "قومی ملکیت" سے کوئی دور کا واسطہ رکھتی ہے، نہ کسی حکومت کو یہ پروانہ دیتی ہے کہ وہ "اجتماعی مفاد" کے نام پر جب چاہے لوگوں کی جائز املاک ضبط کر لیا کرے، لیکن "اسلامی اشتراکیت" میں یہ تمام نکتے اس

حدیث سے نکال لئے جاتے ہیں، جناب سورتی صاحب لکھتے ہیں:

"اس روایت کے بموجب آپ ﷺ نے یہ تین اشیاً جو اس زمانے کے "اجتماعی مفاد" کے لئے لازمی تھیں، خواہ کسی فرد کی ذاتی ملکیت میں ہی کیوں نہ ہوں، حکومت نے اپنے "حق حمی" سے کام لیتے ہوئے انہیں مشترکہ ملکیت قرار دیدیا۔"

(مقدمہ کتاب الاموال جلد اول ص:۱۰۶)

قرآن و حدیث کی کھلی تحریف بڑی خیانت ہے اور خدا و رسول کی طرف کسی غیر واقعی بات کو منسوب کرنا افترا ہے، قرآن و حدیث میں اس پر جو وعید آئی ہے غالباً جناب سورتی صاحب اس سے ناواقف نہیں ہوں گے، مگر افسوس ہے کہ وہ یہاں پر مبینہ طور پر کئی باتیں رسول اللہ ﷺ کی طرف غلط منسوب کر رہے ہیں۔

اولاً: ...... ان کا یہ دعویٰ محض مفروضہ ہے کہ یہ تین اشیاً "اس زمانے" کے "اجتماعی مفاد" کے لئے لازمی تھیں اسی بنا پر بقول ان کے، انہیں مشترکہ ملکیت قرار دیا گیا، کیا وہ کسی دلیل سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ "اس زمانے کے اجتماعی مفاد کا دائرہ بس انہی تین چیزوں تک محدود تھا؟ اگر جواب نفی میں ہے تو سوال یہ ہے کہ حدیث میں ان ہی تین چیزوں کی تخصیص کیوں کی گئی؟

ثانیاً: ...... وہ ان تین اشیاً میں تمام انسانوں کی شرکت کا مبنیٰ "اجتماعی مفاد" کو قرار دیتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ شریعت نے ملکیت فرد کے ساتھ ساتھ اجتماعی مفاد کو بھی قدم قدم پر ملحوظ رکھا ہے اور اس میں اس حد تک گہرائی اور لطافت اختیار کی گئی ہے کہ عقل حیران ہے، اور اس حدیث میں بھی اجتماعی مفاد کو نظر انداز نہیں کیا گیا،

با ایں ہمہ اس حدیث میں ''مناط حکم'' اجتماعی مفاد نہیں بلکہ ان اشیاءِ ثلثہ کی ''اباحت اصلیہ'' ہے، اور تمام مباحات الاصل کا حکم یہی ہے کہ وہ مفادِ عامہ کے لئے وقف ہیں، بقدر ضرورت ہر شخص ان سے استفادہ کرسکتا ہے، مگر دوسروں کو اس سے منع نہیں کرسکتا، اور ان مباحات میں سے کسی چیز پر جس شخص کا شرعاً صحیح قبضہ ہو دوسرے کو اس سے منازعت کا حق نہیں، وہ اسی کی ملک ہے، حکیم الامت شاہ ولی اللہ دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''جب اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو پیدا کیا، زمین کی سطح پر ان کے لئے ہر قسم کا سامان معاش مہیا فرمایا اور ان اشیاءؑ سے فائدہ اٹھانے کا ان کو اختیار دیا تو ان پر خودغرضی غالب ہوئی اور قسم قسم کے جھگڑے اس سے ظہور میں آئے، جس کا باعث اور محرک ان کا باہمی بغض وحسد اور رقابتیں اور مخالفتیں تھیں، اللہ تعالیٰ نے (نظام اجتماعی کو بہتر صورت میں قائم رکھنے کے لئے جو اس کی حکومت بالغہ کا اقتضاء تھا لوگوں کو اپنے رسولوں کی معرفت) حکم دیا کہ کوئی شخص دوسروں کے حقوق پر دست درازی نہ کرے، جب ان میں سے کوئی کسی چیز پر جائز طور پر قبضہ کرلے، مثلاً سب سے پہلے وہ چیز اس کے ہاتھ لگے یا میراث کے ذریعہ اس کو حاصل ہو یا کسی ایسے ہی دوسرے جائز طریقہ سے اس کے قبضہ میں آجائے، اندریں صورت کسی کو بھی حق حاصل نہیں کہ وہ چیز بغیر اس کی صریح رضامندی کے اس سے چھین کر اپنے قبضہ میں لائے، چاہے یہ رضامندی معاوضہ دے

کر حاصل کی ہو یا اس کے مالک نے بغیر معاوضہ لئے اپنی خوشی سے وہ چیز اس کو دینا پسند کیا ہو بشرطیکہ اس کے ضمن میں کوئی دھوکا اور فریب نہ ہو۔''

(ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ ج:۲ ص:۴۶۳، از مولوی عبدالرحیم)

آنحضرت ﷺ کے ارشاد ''من احیی ارضا میتۃ فھی لہ'' (جس نے کسی غیر آباد بنجر زمین کو آباد کیا وہ اسی کی ہوگئی) پر گفتگو کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''یہ اباحت کے اسی اصول پر مبنی ہے، جس کی طرف ہم نے ابھی اشارہ کیا، سب کچھ درحقیقت اللہ تعالیٰ کا مال ہے، اور کسی دوسرے کا اس میں کوئی حق نہیں، مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو زمین اور زمین کی چیزوں سے نفع اٹھانے کی اجازت دے دی، تو اس بارے میں کشمکش واقع ہوئی، تب فیصلہ یہ فرمایا کہ جو بطریق شرعی کسی چیز پر قابض ہوگیا، اس پر دست درازی نہ کی جائے، چنانچہ حدیث مذکور میں ارض میتۃ سے مراد وہ بنجر زمین ہے جو شہر اور فنائے شہر سے دور واقع ہو، جو شخص اس کو آباد کرلے گا، وہ اس پر قابض تصور کیا جائے گا اور اسے وہاں سے ہٹانا جائز نہیں ہوگا، دراصل تمام روئے زمین کی مثال کسی مسجد یا سرائے کی ہے جس کو آنے جانے والے مسافروں کے لئے وقف کردیا گیا ہو، سب کو اس سے استفادہ کا یکساں حق حاصل ہے اور جو سب سے پہلے قابض ہوجائے وہ مقدم ہوگا، پھر

دوسرے کے لئے اس پر دست درازی جائز نہیں ہوگی، اور ملک کے معنی انسان کے حق میں یہی ہیں کہ دوسروں کی نسبت اس کا حق انتفاع مقدم ہے۔" (حجۃ اللہ البالغہ ج:۲ ص:۱۰۳)

بہر حال اس حدیث میں مناط حکم ان کی اباحت اصلیہ، اور اصل ملک خداوندی پر قائم ہوتا ہے "مفاد عامہ" خود مدار حکم نہیں بلکہ اس پر مرتب ہوتا ہے، اب اسے مدار حکم قرار دینا اگرچہ علمی اور "اجتہادی غلطی" ہے۔

ثالثاً:...... جناب سورتی صاحب کا یہ ادعاء (خواہ وہ کسی فرد کی ذاتی ملکیت میں بھی کیوں نہ ہوں) محض ایجاد بندہ، اور صراحۃً افتراء علی الرسول ہے (ﷺ)۔ کیا حدیث میں اس عموم کی طرف کوئی ادنیٰ اشارہ بھی موجود ہے؟

رابعاً:...... سورتی صاحب کا یہ کہنا کہ (حکومت نے اپنے حق حمی سے کام لیتے ہوئے) بناءً فاسد علی الفاسد ہے، انہوں نے یہ فرض کرلیا ہے کہ حدیث میں اللہ اور رسول کا خطاب حکومت کو دیا گیا ہے، اس لئے ان کے نزدیک حق حمی بیچ میں اللہ اور رسول کو نہیں بلکہ حکومت کو ہے، اور پھر یہ حق کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں بلکہ اس میں پوری طرح مطلق العنان ہے، اور یہ دونوں مفروضے ان کے خانہ زاد ہیں، حدیث اور صاحب حدیث ﷺ دونوں اس ظلم وسفاہت سے بری ہیں۔

خامساً:...... ان تین اشیاء میں تمام مسلمانوں کی "جنس شرکت" کا حکم فرمایا گیا ہے موصوف اسے "خوش فہمی" سے مارکس کی "مشترکہ ملکیت" کے ہم معنی قرار دے رہے ہیں اور یہ بدترین تلبیس ہے۔

مارکسی "مشترکہ ملکیت" کسی فرد کو یہ اجازت نہیں دیتی کہ وہ اسٹیٹ کی اجازت کے بغیر "مشترکہ ملکیت" کا ایک تنکا بھی اٹھا کر اپنے کام میں لائے اور

حدیث پاک میں جن اشیاء میں تمام لوگوں کو شریک قرار دیا گیا ہے، ان کے بارے میں اعلان عام ہے کہ ہر فرد بغیر کسی روک ٹوک کے ان سے مستفید ہوسکتا ہے اور انہیں اپنی ملک میں لاسکتا ہے: "ببیں تفاوت راہ از کجا است تا بکجا"۔

مارکس کا اشتراکی نظریہ، اسٹیٹ کو "مشترکہ ملکیت" ملکیت کا اجارہ دار قرار دیتا ہے، اس کے برعکس ان تین اشیاء پر اسلام کسی فرد اور ادارہ کا اجارہ تسلیم نہیں کرتا، بلکہ انہیں سب کے لئے وقف عام قرار دیتا ہے، کیا اس "شرکت" کو آج کی اصطلاحی "مشترکہ ملکیت" بتانا عقل وانصاف سے صریح زیادتی نہیں؟ اور پھر مارکسی "مشترکہ ملکیت" کو رسول اللہ ﷺ سے منسوب کرنا تلبیس وافتراء کی افسوسناک مثال نہیں؟

امام ابوعبیدؒ نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ:

"بھیسہ روایت کرتی ہیں کہ میرے والد نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا: "یارسول اللہ وہ کیا چیز ہے جس کا روکنا حلال نہیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا "پانی"۔ انہوں نے پھر عرض کیا، "یارسول اللہ! وہ کیا چیز ہے جسے لوگوں سے روکنا حلال نہیں؟" آپ نے فرمایا "نمک" انہوں نے پھر کہا، یارسول اللہ! وہ کیا چیز ہے جسے روک رکھنا حلال نہیں؟" آپ نے فرمایا: "ان تفعل الخیر خیر لک" تم بھلائی کرتے رہو یہ تمہارے لئے بہتر ہی بہتر ہے۔"

چنانچہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد اس موقع پر پانی اور نمک تک محدود رہا، بعد ازاں وہ صاحب کسی کو پانی سے نہیں روکتے تھے، خواہ وہ کتنا ہی تھوڑا ہو۔

(کتاب الاموال ص:۲۹۶)

حدیث کو اول سے آخر تک بار بار پڑھئے، صاف نظر آتا ہے کہ حدیث میں قانونی ضابطہ نہیں، بلکہ اخلاقی ضابطہ کا بیان ہے، آنحضرت ﷺ ان صاحب کو مکارم اخلاق کی تعلیم دے رہے ہیں کہ ایک مسلمان کی اخلاقی سطح اتنی بلند ہونی چاہئے کہ خواہ اس کے پاس کتنی قلیل اور حقیر چیز کیوں نہ ہو، لیکن جب کوئی سائل اس سے سوال کرے تو اسے ایثار و مروت اور خیر طلبی کا مظاہرہ کرنا چاہئے، اور سائل کے سوال کو رد نہیں کرنا چاہئے، چنانچہ آپ کی تعلیم کا یہی اثر ہوا کہ اس کے بعد وہ کسی سائل کو رد نہیں کرتے تھے، اس کی مزید تشریح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے ہوتی ہے، جسے صاحب مشکوۃ المصابیح نے (مشکوۃ المصابیح، باب احیاءُ اموات، فصل ثالث میں) ابن ماجہ کے حوالے سے نقل کیا ہے:

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ! وہ کونسی چیز ہے جس سے لوگوں کو روکنا حلال نہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''پانی، نمک اور آگ!'' میں نے کہا: ''یارسول اللہ! اس پانی کو تو ہم جانتے ہیں (کہ انسان اور جاندار کو اس کی شدید ضرورت ہے، اور کسی ضرورتمند کو پانی دینے میں بخل کرنا بڑی ناروا بات ہے) لیکن نمک اور آگ کا کیا حال ہے؟ (بظاہر اتنی حقیر چیزوں کا اتنا سخت حکم ناقابل فہم ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا: ''حمیرا! جس نے کسی کو آگ دی گویا اس نے ان تمام چیزوں کا صدقہ کیا جو اس آگ سے پکائی گئیں، اور جس نے نمک کا عطیہ دیا گویا اس نے ان تمام چیزوں کا صدقہ کیا جو اس نمک کے ساتھ خوش ذائقہ

بنائی گئیں، اور جس نے کسی مسلمان کو ایسی جگہ جہاں پانی مل سکتا ہے، پانی کا گھونٹ پلایا اس نے گردن آزاد کی اور جس نے کسی مسلمان کو ایسی جگہ، جہاں پانی دستیاب نہیں ہوتا، پانی کا گھونٹ پلایا، گویا اس نے مردے کو حیات نو بخشی.....'' (اتنی معمولی چیزوں میں بخل کر کے اتنے بڑے ثواب سے محروم رہنا ظاہر ہے انتہائی دناءت کی بات ہے)۔

ظاہر ہے کہ نمک کی چٹکی، پانی کا گھونٹ اور آگ کے ایک شعلہ کے بارے میں ''لایحل منعہ'' کی تعلیم قانونی نہیں اخلاقی ہے، لیکن جناب سورتی صاحب اس پر بھی اشتراکیت کا خیالی محل، (جس میں ''اخلاق'' سرے سے خارج از بحث ہے) تعمیر فرماتے ہیں، ذرا ان کی تکنیک ملاحظہ فرمائیے، ارشاد ہوتا ہے:

''آپ کا یہ جواب کتنی عظیم حقیقتوں کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے: ''ان تفعل الخیر خیر لک'' (تمہارا خیر کرنا تمہارے لئے بہتر ہے)۔

گویا حضور ﷺ نے اپنے زمانے میں پانی، آگ، گھاس، درخت اور نمک کو تمام لوگوں کی مشترکہ ملکیت قرار دیتے ہوئے یہ فرمایا کہ خیر اور بھلائی کرتے رہنا ایسا عمل ہے کہ جس سے کسی کو محروم کرنا حرام ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے زمانہ کے چند خیر بتا کر لوگوں کو آزادی دی ہے کہ وہ ہر زمانہ میں حدود اللہ میں رہتے ہوئے خوب تر کو قبول کرلیں، اس صحبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر آج ''اسلامی حکومت'' اپنے امکانی وسائل سے

کام لیتے ہوئے اس قسم کی مزید کچھ چیزیں معلوم کرلے جنہیں آج مشترکہ ملکیت دینے سے ''خیر'' کا زیادہ امکان ہو تو ان کا اضافہ کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کا منشا ومقصود ہوگا۔''

اس عجیب وغریب تحقیق کا سراغ اشتراکی مفکروں کے سوا چودہ صدیوں میں کس کو ہوسکتا تھا کہ ایک غیر معروف صحابی جن کا نام بھی روایت میں مذکور نہیں اور جن کا تعلق دور دراز کے قبیلہ ''بنی فزارہ'' سے ہے، آنحضرت ﷺ سے سوال کرتے ہیں کہ کوئی سائل مانگنے آئے تو کونسی چیزیں ایسی ہیں جن میں میرے لئے بخل کا مظاہرہ ناروا ہوسکتا ہے؟ آپ ﷺ پانی اور نمک پر بات ختم کردیتے ہیں، یہ جناب سورتی صاحب کے نزدیک ''اس زمانہ کی اشتراکیت'' ہوئی، اور جب تیسری بار وہ صحابی یہی سوال دہراتے ہیں تو آنحضرت ﷺ اسے تلقین فرماتے ہیں کہ بھلائی کرتے رہنا بہرحال تمہارے حق میں بھلا ہی بھلا ہے: ''ان تفعل الخیر خیر لک''

سورتی صاحب کے خیال میں یہ اسلامی حکومت کے لئے آزادی کا پروانہ ہے، کہ وہ جب چاہے لوگوں کے املاک ضبط کرکے ''خیر'' پھیلاتی رہے۔ ''کار طفلاں تمام خواہد شد''

عجیب بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ لوگوں سے کسی چیز کے نہ روکنے کو ''خیر'' فرماتے ہیں، اور سورتی صاحب آنحضرت ﷺ سے یہ کہلوانا چاہتے ہیں کہ کسی کے پاس کوئی چیز نہ رہنے دینا ''خیر'' ہے، آنحضرت ﷺ امت کی اخلاقی سطح اتنی بلند دیکھنا چاہتے ہیں کہ معاشرہ میں کوئی ضرورتمند خالی ہاتھ واپس نہ جائے، اور سورتی صاحب حضور ﷺ کا نام لے کر یہ فتوی صادر فرماتے ہیں کہ پورے اسلامی معاشرہ کو خالی ہاتھ ہوجانا چاہئے، اور مال ودولت کے تمام وسائل کو ''اسلامی حکومت'' کے

اعلیٰ افسروں کے لئے مال غنیمت بنادینا چاہئے۔

جناب سورتی صاحب نے شوق تحقیق میں اس کھلی بات کو بھی نظر انداز کردیا کہ اگر آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کا منشا، بقول ان کے، نیشنلزم کی ترغیب ہوتا، تو آپ ﷺ اس کی تلقین مدینہ طیبہ کے لوگوں کو فرماتے، اکابر، مہاجرین وانصار کو یہ نکتہ سمجھاتے، یا کم از کم اعلان عام فرماتے کہ حسب مصلحت اسلامی حکومت کیلئے لوگوں کے املاک ضبط کرکے انہیں ''مشترکہ ملکیت'' قرار دینا نہ صرف جائز بلکہ عین منشا خدا ورسول ہے، لیکن سورتی صاحب کے مطابق یہ اہم ترین نکتہ، جس کا تعلق تمام اسلامی معاشرہ سے ہے، سمجھایا جاتا ہے کس کو؟ ایک غیر معروف صاحب کو! سوال یہ ہے کہ اس ''مشترکہ ملکیت'' کی تبلیغ قبیلہ بنی فزارہ کے ایک غیر معروف صاحب کو، جن کے نام کی تفسیر کے لئے بھی سورتی صاحب کو الاصابہ سے مدد لینی پڑی تھی، آخر کیا معقولیت رکھتی ہے؟ شریعت کا اصول یہ ہے کہ جو بات جس قدر اہم ہوتی ہے اسے اسی قدر اہتمام سے ذکر کیا جاتا ہے، اگر اس کا تعلق عام لوگوں سے ہو تو اس کا برسر عام اعلان کیا جاتا ہے اور اگر وہ خواص کے متعلق ہوتی ہے تو خصوصی اہمیت کے افراد کو اس کی تلقین فرمائی جاتی ہے، اس اصول پر سورتی صاحب کی ذکر کردہ روایت کا جائزہ لیجئے، جو: ''عن سیار بن منظور الفزاری عن امراءۃ منهم یقال لها بهیة'' کی سند سے مروی ہے، آنحضرت ﷺ بنی فزارہ کے ایک غیر معروف صاحب کو خطاب حاضر کے صیغہ سے فرماتے ہیں ''ان تفعل الخیر خیر لک'' پھر ان بزرگ سے روایت کرنے والی صرف ان کی صاحبزادی ''بہیہ'' نامی ایک غیر معروف خاتون ہیں، چنانچہ تقریب میں ہے: بهیة، بالتصغیر ...... لا تعرف، ویقال ان لها صحبة، تقریب باب النساء۔ ان کے علاوہ کوئی شخص انہیں روایت نہیں کرتا، اور ''بہیہ'' سے

روایت کرنے والے صرف ایک صاحب سیار بن منظور ہیں، جن کا شمار طبقہ سادسہ کے ان راویوں میں ہے، جن کا کسی صحابی سے سماع ثابت نہیں۔ چنانچہ اسی تقریب میں ہے: سیار بن سیار الفزاری، البصری، مقبول من السادسة ...... والسادسة طبقة صروا الخامسة ولكن لم يثبت لهم لقاء أحد من الصحابة كابن جريج، (دیباچہ تقریب) اور یہ صاحب بالکل غیر معروف شخص ہیں، یہاں تک کہ بعض حضرات نے انہیں مجہول قرار دیا ہے۔

مزید براں یہ کہ انہوں نے جتنی روایتیں نقل کی ہیں، اوپر سے اُن کا سلسلہ سند منقطع ہوتا ہے۔ (ذکرہ ابن حبان فی الثقات، قلت: فقال: یروی عن ابیہ المقاطیع، وقال عبدالحق الاشبیلی "مجہول" تہذیب التہذیب ج:۴ ص:۲۹۱)

اب ایک ایسی حدیث جس کا مخاطب ایک غیر معروف صحابی ہے، اور تقریباً ڈیڑھ صدی تک اس کی روایت صرف اسی خاندان تک محدود رہی، ان کے علاوہ کسی صحابیؓ اور تابعیؒ نے اس کا ذکر نہیں کیا، نہ اسے روایت کیا، کیا اس کے بارے میں عقل تسلیم کرتی ہے کہ اس کا تعلق مفاد عامہ اور مشترکہ ملکیت جیسے اہم ترین مسئلہ سے ہوسکتا ہے؟ اور صرف اس کی بنیاد پر ادھر ادھر کے مفروضے جوڑ کر "اسلامی اشتراکیت" کا خیالی محل تعمیر کرلینا اعجوبہ پسندی تو کہلاسکتی ہے، مگر اسے سنجیدہ علمی تحقیق نہیں کہا جاسکتا۔

"پانی، نمک اور آگ کا روکنا ممنوع ہے۔" اس ارشاد کا تعلق اخلاقیات کی تعلیم سے ہے، اسے کوئی ضابطہ اور قانون تصور نہیں کیا جاسکتا۔

آنحضرت ﷺ کی حیثیت جہاں شارع کی تھی، (شارع حقیقی حق تعالیٰ کی ذات ہے، آنحضرت ﷺ کے لئے شارع کا اطلاق اس بنا پر کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ صاحب شریعت ہیں اور شرائع الٰہیہ کی تقریر و توضیح فرماتے ہیں) وہیں آپ

ﷺ امت کے لئے معلم اخلاق، مزکی و مربی بھی تھے، آپ ﷺ کے متعدد ارشادات تعلیم و تربیت اور تزکیہ و تطہیر کے باب سے تعلق رکھتے ہیں، وہ بھی امت کے لئے اسی طرح واجب العمل ہیں، جس طرح کہ ضوابط و قوانین پر عمل واجب ہے، تاہم دونوں کی نوعیت کو جدا جدا سمجھے بغیر بہت سی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں، اور ان امور ہی کے درمیان امتیاز کرنے کے لئے ہم مجتہدین امت اور ائمہ فقہاءؒ کی انگلی پکڑ کر چلنے کے محتاج ہیں۔

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هديتنا
وهب لنا من لدنك رحمة انك انت الوهاب

(ماہنامہ بینات جمادی الاخری ۱۳۸۹ھ)

زکوٰۃ کو ٹیکس کہنا اسلام سے مذاق ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہم ان صفحات میں پہلے بھی یہ عرض کر چکے ہیں کہ زکوٰۃ کی حیثیت حکومتی ٹیکس کی نہیں بلکہ یہ ایک مذہبی فریضہ اور عبادت ہے، جس طرح کہ نماز، روزہ اور حج اور دیگر عبادات ہیں، اسی طرح زکوٰۃ بھی ایک عبادت ہے، اور اس کو عبادت نہ کہنا اور ٹیکس کہنا نہ صرف گناہ ہے بلکہ اسلام کے ساتھ ایک کھلا مذاق ہے، قرآن مجید میں متعدد جگہ نماز کی ادائیگی کے ساتھ زکوٰۃ کی ادائیگی کو بیان کیا گیا ہے، اکثر جگہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: اے ایمان والو! تم نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ کو ادا کرو۔ اسی طرح حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لانا اور حضور ﷺ کو آخری نبی تسلیم کرنا اور آپ پر ایمان لانا، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، روزہ رکھنا اور حج بیت اللہ کرنا۔

اس حدیث سے بھی واضح طور پر پتہ چل رہا ہے کہ زکوٰۃ کوئی ٹیکس یا تاوان نہیں بلکہ ایک مذہبی عبادت اور فریضہ ہے، پھر اگر زکوٰۃ کے مصارف پر نظر ڈالی جائے تو خود بخود پتہ چل جاتا ہے کہ زکوٰۃ ٹیکس نہیں، کیونکہ اس کو حکومت کے مصارف پر خرچ کیا جاتا ہے اور زکوٰۃ کو مصارف حکومت پر خرچ نہیں کیا جا سکتا ــــ اگر زکوٰۃ کی

حیثیت ٹیکس کی ہوتی تو ہر شخص کو ذاتی طور پر یہ اختیار نہیں دیا جاتا کہ وہ اموال باطنہ پر اپنی مرضی کے مطابق زکوٰۃ ادا کردے اس کی بھی وصولی حکومت خود کرتی۔

جب حضور ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلافت سنبھالی تو ایک گروہ کی طرف سے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کردیا گیا، اور انہوں نے کہا کہ ہم دیگر تمام فرائض اسلامی کو پورا کریں گے، مگر زکوٰۃ چونکہ ایک ٹیکس ہے اور ٹیکس کی ادائیگی کے لئے ہم تیار نہیں۔ جس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مشورہ دیا کہ اس وقت چونکہ افراتفری کا عالم ہے اس لئے ان کو فی الحال اس طرح رہنے دیجئے اور ان سے لڑائی نہ مول لیجئے، جب حالات سدھر جائیں گے تو ان سے معاملہ کرلیا جائے گا، اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے عمر فاروق سن لیں اگر میرے ساتھ کوئی جانے کے لئے تیار نہ ہوا میں اکیلا ہی ایسے لوگوں سے جہاد کروں گا، جو لوگ زکوٰۃ اور نماز میں تفریق کریں، آج یہ زکوٰۃ کی عبادت کا انکار کرتے ہیں کل نماز اور روزہ اور حج کی عبادت کا انکار کریں گے، ہمارے لئے تمام عبادات برابر ہیں ـــ اگر زکوٰۃ حکومتی ٹیکس ہوتا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ مصلحت کی وجہ سے اس کو کچھ عرصہ کے لئے چھوڑ دیتے، مگر انہوں نے صاف فرمادیا کہ یہ عبادت ہے اور اس کو ختم کرنے کا ہمیں اختیار نہیں، اگر زکوٰۃ ٹیکس ہوتا اور عبادت نہیں ہوتی تو پھر ان ممالک میں جہاں اسلامی نظام قائم نہیں اور نہ ہی مسلمانوں کی حکومت ہے، وہاں کے مسلمان اس ٹیکس کی ادائیگی ذاتی طور پر کیوں کرتے ہیں ان کے لئے اس سے معافی کا اعلان ہونا چاہئے تھا جب وہ لوگ غیر اسلامی حکومت میں بھی اس فریضہ سے سبکدوش نہیں تو معلوم ہوا کہ زکوٰۃ ٹیکس نہیں بلکہ عبادت ہے، ہم ان لوگوں کی خدمت میں گزارش کرنا چاہتے ہیں جو زکوٰۃ کو

عبادت نہیں بلکہ ٹیکس کہتے ہیں کہ خدا کے واسطے آپ اس قوم کے ساتھ مذاق نہ کریں اور ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دیں، پہلے اسلام کے ساتھ تمسخر اڑانے کی وجہ سے ہم بہت تکالیف میں مبتلا ہوچکے ہیں اب خدا خدا کر کے کچھ امید کی کرن نظر آئی ہے، آپ کی ان حرکات کی وجہ سے کہیں اس سے بھی محروم نہ ہوجائیں، خدا تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

(افتتاحیہ صفحہ اقرأ روزنامہ جنگ کراچی ۲/مارچ ۱۹۷۹ء)

زکوٰۃ و عشر کا نفاذ... چند تجاویز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

ملک میں ۵؍جولائی سے زکوٰۃ وعشر کا نظام رائج کیا جارہا ہے، اس سلسلہ میں حکومت کی طرف سے زکوٰۃ کے حکم نامہ کا مسودہ جاری کردیا گیا ہے، اور اس بارے میں حکومت نے ۲۰؍اپریل تک تجاویز طلب کی ہیں، اس کے بعد اس مسودہ کو حتمی شکل دی جائے گی۔

بلاشبہ زکوٰۃ اور عشر کا باقاعدہ نفاذ حکومت کا ایک انقلابی اقدام ہے، چونکہ ایک مدت کے بعد یہ نظام از سرِ نو نافذ کیا جارہا ہے اس لئے قدرتی بات ہے کہ اس راستے میں کچھ مشکلات پیش آئیں گی، جن پر قابو پانا ہوگا۔ کچھ نئے تجربات سامنے آئیں گے جن کی روشنی میں اس نظام کو مستحکم بنانے میں مدد ملے گی، ہم تمام اہل علم اور اہل تجربہ سے درخواست کریں گے کہ اس حکم نامہ کا مسودہ بغور پڑھیں اور حکومت کو اپنی تجاویز سے مطلع کرکے اس کارِ خیر میں جہاں تک ممکن ہو تعاون کریں۔

اس حکم نامہ میں دو چیزیں لائق غور ہیں، ایک یہ کہ زکوٰۃ وعشر سے متعلق شرعی مسائل کو کس حد تک ملحوظ رکھا گیا ہے؟ دوم یہ کہ زکوٰۃ وعشر کی آمد وصرف کے

لئے جو انتظامی ڈھانچہ تشکیل دیا گیا ہے وہ لائق اطمینان ہے یا اس میں مزید کسی بہتر تبدیلی کی تجویز پیش کی جاسکتی ہے؟

جہاں تک شرعی مسائل کا تعلق ہے، ہمیں معلوم ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے فاضل ارکان نے اس پر کافی غور وخوض کیا ہے، اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ پاکستان میں زکوٰۃ وعشر کا نظام احکامِ شرعیہ کے مطابق چلایا جائے، تاہم چند نکات پر ہم مزید غور وفکر کی درخواست کریں گے۔

ا:...... یہ تو ایک معروف مسئلہ ہے کہ عشر، "عشری زمین" پر لیا جاتا ہے اور "خراجی زمین" پر عشر کے بجائے "خراج" وصول کیا جاتا ہے۔ پاکستان کی کل زمینیں عشری ہیں؟ یا بعض عشری اور بعض خراجی؟ اس نکتہ پر شاید اسلامی نظریاتی کونسل نے غور کیا ہوگا، اس بحث پر کونسل کا فیصلہ منظر عام پر آنا چاہئے۔

۲:...... حکم نامہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کی وصولی کے لئے شمسی تقویم کو پیش نظر رکھا گیا ہے جو ملک میں رائج ہے، لیکن شرعی نقطۂ نظر سے زکوٰۃ میں شمسی سال کا اعتبار نہیں بلکہ قمری سال کا اعتبار ہے، حکومت اگر اپنے پورے دفتری نظام میں قمری تقویم رائج نہیں کرسکتی، یا اس میں کچھ مشکلات ہیں تو کم از کم زکوٰۃ وعشر کا جو نظام رائج کیا جارہا ہے اس میں بہرحال قمری سال ہی کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

۳:...... حکم نامہ کے باب اول میں اس حکم نامہ کے اطلاق کی تشریح کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

"اس کا اطلاق صرف مسلمانوں پر اور اس کمپنی یا افراد کی کسی دوسری انجمن پر ہوگا جو خواہ مشمولہ ہو یا نہیں مگر اس کے بیشتر حصص یا اثاثہ جات مسلمانوں کے قبضہ میں ہوں۔"

مسلم وغیر مسلم کی مشترکہ کمپنی میں صرف مسلمانوں کے حصص پر زکوٰۃ عائد

ہونی چاہئے، غیر مسلموں کے حصص پر جو کچھ وصول کیا جائے اسے خراج یا ٹیکس قرار دیا جانا چاہئے۔

۴:...... باب اول دفعہ:۲ فقرہ:ط میں "نصاب" کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"نصاب سے مراد وہ اثاثہ جات ہوں گے جو زکوٰۃ کے معاملے میں ۸۷ء۴۸ گرام خالص سونے کی قیمت کے برابر ہوں۔"

نصاب کی تعیین سونے سے کی جائے یا چاندی سے؟ اس سلسلہ میں فقہاءؒ کی آراء میں قدرے اختلاف ہے، حکومت نے سونے کو نصاب کے لئے معیار قرار دیا ہے جو مناسب معلوم ہوتا ہے، لیکن امام ابوحنیفہؒ کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے حنفی مسلک کے حضرات کو چاندی کی قیمت کے حساب سے باقی ماندہ زکوٰۃ بطور خود ادا کرنی چاہئے۔

۵:...... عشر کے لئے ۵ وسق (۹۴۸ کلوگرام) کا نصاب وضع کیا گیا ہے جن کی پیداوار اس مقدار سے کم ہو، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ان کو عشر بطور خود ادا کرنا چاہئے۔

حکم نامہ میں اس شخص کو بھی عشر کی ادائیگی سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے جو شریعت کے مطابق زکوٰۃ فنڈ سے امداد وصول کرنے کا مستحق ہو، مگر عشر اس کی پیداوار پر بھی واجب ہوگا، اور اس کو اس کی ادائیگی خود کرنی چاہئے۔

حکم نامہ میں اس کی کہیں صراحت نہیں کی گئی کہ زکوٰۃ، نابالغ یا کسی اور غیر مکلف کے مال پر واجب نہیں ہوتی، مگر عشر بالغ ونابالغ اور مکلف وغیر مکلف سب پر واجب ہوتا ہے۔

۶:......ایک اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ زکوٰۃ وعشر کے نظام سے پہلے بلاامتیاز مسلم و کافر سے انکم ٹیکس اور مالیہ وصول کیا جاتا ہے، حکومت کی طرف سے یہ اعلان تو کردیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی اراضی کی پیداوار پر عشر وصول کیا جائے گا اور ان سے مالیہ اور لگان وصول نہیں کیا جائے گا، جبکہ غیر مسلموں کی اراضی پر بدستور مالیہ نافذ رہے گا، لیکن یہ صراحت کہیں نہیں کی گئی کہ مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی اور غیر مسلموں سے انکم ٹیکس لیا جائے گا۔

بلاشبہ زکوٰۃ ایک اہم ترین فریضہ ہے اور ہر مسلمان کو یہ خوشدلی سے بغیر کسی جبر واکراہ کے رضاکارانہ طور پر دینی چاہئے، لیکن اگر مسلمانوں پر زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ انکم ٹیکس کا بوجھ بھی باقی رکھا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان خسارے میں رہے، یا بالفاظ دیگر مسلمان ہونا ایک جرم ہے کہ اس پر زکوٰۃ تو شرعی فریضہ کی حیثیت سے عائد ہوگی ہی مگر اس کو انکم ٹیکس کی شکل میں جرمانہ بھی ادا کرنا ہوگا، یہ طرز عمل ہمارے نزدیک غیر منصفانہ ہے، ہونا یہ چاہئے کہ مسلمانوں پر سے انکم ٹیکس اٹھادیا جائے، اور اگر حکومت کو اپنی ضروریات کے لئے ٹیکس کے سوا کوئی چارہ نہیں تو انکم ٹیکس کے بجائے کوئی دوسرا ٹیکس لگایا جاسکتا ہے جو مسلم وغیر مسلم سب سے وصول کیا جائے۔

۷:......زکوٰۃ کے مصارف قرآن کریم نے خود بیان فرمادیئے ہیں اور ہمیں خوشی ہے کہ زیر نظر حکم نامہ میں اس قرآنی حکم کو بطور خاص ملحوظ رکھا گیا ہے، لیکن اس ضمن میں دو گزارشیں ضروری معلوم ہوتی ہیں:

ایک یہ کہ عاملین زکوٰۃ (یعنی جو عملہ زکوٰۃ کی تحصیل وانتظام میں مصروف ہو) پر بحکم قرآن زکوٰۃ کی رقم خرچ ہوگی، اور یہ بلاشبہ ان کے لئے حلال اور طیب ہے، لیکن آج کل دفاتر کی آرائش وزیبائش اور دیگر لغویات پر بہت سرمایہ ضائع کردیا جاتا ہے، زکوٰۃ فنڈ کے ساتھ یہ بے دردی روا نہیں رکھی جانی چاہئے۔ اس نظام کے

تحت جو عملہ کام کررہا ہو اس کو مناسب اور منصفانہ تنخواہیں ضرور دی جانی چاہئیں، لیکن یہ احتیاط بشدت ملحوظ رہنی چاہئے کہ زکوٰۃ فنڈ کا بیشتر حصہ افسر شاہی کی نظر ہی ہوکر نہ رہ جائے، جیسا کہ محکمہ اوقاف کا تجربہ ہے کہ اوقاف کی رقوم بڑی بڑی تنخواہوں اور دفتروں کی زیبائش پر خرچ کی جاتی ہیں۔

دوسری گزارش اس مضمون میں یہ ہے کہ قرآن کریم نے ایک مد "مؤلفۃ القلوب" کی رکھی ہے، جو ضرورت وقت کے ساتھ مشروط ہے۔ اس زمانے میں غیر مسلم مشنریاں اس "تالیف قلب" پر بے دریغ رقمیں خرچ کررہی ہیں، لیکن مسلمانوں کو اس کی طرف توجہ نہیں، بہت سے نومسلم ایسے ہیں کہ اسلام کی حقانیت کی بنا پر وہ اسلام لے آتے ہیں مگر اپنے سابقہ ماحول سے کٹ جانے کے بعد ان کی نہ حوصلہ افزائی ہوتی ہے نہ ان کی تالیف قلب کا اہتمام کیا جاتا ہے، اسی طرح بہت سے غیر مسلم ایسے ہیں کہ ان کے دل میں اسلام لانے کا جذبہ موجزن ہے مگر وہ اسی خیال سے اس کی جرأت نہیں کرسکتے کہ اپنے موجودہ ماحول سے نکلنے کے بعد وہ کہیں معاشی ابتری کا شکار نہ ہوجائیں۔ اب جبکہ خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے زکوٰۃ وعشر کا نظام جاری کیا جارہا ہے، اس امر کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے اور حکومت کی طرف سے اس کا اعلان بھی ہونا چاہئے کہ اگر کوئی نومسلم فرد یا گھرانہ معاشی پریشانی میں مبتلا ہو تو "زکوٰۃ فنڈ" سے اس کو خود کفیل بنانے میں اولیت دی جائے گی۔ الغرض "زکوٰۃ فنڈ" کو محض غربت وافلاس کے خلاف جہاد کے لئے نہیں وضع کیا گیا بلکہ اس میں مشنری روح بھی کارفرما ہونی چاہئے، اور اس سے نومسلموں کی تقویت، ان کی دیکھ بھال اور تالیف قلب کا بطور خاص اہتمام کیا جانا چاہئے۔

(ماہنامہ بینات کراچی جمادی الاولیٰ ۱۳۹۹ھ)

نظامِ زکوٰۃ و عشر
اور مجلس تحقیق مسائل حاضرہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

بتاریخ ۱۰ر جمادی الاولیٰ ۱۳۹۹ھ کو "مجلس تحقیق مسائل حاضرہ" کا ایک اجلاس دارالعلوم لانڈھی میں منعقد ہوا، جس میں مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی، مولانا محمد رفیع عثمانی، مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی، مولانا محمد تقی عثمانی، مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، مولانا محمد جمیل خان اور راقم الحروف نے شرکت کی۔ اجلاس میں حکومت کے جاری کردہ "زکوٰۃ و عشر" کا حکم نامہ حرفاً حرفاً پڑھا گیا، اور اس کے مندرجات پر طویل غور و خوض کیا گیا، ذیل میں مجلس کی رائے کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

(محمد یوسف لدھیانوی)

۱:...... حکم نامہ کی تمہید میں کہا گیا ہے:

"اور ہر گاہ کہ شریعت اسے مملکت کا فرض قرار دیتی ہے کہ وہ ہر صاحب نصاب مسلمان سے زکوٰۃ اور عشر وصول

کرے، نیز افراد کو یہ اجازت دیتی ہے کہ اس کا جو حصہ مملکت نے وصول نہ کیا ہو اسے اسی مقصد کے لئے صرف کردے۔"

اس میں صرف مملکت کا فرض بتایا گیا ہے، افراد کے فرض کی تصریح نہیں کی گئی، اس لئے اس فقرہ میں یہ ترمیم ہونی چاہئے:

"اور ہرگاہ کہ شریعت ہر صاحب نصاب مسلمان پر (بشمول دیگر شرائط) زکوٰۃ فرض قرار دیتی ہے، اور حکومت پر یہ ذمہ داری عائد کرتی ہے کہ وہ عشر اور اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ کی تحصیل وتقسیم کا انتظام کرے...الخ۔"

۲:......باب اول کی دفعہ: ایک، ذیلی دفعہ (۲) میں کہا گیا ہے:

"اس حکم نامہ کا اطلاق مسلمانوں پر ہوگا، نیز اس کمپنی یا انجمن پر، جو خواہ مشمولہ ہو یا غیر مشمولہ، مگر اس کے بیشتر حصص یا اثاثہ جات مسلمانوں کے قبضے میں ہوں۔"

اس فقرہ میں کمپنی کو "قانونی فرد" قرار دے کر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اگر اس کے بیشتر حصص مسلمانوں کے ہوں تو وہ کمپنی "مسلم" تصور کی جائے گی اور اس پر قانونِ زکوٰۃ کا اطلاق ہوگا، ورنہ وہ "غیر مسلم" ہونے کی وجہ سے قانونِ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوگی۔ شرعی نقطۂ نظر سے اس فقرہ میں حسب ذیل سقم پائے جاتے ہیں:

الف:......کمپنی کو "قانونی فرد" قرار دینا ایک نئی اصطلاح ہے، جس کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں، نہ وہ حصہ داروں کی طرف سے زکوٰۃ ادا کرنے کی مجاز ہے۔

ب:......جس کمپنی میں بیشتر حصص غیر مسلموں کے ہوں اس کے مسلم حصہ داروں کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کرنا غلط ہے۔

ج:......جس کمپنی میں بیشتر حصص مسلمانوں کے ہوں اس کے غیر مسلم حصہ داروں پر قانونِ زکوٰۃ کا اطلاق غلط ہے۔

د:......کمپنی کے تمام مسلم حصہ داروں کا فرداً فرداً صاحب نصاب ہونا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک شرط ہے، دیگر ائمہ کے نزدیک کمپنی کے مشترک قابل زکوٰۃ اثاثہ جات نصاب کی حد کو پہنچتے ہوں تو اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔

مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر ہماری تجویز یہ ہے کہ اس فقرہ میں ترمیم کی جائے۔ بیشتر حصہ داروں کے مسلم یا غیر مسلم ہونے کی تفریق ختم کرکے یہ قرار دیا جائے کہ کمپنی کے مسلم حصہ داروں سے (بشرطیکہ ان کے حصص بقدر نصاب ہوں) زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔

۳:......امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وجوبِ زکوٰۃ کے لئے صاحبِ نصاب کا عاقل و بالغ ہونا شرط ہے، جبکہ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک نابالغ اور فاتر العقل کے مال پر بھی زکوٰۃ لازم ہے۔ اس حکم نامہ میں غالباً یہی مسلک اختیار کیا گیا ہے، اگر مصالح کا تقاضا یہی ہو تو اس کو اختیار کرنے کی گنجائش ہے، تاہم بہتر ہوتا کہ اس حکم نامہ میں اس کی تصریح کردی جاتی، تاکہ عام مسلمانوں کو الجھن نہ ہوتی۔

۴:......اموالِ ظاہرہ واموالِ باطنہ:

باب اول دفعہ:۲ کی ذیلی شق "ب" میں اموالِ باطنہ کی تعریف یہ کی گئی ہے:

"اموالِ باطنہ سے مراد وہ اثاثے ہوں گے جو کوئی شخص عام طور پر منظر عام پر نہ رکھتا ہو، بلکہ نجی حفاظت میں رکھتا ہو، اس میں سونا چاندی اور دوسری قیمتی دھاتیں اور پتھر اور ان سے تیار شدہ مصنوعات، ایسی نقد رقوم جنہیں بینک یا کسی اور ادارے میں جمع نہ رکھا گیا ہو، اور انعامی بانڈز شامل ہیں۔"

اور فقرہ "ج" میں اموالِ ظاہرہ کی تعریف یہ کی گئی ہے:

"اموالِ ظاہرہ سے مراد ایسے اثاثے ہوں گے جو مذکورہ شیڈول میں درج اموالِ باطنہ میں مذکور نہ ہوں۔"

یہاں تین چیزوں پر تنبیہ ضروری ہے:

اول:...... یہ کہ ہم مذاہبِ اربعہ کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اموالِ ظاہرہ و اموالِ باطنہ کی یہ تعریف ائمہ اربعہ کی متفق علیہ تعریف کے خلاف ہے۔ حضرات فقہاء نے "اموالِ ظاہرہ" میں تین چیزوں کو شمار کیا ہے:

۱:...... وہ مویشی جو نسل کشی کے لئے پالے جاتے ہوں اور جنگل میں چرتے ہوں۔

۲:...... مالِ تجارت جو شہر سے باہر لے جایا جائے۔

۳:...... کھیتوں اور باغات کی پیداوار۔

ان تین چیزوں کے علاوہ باقی تمام اموال کو "اموالِ باطنہ" میں شمار کیا گیا ہے، ہم اس بات پر زور نہیں دیتے کہ حکومت اموالِ تجارت، کارخانوں، فیکٹریوں اور کمپنیوں کے قابلِ زکوٰۃ اموال، اور بینکوں میں جمع شدہ رقوم کی زکوٰۃ وصول نہ کرے، کیونکہ ہمارے معاشرے میں عام طور سے ان اموال کی زکوٰۃ ادا کرنے کا رواج نہیں ہے، اور فقہائے امت نے تصریح کی ہے کہ اگر لوگ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ ادا نہ کریں تو حکومت پر لازم ہے کہ وہ ان سے وصول کرے۔

اس لئے ہماری تجویز یہ ہے کہ اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ کی متفقہ تعریف کو تو تبدیل نہ کیا جائے کیونکہ اس سے فقہی اصطلاحات میں تحریف کا راستہ کھل جائے گا، البتہ یہ قرار دیا جائے کہ:

"حکومت عام اموالِ تجارت، کارخانوں اور کمپنیوں کے (قابلِ زکوٰۃ) اثاثہ جات اور بینکوں میں جمع شدہ رقوم کی زکوٰۃ بھی وصول کرے گی، الا یہ کہ کوئی شخص یہ ثبوت فراہم

کردے کہ اس نے بطورِ خود ان چیزوں کی زکوٰۃ ادا کردی ہے۔"

اس ترمیم کے بعد اموالِ ظاہرہ و اموالِ باطنہ کی مسلمہ تعریف میں رد و بدل اور مسخ و ترمیم کی ضرورت بھی نہیں ہوگی، اور حکومت کا مقصد (کہ مسلمان اپنے تمام اموال کی زکوٰۃ ادا کریں) بھی آسانی سے پورا ہوجائے گا۔

دوم:...... یہ کہ ایک طرف تو اس حکم نامہ میں حکومت کی ذمہ داری کا دائرہ بڑھانے کے لئے اموالِ ظاہرہ و اموالِ باطنہ کی تعریف بدل دی گئی ہے، مگر دوسری طرف مویشیوں کی زکوٰۃ کو (جس کی تحصیل و تقسیم شرعاً حکومت کے ذمہ ہے) حکومت کے دائرۂ کار سے یکسر خارج کردیا گیا، اس میں غالباً یہ مصلحت کارفرما ہے کہ تحصیل زکوٰۃ کے عملہ کو پہاڑوں، جنگلوں اور وادیوں میں جانے کی زحمت نہ اٹھانا پڑے۔

یہ صحیح ہے کہ پاکستان میں ایسے مویشیوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں اور یہ بھی درست ہے کہ حکومت اگر ضرورت محسوس کرے تو اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ بھی اربابِ اموال کو بطورِ خود ادا کرنے کی اجازت دے سکتی ہے، مگر اس کو ایک قانونی شکل دے دینا غلط ہے، اور اس کی اصلاح لازم ہے۔

سوم:...... یہ کہ اموالِ زکوٰۃ میں سونا چاندی کے علاوہ قیمتی دھاتوں، پتھروں کی مصنوعات اور سمندری چیزوں کو بھی شمار کرلیا گیا ہے، حالانکہ ان چیزوں پر صرف اس صورت میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جبکہ وہ تجارت کے لئے ہوں، اس لئے ان میں "برائے تجارت" کی تصریح لازم ہے۔

۵:...... نصابِ زکوٰۃ:

باب اول کی دفعہ:۲ کے ذیلی فقرہ "ط" میں کہا گیا ہے:

"نصاب سے مراد وہ اثاثے ہوں گے جو زکوٰۃ کے معاملہ میں ۸۷ء۴۸ گرام خالص سونے کی قیمت کے برابر ہوں۔"

شریعت نے چاندی کا نصاب دو سو درہم (ساڑھے باون تولے)، سونے کا بیس مثقال (ساڑھے سات تولے) مقرر کیا ہے، اگر کسی کے پاس صرف سونا یا صرف چاندی ہو وہ تو اسی مقررہ مقدار کی صورت میں صاحبِ نصاب کہلائے گا۔

البتہ اموالِ تجارت کی قیمت لگاتے وقت سونے کو معیار بنایا جائے یا چاندی کو؟ اس میں فقہاؑ کی آرا میں قدرے اختلاف نظر آتا ہے اور اس میں زیادہ احتیاط کی بات یہ ہے کہ سونے اور چاندی میں سے جس کے نصاب کے برابر بھی مالیت ہو جائے زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اس لئے ہماری تجویز یہ ہے کہ اس بارے میں چاندی کے نصاب کو معیار بنانا قرینِ مصلحت ہے اور اگر حکومت سونے کے نصاب ہی کو معیار ٹھہرانا کسی وجہ سے ضروری سمجھتی ہے تب بھی اربابِ اموال کا فرض ہوگا کہ باقی ماندہ زکوٰۃ بطورِ خود ادا کریں۔

یہی حکم اس صورت میں ہے جبکہ کوئی شخص کچھ چاندی، کچھ سونے، کچھ نقد روپے، کچھ مالِ تجارت کا مالک ہو، ان میں کوئی ایک چیز بھی الگ طور سے بقدر نصاب نہ ہو، لیکن ان سب کی مجموعی مالیت چاندی کے نصاب کے برابر ہو تو اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔

۶:......عطیات:

بابِ اول کی دفعہ:۲ کے ذیلی فقرہ ''ن'' میں کہا گیا ہے:

''صدقات سے مراد رضاکارانہ عطیات اور چندے ہیں۔''

اور بابِ دوم، دفعہ:۳ کی ذیلی شق (۱) میں ''زکوٰۃ فنڈ'' کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''ایک ''زکوٰۃ فنڈ'' قائم کیا جائے گا جس کے کھاتے میں زکوٰۃ، عشر اور صدقات کی تمام تحصیلات جمع کی جائیں گی۔''

شرعی اصطلاح میں ''صدقات'' کا لفظ زکوٰۃ وعشر کے لئے استعمال ہوتا ہے اس لئے رضاکارانہ عطیات اور چندوں کے لئے ''عطیات'' کی اصطلاح اختیار کرنا مناسب ہے۔

نیز ہماری تجویز یہ ہے کہ عطیات کو ''زکوٰۃ فنڈ'' کے کھاتے میں نہ ڈالا جائے بلکہ عطیات کا کھاتہ اور اس کے حسابات بالکل الگ رکھے جائیں، کیونکہ زکوٰۃ کے مصارف میں بہت احتیاط کی ضرورت ہوگی، اور جہاں زکوٰۃ کا صرف کرنا صحیح نہیں وہاں ''عطیات فنڈ'' خرچ کیا جاسکے گا۔ مثلاً کسی سید اور ہاشمی کی خدمت ''زکوٰۃ فنڈ'' سے نہیں کی جاسکتی، زکوٰۃ کسی غیر مسلم کو نہیں دی جاسکتی، رفاہی اداروں پر خرچ نہیں کی جاسکتی، ان تمام مواقع میں ''عطیات فنڈ'' سے خرچ کیا جاسکے گا۔ حکومت کے اہل کاروں کو ان دونوں حسابات کے الگ الگ رکھنے اور خرچ کرنے میں تھوڑی سی پریشانی تو ضرور ہوگی مگر شرعاً الگ الگ حساب رکھنا ضروری ہے، اور اس کے فوائد بہت زیادہ ہیں۔

۷:......مقروض پر زکوٰۃ:

بابِ سوم، دفعہ:۴ کی ذیلی دفعہ (۳) میں کہا گیا ہے:

''زکوٰۃ کے طور پر وصول کی جانے والی رقم کا تعین کرتے ہوئے ان اثاثوں کی قیمت سے جن پر زکوٰۃ وصول کی جائے گی، قرضہ جات کا حساب منہا کرنے کی گنجائش ہوگی جو ضوابط کے ذریعہ متعین کردہ طریقے اور خصوصی حد کے مطابق ہوگی۔

شرط یہ ہے کہ قرضوں کے سلسلہ میں کسی ایسے قرض کی تخفیف کی گنجائش نہیں ہوگی جس کا تعلق ایسے اثاثے سے ہوگا جس پر زکوٰۃ نہ نکلتی ہو۔''

یہ ایک بہت اہم اور پیچیدہ مسئلہ ہے جس سے اس پیراگراف میں تعرض کیا گیا ہے، اس میں معمولی افراط وتفریط بھی سنگین نتائج کی حامل ہوسکتی ہے، جہاں تک ''فقہائے امت'' کے مذاہب کا تعلق ہے، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تو سوائے دَینِ مؤجل کے باقی تمام دیون (قرضے) منہا کرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ امام شافعیؒ کا قولِ قدیم بھی یہی ہے، امام مالکؒ کے نزدیک دَین اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ سے مانع ہے، اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ سے مانع نہیں، اور امام شافعیؒ کا قولِ جدید یہ ہے کہ دَین مطلقاً مانع نہیں۔

حکم نامہ کے مندرجہ بالا پیراگراف میں غالباً اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ ایسے قرض کو منہا قرار دینا ضروری ہے جو عام ضروریاتِ زندگی کی بنا پر ہو، کسی پیداواری جائداد، مسرفانہ اخراجات یا سامانِ تعیش خریدنے کی بنا پر نہ ہو، البتہ عشر مقروض کی پیداوار پر بھی واجب ہے۔

۸:......حیوانات اور سمندر کی چیزوں پر زکوٰۃ:

باب سوم، دفعہ:۴ کی ذیلی دفعہ (۴) میں کہا گیا ہے:

''اموالِ باطنہ، بینکوں اور دوسرے مالی اداروں میں جمع شدہ حساب جاری، حیوانات، مچھلیاں اور سمندر سے پکڑی یا پیدا کی جانے والی اشیاء پر لازمی طور پر زکوٰۃ وصول کی جائے گی، لیکن شق نمبر:(۵) کے تحت وصول کی جاسکے گی۔''

ہم اوپر بتاچکے ہیں کہ جن حیوانات پر زکوٰۃ فرض ہے ان کی وصولی حکومت کی ذمہ داری ہے، اس لئے حیوانات کو لازمی وصولی سے مستثنیٰ کرنا غلط ہے۔

اور یہ بھی اوپر معلوم ہوچکا ہے کہ دریائی پیداوار پر زکوٰۃ واجب نہیں، جب تک کہ اسے فروخت نہ کردیا جائے، فروخت کرنے کے بعد معروف شرائط کے ساتھ ان اشیاء کی رقم پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی، اس لئے ان تمام چیزوں کو اس پیراگراف

سے حذف کردینا ضروری ہے۔

۹:......زائد وصول شدہ رقم کی واپسی:

باب سوم، دفعہ:۴ کی ذیلی دفعہ (۶) میں کہا گیا ہے:

''جب کوئی ایسا شخص جس سے وسائل پر زکوٰۃ وصول کی گئی ہو، یہ ثابت کردے کہ اس سے اس حکم نامہ کے تحت عائد شدہ زکوٰۃ سے زیادہ زکوٰۃ وصول کی گئی ہے تو جو رقم اس نے زائد ادا کی ہوگی واپس کردی جائے گی۔''

اس پیراگراف میں ''اس حکم نامہ کے تحت عائد شدہ زکوٰۃ'' کے بجائے ''شریعت کی عائد کردہ زکوٰۃ'' کا لفظ ہونا چاہئے۔

دوسرے، اگر کسی شخص سے زائد از زکوٰۃ رقم وصول کرلی گئی تو زائد رقم کی واپسی حکومت کا فرض ہے، مگر تجربہ ہے کہ جو چیز ایک بار حکومت کے خزانے میں داخل ہوجاتی ہے پھر اس کا واپس لینا آسان نہیں رہتا۔ خصوصاً سو پچاس روپے کی واپسی کے لئے کون تگ و دو کرتا پھرے گا؟ اس لئے اندیشہ ہے کہ اسے ظلم و استحصال کا ذریعہ نہ بنالیا جائے۔ حکومت کو اس کے انسداد کی ایسی تدبیر کرنی چاہئے کہ ایسا واقعہ کبھی شاذ و نادر صورت کے سوا پیش نہ آسکے، اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کردیا جائے کہ اتنی زائد رقم کو آئندہ سال کی زکوٰۃ میں جمع کرلیا جائے گا۔

۱۰:......عشری اور خراجی زمین:

حکم نامہ کا باب چہارم ''عشر'' سے متعلق ہے، اور یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ ''عشر'' عشری زمین کی پیداوار پر واجب ہوتا ہے، لیکن حکم نامہ میں عشری اور خراجی زمین کی کوئی تمیز نہیں کی گئی، اور نہ ان کی تعریف کی گئی ہے، اس لئے ہمارے نزدیک دفعہ:۶ میں مندرجہ ذیل شق کا اضافہ کیا جانا ضروری ہے:

''عشر، صرف عشری زمین سے وصول کیا جائے گا۔

تشریح:...... مندرجہ ذیل زمینوں کے علاوہ سب زمینیں عشری تصور کی جائیں گی:

الف:...... جو زمینیں غیر مسلم کی ملکیت میں ہوں۔

ب...... ایسی زمینیں جن کا کسی وقت غیر مسلم کی ملکیت میں رہنا معلوم ہو، بشرطیکہ وہ متروکہ جائداد نہ ہو۔''

۱۱:...... ''عشر'' کس شخص پر واجب ہوگا:

اور پھل ... شریعت کے اس قانون کا واضح طور پر منشا یہ ہے کہ ارباب اموال کو فریضۂ زکوٰۃ ادا کرتے ہوئے کسی قسم کی الجھن اور پریشانی لاحق نہ ہو۔

باب چہارم کی دفعہ:۶ کے پیراگراف (۱) میں کہا گیا ہے:

''اس حکم نامہ کی دوسری شرائط کے سوا ہر مالک زمین، ہبہ دار، پٹہ دار یا ٹھیکیدار سے اس کے پیداوار کے حصے پر ۵ فیصد کی شرح سے عشر وصول کیا جائے گا۔''

اس میں دو چیزیں اصلاح طلب ہیں: ایک یہ کہ ۵ فیصد کی شرح سے عشر نہری زمینوں پر وصول کیا جاتا ہے، جبکہ بارانی زمینیں (جن کی سیرابی کنویں، ٹیوب ویل یا نہر کے پانی سے نہ ہوتی ہو) ان پر دس فیصد کی شرح سے عشر واجب ہے۔

دوم یہ کہ عشر ہر اس شخص پر واجب ہوتا ہے جس کے گھر پیداوار جائے، چنانچہ بٹائی کی پیداوار پر مالک اور کسان دونوں کو اپنے اپنے حصے کا عشر ادا کرنا ہوگا۔ اگر حکومت کسانوں سے عشر نہیں لینا چاہتی، یا بارانی زمینوں پر بھی صرف ۵ فیصد کی شرح سے ہی وصول کرنا چاہتی ہے تب بھی مسئلہ کی وضاحت ضروری ہے تاکہ جن پر عشر شرعاً واجب ہو اور وہ حکومت کے قانون سے مستثنیٰ ہو، اسے وہ بطورِ خود ادا کردیں۔

۱۲:...... عشر کی ادائیگی نقد یا بصورتِ جنس؟

باب چہارم دفعہ:۶ کی ذیلی دفعہ (۳) میں کہا گیا ہے:

''عشر نقد وصول کیا جائے گا، جہاں گندم یا دھان کی شکل میں ہو وہاں عشر نقد یا جنس کی شکل میں وصول کیا جائے گا۔''

حکم نامہ کا یہ فقرہ شریعت اسلام کے مزاج سے کوئی میل نہیں کھاتا، جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ شریعت نے ہر چیز کی زکوٰۃ اسی کی جنس سے تجویز فرمائی، نقد میں سے نقد، مویشیوں میں سے مویشی اور غلوں اور پھلوں میں سے غلہ اور پھل اور سبزیوں میں سے سبزی، تاکہ زکوٰۃ وعشر ادا کرنے والے اصحابِ اموال کو فریضۂ زکوٰۃ ادا کرتے ہوئے کسی قسم کی الجھن اور پریشانی لاحق نہ ہو۔

گویا شریعت نے زکوٰۃ وعشر ادا کرنے والے کی سہولت کو سب سے مقدم رکھا ہے۔ اس کے برعکس اس حکم نامہ میں عشر ادا کرنے والوں کے بجائے حکومت کے عملہ کی سہولت ملحوظ رکھی گئی ہے، اور ہمارے نزدیک حکومت کے عملہ کی سہولت کی خاطر عوام کو الجھن میں ڈالنا، ظلم وستم کا دروازہ کھولنے کے ہم معنی ہے، اگر یہ کہا جائے کہ ارباب اموال اپنی جنس فروخت کرکے بآسانی نقد ادائیگی کرسکتے ہیں تو اس کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ جس سہولت کے ساتھ دیہات کے کاشتکار اپنی جنس فروخت کرسکتے ہیں اس سے زیادہ سہولت کے ساتھ حکومت کا عملہ بصورت جنس عشر وصول کرنے کے بعد اسے فروخت بھی کرسکتا ہے۔

بہر حال جنس کو فروخت کرکے نقد ادائیگی کی ذمہ داری کاشتکاروں پر ڈالنا صریح غیر منصفانہ بات ہے، جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی، اس لئے اس فقرہ میں حسب ذیل ترمیم ہونی چاہئے:

''عشر بصورت نقد یا جنس (جس میں بھی ادا کنندہ کو

سہولت ہو) وصول کیا جائے گا۔“

۱۳:......عشر کا نصاب:

باب چہارم، دفعہ:٦ کی ذیلی دفعہ (۴) میں عشر کا نصاب ۵ وسق (۹۴۸ کلوگرام) گندم یا اس کے مساوی قیمت کو قرار دیا گیا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک زمین کی تمام پیداوار پر، خواہ کم ہو یا زیادہ، عشر واجب ہے، البتہ ۵ وسق سے کم مقدار کا عشر حکومت وصول نہیں کرے گی، بلکہ مالکان کو خود ادا کرنا چاہئے، لیکن تمام اشیأ کے لئے گندم کے ۵ وسق کو نصاب قرار دینا بالکل غلط ہے، کیونکہ جو چیزیں وسق کے تحت آتی ہیں ان میں سے ہر ایک چیز کا نصاب خود اس کے پانچ وسق ہوں گے، نہ کہ گیہوں کے۔

البتہ جو چیزیں وسق کے تحت نہیں آتیں (مثلاً کپاس اور گنے کی فصل) اس کے بارے میں امام ابویوسفؒ کا فتویٰ یہ ہے کہ سب سے کم قیمت جنس کے ۵ وسق کی قیمت کو نصاب مقرر کیا جائے گا، اور جدید دور کے بعض علمأ (مثلاً شیخ یوسف القرضاوی صاحب) ”فقہ الزکوٰۃ“ کی رائے یہ ہے کہ متوسط قیمت کی جنس کے ۵ وسق کو نصاب تصور کرنا چاہئے۔ اس رائے پر اعتماد کرتے ہوئے کپاس، گنا اور اس قسم کی غیر منصوص چیزوں کے لئے گندم کو معیار بنایا جاسکتا ہے مگر منصوص و غیر منصوص تمام اشیأ کے لئے گندم کی قیمت کو معیار بنا دینا غلط ہوگا، اس لئے ہمارے خیال میں اس حکم نامہ کے مرتب کرنے والے حضرات نے حکومت کے عملہ کی سہولت کے لئے ”ناروا اجتہاد“ سے کام لیا ہے۔

۱۴:......زکوٰۃ وعشر کے مصارف:

باب ششم میں ”زکوٰۃ فنڈ“ کے مصارف کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس رقم سے قرض لے کر غریبوں کے فائدے کے لئے ہسپتال اور تعلیمی، صنعتی اور

پیشہ وارانہ تربیت کے ادارے قائم کئے جائیں گے:

”اور اس قرض کی ادائیگی ایک عرصے میں ان لوگوں سے وصول کردہ فیس سے کی جائے گی جو ان اداروں سے سہولتیں حاصل کریں گے، سوائے ان لوگوں کے جو زکوٰۃ اور عشر کے مستحق ہوں۔“

”زکوٰۃ فنڈ“ سے قرض لے کر اس قسم کے ادارے قائم کرنا صحیح نہیں، جیسا کہ ہم اس سے پہلے عرض کرچکے ہیں، حکومت کو ”عطیات فنڈ“ کا حساب الگ رکھنا چاہئے اور اس قسم کے اداروں کے لئے ”عطیات فنڈ“ سے قرض لیا جانا چاہئے، کیونکہ ایسے اداروں سے مسلم و غیر مسلم اور غنی و فقیر سب ہی مستفید ہوں گے، اور یہ بات فقرأ کے لئے فائدہ مند نہیں بلکہ ان کی حق تلفی ہے کہ جو مال اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے مخصوص کیا تھا اس سے غیر مستحق لوگوں کو مستفید کیا جائے، اس لئے ”زکوٰۃ فنڈ“ سے قرض لے کر اسے غیر مصرف پر خرچ کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ البتہ ہسپتال یا دیگر رفاہی اداروں سے غربأ کے مستفید ہونے کے لئے ”زکوٰۃ فنڈ“ کا ایک حصہ بایں طور مخصوص کیا جاسکتا ہے کہ اس سے غربأ کی فیس، ادویات اور دیگر ضروریات مہیا کی جائیں۔

۱۵:......عاملین زکوٰۃ کی تنخواہیں:

باب ششم، دفعہ:۱۵ میں زکوٰۃ کے مصارف میں ”زکوٰۃ وعشر کی تحصیل کے اخراجات اور نظم ونسق“ کو بھی شمار کیا گیا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ زکوٰۃ وعشر کی فراہمی کے اخراجات اور اس کے عملہ کی تنخواہیں اسی فنڈ سے ادا ہوں گی، لیکن یہ مال جو خالص فقرأ ومساکین کے لئے مختص ہے، دفاتر کی تزئین وآرائش اور جدید تمدن کے غیر ضروری مسرفانہ اخراجات پر خرچ نہیں ہونا چاہئے، ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس مال میں فقرأ ومساکین کا حصہ تو کم ہی

لگے گا، بیشتر رقم "نظم ونسق" ہی کی نذر ہوکر رہ جائے گی جیسا کہ اوقاف کے حکومت کی تحویل میں جانے کے بعد اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے کہ وقف کا مال بڑی بڑی تنخواہوں، دفتروں کی آرائش اور افسروں کی آسائش پر بے دریغ خرچ کیا جارہا ہے۔ فقہائے امت نے تصریح کی ہے کہ اگر تحصیل زکوٰۃ کے مصارف، زکوٰۃ کی مجموعی مالیت کے نصف سے بھی بڑھ جائیں تو حکومت کو اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہئے بلکہ لوگوں کو بطورِ خود زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم کرنا چاہئے۔

۱۶:...... نومسلم فقراء کی خصوصی اہمیت:

یہاں ہم یہ سفارش بھی کریں گے کہ "زکوٰۃ فنڈ" میں یوں تو تمام مسلمان، فقراء و مساکین کا حق ہے، مگر جو لوگ اسلامی برادری میں نئے نئے شامل ہوئے ہیں اور وہ "زکوٰۃ" کے مستحق بھی ہوں ان کو خصوصی اہمیت دی جائے، اور ان کو معاشی طور پر خود کفیل بنانے میں سب سے پہلے مدد دی جائے، کیونکہ اکثر نومسلم حضرات کو اپنے پہلے ماحول سے الگ ہونے کے بعد معاشی الجھن پیش آتی ہے، حکومت کی طرف سے ایک خصوصی مد ان کے لئے ہونی چاہئے، اور اس کا باقاعدہ اعلان بھی کردیا جائے تو بہتر ہے۔

۱۷:...... زکوٰۃ ادا کرنے والے کی صوابدید:

باب ہفتم، دفعہ:۱۶ میں کہا گیا ہے کہ:

"ہر وہ شخص جو باب ششم میں مخصوص کردہ مقاصد کے لئے زکوٰۃ یا عشر ادا کرتا ہے وہ حق دار ہوگا کہ:

(الف):...... ایڈمنسٹریٹر جنرل یا اس کے نامزد کردہ فرد سے کہے کہ اس کی ادا کردہ رقم کا ایک حصہ جو پندرہ فیصد سے زائد نہ ہو اس کے بتائے ہوئے اداروں کو ادا کیا جائے۔ یا

(ب):...... یہ ثبوت بہم پہنچا کر کے وہ اتنی رقم مذکورہ مقصد کے تحت صرف کرچکا ہے اس کی واپسی کا مطالبہ کرے۔"

یہ طریقہ جو تجویز کیا گیا ہے غیر منصفانہ ہے، اس لئے کہ زکوٰۃ ادا کرنے والے کو یہ علم نہیں ہوگا کہ اس کی درخواست قبول کرلی گئی یا نہیں؟ اور ایک بار حکومت کے خزانے میں زکوٰۃ جمع کرانے کے بعد اس کی واپسی کا مطالبہ کرنا بھی اچھا خاصا دردِ سر ہے، اس کے بجائے منصفانہ تجویز یہ ہوگی کہ اگر کوئی شخص یہ ثبوت فراہم کردے کہ وہ اس قدر زکوٰۃ خود ادا کرچکا ہے تو حکومت زکوٰۃ کا اتنا حصہ وصول نہیں کرے گی، نیز پندرہ فیصد کی مقدار کم ہے، اگر حکومت زکوٰۃ ادا کرنے والوں کو یہ حق دینا چاہتی ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے موافق بھی زکوٰۃ کا کچھ حصہ ادا کریں تو اس مقدار کو بڑھا کر کم از کم پچیس فیصد کردینا چاہئے۔

۱۸:...... چند ضروری سفارشات:

آخر میں نظام زکوٰۃ وعشر کے سلسلہ میں ہم چند ضروری سفارشات پیش کرنا چاہتے ہیں:

۱:...... زمین کی پیداوار تو جب بھی حاصل ہو اس پر عشر واجب ہے، مگر وجوب زکوٰۃ کے لئے مال پر سال گزرنا شرط ہے، اور سال سے مراد قمری سال ہے، شمسی سال نہیں۔ ہمارے ملک کا سارا نظام چونکہ شمسی تقویم کے مطابق چل رہا ہے اس لئے اس کا امکان ہے "زکوٰۃ وعشر کا نظام" بھی اسی کے مطابق چلایا جائے، مگر یہ صحیح نہیں ہوگا، اس لئے ہم سفارش کرتے ہیں کہ اگر ملک کے پورے نظام کو قمری تقویم کے مطابق نہیں چلایا جاسکتا تو زکوٰۃ وعشر کے نظام میں بہرحال قمری سال کا ہی اعتبار کیا جائے، اور حکم نامہ میں اس کی وضاحت کردی جائے۔

۲:...... تحصیل زکوٰۃ میں کسی غیر مسلم کی خدمات حاصل نہیں کی جاسکتیں، مگر حکومت نے جو انتظامی ڈھانچہ تشکیل دیا ہے اس میں قوی امکان اس بات کا ہے کہ

انتظامیہ کے کچھ ممبر غیر مسلم بھی ہوں گے۔ ہم اس کو حدودِ شرعیہ سے تجاوز سمجھتے ہیں، اس لئے حکم نامہ میں اس کی صراحت کردی جائے کہ کسی غیر مسلم کو کسی سطح پر بھی زکوٰۃ و عشر سے متعلق انتظامیہ میں شریک نہیں کیا جائے گا۔

۳:......سید اور ہاشمی کو بھی زکوٰۃ دینا جائز نہیں، اسی طرح ان کو تحصیل زکوٰۃ کے کام پر مامور کرکے ان کی تنخواہ "زکوٰۃ فنڈ" سے دینا بھی جائز نہیں۔

اس لئے ہم سفارش کرتے ہیں کہ جو سید اور ہاشمی حضرات اعانت و امداد کے مستحق ہوں ان کی خدمت "عطیات فنڈ" سے کی جائے، اور ان کو زکوٰۃ و عشر کی تحصیل کے انتظام میں نہ لگایا جائے۔

۴:......زکوٰۃ کے مسائل بہت نازک ہیں، اور ہمارے بیشتر افسران مسائل شرعیہ سے بالکل ناواقف ہونے کے باوجود اپنے آپ کو "مجتہد مطلق" تصور کرتے ہیں، ان سے یہ توقع بے جا نہیں کہ وہ اپنی سہولت کی خاطر "مسائل شرعیہ" سے انحراف کو معمولی بات تصور کریں۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ اس مقدس فریضۂ اسلام کو افسروں کے غلط اجتہاد سے پاک رکھا جائے، اور اسلامی نظریاتی کونسل اور ملک کے دیگر محقق علمأ سے مسائل معلوم کرکے ان کی پابندی کو لازم سمجھا جائے، اس کا ایک آسان طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ علمأ اسلام کا ایک بورڈ مقرر کرکے زکوٰۃ و عشر کے تمام ضروری مسائل کتابی شکل میں مدون کرائے جائیں اور پورے عملے کو ہدایت کی جائے کہ وہ ان کی پابندی کرے، ورنہ مسائل سے ناواقف حضرات نے اپنے بے ہنگم اجتہاد سے کام چلایا تو اس کا وبال بڑا سخت ہوگا۔

۵:......فریضۂ زکوٰۃ کے نفاذ کے بعد انکم ٹیکس کا باقی رکھنا بہت سی قباحتوں کو جنم دے گا، ہماری سفارش ہے کہ انکم ٹیکس کو ختم کردیا جائے، اور اس کی جگہ حکومت کے مصارف کے لئے کوئی اور ٹیکس اس طرح لگایا جائے کہ اس میں چوری کا رجحان پیدا نہ ہو، اور وہ زکوٰۃ کے نظام کو متاثر نہ کرے۔

۶:......جس طرح مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے، اسی طرح غیر مسلموں سے جزیہ وصول کرنا بھی قرآن کریم کا حکم ہے، ہماری سفارش ہے کہ ایک منصفانہ شرح کے ساتھ غیر مسلموں سے جزیہ وصول کیا جائے جسے حکومت کی ضروریات کے علاوہ غیر مسلم برادری کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا جاسکے۔ حکومت چاہے تو اس کا نام "رفاہی ٹیکس" تجویز کرسکتی ہے، یہ ایک شرعی فریضہ ہے اور اسلام کے مالیاتی نظام میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔

(ماہنامہ بینات کراچی جمادی الاخریٰ ۱۳۹۹ھ)

زکوٰۃ و عشر کے حکم نامہ کے بارے میں
چند ضروری تجاویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غیر مسلم جس طرح بے دریغ روپیہ خرچ کر رہے ہیں وہ کسی ایسے شخص کی نظر سے اوجھل نہیں جس کی آنکھیں بند نہ ہوں۔ اس کے برعکس مسلمانوں کو اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں حکومتی سطح پر، اور نہ عوامی سطح پر۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جو غیر مسلم افراد اسلام کی خوبیوں سے متاثر ہو کر اسلام کے حلقہ بگوش ہو جاتے ہیں ان کی مناسب پذیرائی نہیں ہوتی، وہ بے چارے اپنے سابقہ ماحول سے کٹ گئے ہوتے ہیں، مگر ہماری طرف سے نہ ان کی حوصلہ افزائی کا انتظام کیا جاتا ہے۔ نہ "تالیف قلب" کا اہتمام ہوتا ہے۔ بہت سے ایسے بھی ہیں کہ ان کے دل میں اسلام لانے کا جذبہ موجزن ہے مگر یہ اندیشہ ان کے لئے سدراہ بن جاتا ہے کہ کہیں وہ اسلام لانے کے بعد معاشی ابتری کا شکار نہ ہو جائیں، اب جب کہ خدا کے فضل و کرم سے ملک میں نظام زکوٰۃ و صدقات کو منظم کیا جا رہا ہے، تو اس کی طرف بطور خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے، ہماری تجویز یہ ہے کہ "زکوٰۃ میں ایک خصوصی مد ان نومسلم حضرات کے لئے رکھی جائے۔ اور اگر وہ اسلام لانے کے بعد امداد اور تعاون کے محتاج ہوں تو ان کو خود کفیل بنانے اور معاشرے میں باعزت مقام دلانے پر یہ رقم صرف کی جائے، بلکہ حکومت کی طرف سے یہ اعلان کر دیا جائے کہ اگر کوئی نومسلم فرد یا خاندان معاشی طور پر پریشان

ہوتو اسے خودکفیل بنانے میں سب سے زیادہ فوقیت دی جائے گی۔

''زکوٰۃ وعشر کا نظام'' صرف غربت و افلاس کے خلاف جہاد ہی نہیں، بلکہ اس میں اصل روح بھی کارفرما ہونی چاہئے۔ اور اس سے نومسلموں کی اعانت، دیکھ بھال اور تالیف قلب کا بطور خاص انتظام کیا جانا چاہئے۔

اس حکم نامہ میں کہا گیا ہے کہ ''زکوٰۃ فنڈ'' سے قرض لے کر اسپتال اور غرباءؑ کی ضروریات کے لئے دیگر رفاہی ادارے تعمیر کئے جائیں گے، بعد میں فیس وغیرہ کے ذریعہ یہ رقوم وصول کرکے ''زکوٰۃ فنڈ'' میں لوٹا دی جائیں گی۔

زکوٰۃ فنڈ سے قرض لینے کا مسئلہ خاصا کھٹکتا ہے، ہمیں امید ہے کہ علمائے کرام اس کی فقہی حیثیت پر روشنی ڈالیں گے۔ ہمارے خیال میں اس قسم کے رفاہی اداروں کی تعمیر زکوٰۃ فنڈ کے بجائے رضا کارانہ عطیات سے کی جانی چاہئے، کیونکہ ایسے اداروں سے مسلم وغیرمسلم اور امیر وغریب سب مستفید ہوں گے اس لئے ہونا یہ چاہئے کہ ان اداروں میں کسی نادار اور غریب مسلمان پر جو مصارف اٹھیں وہ زکوٰۃ فنڈ سے ادا کئے جائیں اور اسی طرح نادار طلبہ کے تعلیمی وفنی مصارف اس فنڈ سے ادا کئے جائیں۔

ایک اہم ترین مسئلہ یہ ہے حکومت نے مسلمانوں کے اموال پر زکوٰۃ کی وصولی کا قانون بنایا ہے، مگر پاکستان کی آبادی میں ایک بڑی تعداد غیرمسلم حضرات کی بھی ہے۔ مسلمانوں کی طرح غیرمسلم افراد کی بوقت ضرورت کفالت کی ذمہ داری بھی حکومت پر عائد ہوتی ہے، یہ تو ظاہر ہے کہ اس ذمہ داری کو حکومت زکوٰۃ فنڈ سے پورا نہیں کرسکتی۔ اس کے لئے انصاف یہ ہے کہ زکوٰۃ کے متبادل غیرمسلموں سے ''جزیہ'' وصول کیا جائے۔ جس طرح زکوٰۃ وعشر کی تحصیل کا حکم قرآن کریم نے دیا ہے۔ اسی طرح غیرمسلموں سے ''جزیہ'' وصول کرنے کا حکم بھی قرآن کریم نے دیا

ہے۔ اور اگر حکومت اس احساس کمتری پر ''جزیہ'' کے نام سے گھبراتی ہے تو اسے ''رفاہی ٹیکس'' کا نام دیا جاسکتا ہے۔

بہرحال مسلمانوں سے واجبات شرعی وصول کرنا اور غیرمسلموں سے واجبات شرعی وصول نہ کرنا ایک ایسی بے انصافی ہے جس کی اسلامی نظام میں کوئی گنجائش نہیں۔ ہم صدر، وزارت خزانہ اور اسلامی نظریاتی کونسل کے فاضل ارکان کی اس فریضہ کی طرف خصوصی توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں۔

زکوٰۃ وعشر کا نظام نافذ ہونے کے بعد ملک میں یہ مسئلہ خاص طور سے گفتگو کا موضوع بنا ہوا ہے کہ آیا اب انکم ٹیکس باقی رکھنے کا جواز ہے یا نہیں؟ اخبارات میں مختلف آراءؑ کا اظہار کیا جارہا ہے۔ بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کی وصولی کے بعد انکم ٹیکس کا بوجھ ناروا بھی ہے اور ناقابل برداشت بھی، اس لیے اس کا کوئی جواز نہیں۔ پس جس طرح حکومت نے عشر وصول کرنے کے بعد زمینداروں پر سے لگان ہٹا دیا ہے اسی طرح اہل دولت سے انکم ٹیکس ہٹا دینا چاہئے۔ اس کے برعکس بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ زکوٰۃ صرف غریب غرباءؑ کے لئے ہے، اور انکم ٹیکس کے ذریعے حکومت کے مصارف چلائے جاتے ہیں، اگر یہ ٹیکس ہٹادیا جائے، تو حکومت کے مصارف کہاں سے چلیں گے۔

یہ دونوں موقف اپنی اپنی جگہ وزنی ہیں لیکن اس سلسلہ میں اس نکتہ کوملحوظ رکھنا چاہئے کہ انکم ٹیکس کی چوری کا رجحان ہمارے معاشرے میں عام ہے اور حکومت کو اس بات کا بھی اعتراف ہوگا کہ وہ اس ''لاعلاج مرض'' کا علاج نہ کرسکی ہے، اور نہ کرسکتی ہے، اس لئے زکوٰۃ اور انکم ٹیکس دونوں کو ایک ساتھ رکھا گیا تو اندیشہ ہے کہ لوگ انکم ٹیکس کی طرح زکوٰۃ کی بھی چوری شروع کردیں۔

پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلہ میں ابتدائی اقدامات کا اعلان کرتے ہوئے ۱۲ ربیع الاول ۱۳۹۹ھ کو صدر مملکت جنرل محمد ضیاءُ الحق نے ۵ جولائی سے ملک میں زکوٰۃ وعشر کے نظام کے نفاذ کا وعدہ فرمایا تھا۔ حکومت کی جانب سے اس کا مسودۂ قانون پیش کردیا گیا ہے اور قوم کے دانشوروں اور اسلامی قانون کے ماہرین سے اپیل کی گئی ہے کہ اگر اس میں کسی اصلاح وترمیم کی ضرورت ہو تو ۳۰ اپریل تک اس کی نشاندہی کی جائے اور مفید تجاویز پیش کی جائیں تاکہ ان کی روشنی میں اس مسودۂ قانون کو آخری شکل دی جاسکے۔ ہمیں توقع ہے کہ تمام اہل علم و دانش اس میں خصوصی دلچسپی کا اظہار کریں گے اور حکومت سے مکمل تعاون کریں گے۔ اس حکم نامہ کے پورے متن کا مطالعہ کرنا اسلامی قانون کے ماہرین کا کام ہے لیکن ہم ان سطور میں اسلامی نظریاتی کونسل کے فاضل ارکان اور وزارت قانون کو بعض امور کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں۔

کسی نظام کی کامیابی کا انحصار سب سے زیادہ اس بات پر ہے کہ یہ نظام جن ہاتھوں میں دیا گیا ہے وہ اس کی روح ومزاج سے کس حد تک مناسبت رکھتے ہیں، ان میں اہلیت وصلاحیت کے علاوہ دیانت وامانت، فرض شناسی، دلچسپی کس حد تک ہے۔

یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی ہے کہ حکومت کے جاری کردہ مسودۂ قانون میں عشر کی وصولی، نگہداشت اور تقسیم کے لئے جو انتظامی ڈھانچہ تشکیل دیا گیا ہے، اس میں زیادہ زور اس مشینری کی انتظامی صلاحیت پر دیا گیا ہے۔ لیکن اس مقدس نظام کو کامیابی سے چلانے کے لئے جس علم و دانش، جس اہلیت وصلاحیت اور جس للّٰہیت وتقویٰ کی شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری تھا ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی

گئی۔ خصوصاً ضلع، تحصیل، تعلقہ، یا مقامی سطح کی تشکیل جس انداز میں کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقدس نظام موجودہ بیوروکریسی کے کل پرزوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا ہے، جن میں بہت سے لوگ دیانت وامانت کے معیار پر تو کیا پورا اتریں گے، اس کا بھی امکان قوی ہے کہ وہ سرے سے مسلمان ہی نہ ہوں۔

مرکزی کونسل اور صوبائی کونسلوں میں موجودہ انتظامیہ کی گرفت ہی مضبوط نظر آتی ہے، جس سے یہ توقع موہوم ہوجاتی ہے کہ وہ اس مقدس نظام کو ٹھیک ٹھیک شرعی اصولوں کے مطابق چلاسکیں گے اور اپنے برخود غلط "اجتہاد" کے ذریعہ اس مقدس نظام کی مٹی پلید نہیں کریں گے۔

اس حکم نامہ میں اس بات کی طرف کہیں اشارہ تک بھی نہیں کیا گیا کہ اس انتظامی ڈھانچہ کے جو افراد اس مال میں کسی خیانت کے مرتکب ہوں گے، یا حدود شرعیہ سے تجاوز کریں گے ان کے خلاف کوئی تعزیری کاروائی بھی کی جاسکتی ہے۔ ایسی انتظامیہ کے ہاتھوں یہ مقدس نظام خدانخواستہ ناکام ہوجاتا ہے، یا وہ اپنے مطلوبہ نتائج صحیح ظاہر نہیں کرتا، تو عوام اس کو اس نظام کی ناکامی پر محمول کریں گے، حالانکہ یہ ناکامی نہیں بلکہ انتظامیہ کی نااہلی کا ثبوت ہوگا۔

زکوٰۃ وعشر کے مصارف قرآن کریم نے واضح طور پر متعین کردئے ہیں۔ یہ مقام مسرت ہے کہ صدر محمد ضیاءُ الحق نے ان مصارف کو شدت کے ساتھ ملحوظ رکھنے کے عزم کا بھی اعلان فرمایا ہے۔ لیکن اس ضمن میں چند گزارشات ضروری ہیں، یہ کہ قرآن کریم کے ذکر کردہ آٹھ مصارف میں سے ایک مد "عاملین زکوٰۃ" کی ہے، جن حضرات کے اوقات زکوٰۃ وعشر کی تحصیل و انتظام میں صرف ہوں گے بلاشبہ ان پر زکوٰۃ ہی کی رقم صرف ہوگی اور ان کی تنخواہیں اسی فنڈ سے ادا کی جائیں گی، یہ ان کے

لئے بلاشبہ حلال وطیب ہے، مگر آج کل دفاتر کی تزئین وآرائش اور دیگر لغویات پر قومی سرمایہ بے دریغ خرچ کرنے کی جو عادت سی ہوگئی ہے زکوٰۃ فنڈ کے ساتھ یہ بیدردی روا نہیں رکھی جانی چاہئے۔ اس نظام کے تحت جو عملہ کام کر رہا ہو اس کو مناسب اور منصفانہ تنخواہیں ضرور دی جائیں۔ لیکن احتیاط بشدت ملحوظ رہے کہ "زکوٰۃ فنڈ" کا بیشتر حصہ انہی اللوں تللوں کی نذر نہ ہوکر رہ جائے۔ اگر افسر شاہی کو اس کے مخصوص شاہانہ مزاج کے مطابق غیر ضروری مصارف پر اس رقم کو خرچ کرنے کی اجازت دیدی گئی تو اندیشہ یہ ہے کہ غریب غرباً تک ان کا حق بہت ہی محدود مقدار میں پہنچے گا۔ اور اس نظام سے غریبوں کی خوش حالی اور خود کفالتی کی جو توقعات وابستہ کی گئی ہیں وہ سب خاک میں مل جائیں گی۔

۳.....قرآن کریم کے ذکر کردہ مصارف میں ایک مد "مؤلفۃ القلوب" کی ہے، جو ضرورت کے ساتھ مشروط ہے۔

اس زمانے میں غیر مسلم اقوام اور ان کے مشنری ادارے مسلمانوں کا ایمان خراب کرنے اور زکوٰۃ سے بچنے کے لئے زکوٰۃ کی چوری کا معمول بھی اپنائیں گے۔ اس طرح خدا تعالیٰ کے مقدس فریضہ میں خیانت کرکے بد دیانتی اور بے ایمانی کے مرتکب ہوں گے۔

ہماری تجویز یہ ہے کہ موجودہ انکم ٹیکس کو تو بالکل اٹھا دیا جائے۔ اور حکومت کے مصارف کی ضروریات کے لئے کوئی اور ٹیکس تجویز کیا جائے۔ اور اس کا طریقہ کار ایسا رکھا جائے کہ لوگ نہ تو زیادہ گرانی محسوس کریں اور نہ اس سے گریز پائی کے لئے راستہ تلاش کرنے کی ضرورت محسوس کریں۔ بہرحال یہ ایک بہت ہی اہم اور نازک مسئلہ ہے جس سے زکوٰۃ کا نظام متاثر ہوسکتا ہے۔ اس لئے حکومت کو اس پر غور کرنا

چاہئے۔

یہ مسئلہ تو غالباً ہر شخص کو معلوم ہوگا کہ زکوٰۃ میں قمری سال کا اعتبار ہے۔ شمسی سال کا نہیں، لیکن حکم نامہ میں کہیں اس کی تصریح نہیں کی گئی، اور چونکہ ملک کا سارا نظام شمسی تقویم کے مطابق چل رہا ہے اس لئے قیاس یہ ہے کہ شاید زکوٰۃ میں بھی اسی پر عمل ہوگا۔ حکومت اگر ملک کے سارے نظام کو قمری تقویم کے مطابق چلانے سے قاصر ہے (حالانکہ وہ زیادہ مشکل کام نہیں ہے، بلکہ عرب ممالک میں یہی نظام رائج ہے) تو کم از کم زکوٰۃ کے نظام کو قمری تقویم کے مطابق چلانے کا اعلان ہونا ضروری ہے۔

(افتتاحیہ صفحہ اقرأ روزنامہ جنگ کراچی ۱۳ اپریل ۱۹۷۹ء)

نظامِ زکوٰۃ کا نفاذ اور انکم ٹیکس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلے حکومت کی جانب سے نظام زکوٰۃ و عشر کے خاکے کا ابتدائی مسودہ جاری کیا گیا تھا، اور عوامی حلقوں سے اس کے بارے میں تجاویز طلب کی گئی تھیں۔ ہم نے بھی اس کی متعدد خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے، اصلاحی تجاویز پیش کی تھیں تاحال زکوٰۃ کا نظام قطعی شکل میں سامنے نہیں آیا، اور نہ ہی یہ معلوم ہوسکا ہے کہ ارباب اقتدار نے ان ارسال کردہ تجاویز کا خیر مقدم کس شکل میں کیا ہے؟ تاہم شنید ہے کہ یکم جولائی کو زکوٰۃ و عشر کا قانون نافذ کیا جارہا ہے۔ ہم ایک بار پھر اس گزارش کا اعادہ ضروری سمجھتے ہیں، کہ اس قانون میں فقہی یا انتظامی نقطۂ نظر سے جو خامیاں تھیں اور جن کی نشاندہی کی جاچکی ہے اُن کو جوں کا توں برقرار رکھنے پر اصرار نہ کیا جائے، بلکہ ان خامیوں اور نقائص کی اصلاح کرکے زکوٰۃ و عشر کے قانون کو شریعت اسلامیہ کے ہم آہنگ کرنے کی مخلصانہ کوشش کی گئی لہٰذا زکوٰۃ و عشر کا نظام ایسے امانتدار ہاتھوں میں دیا جائے جن کے اخلاق و کردار پر بھروسہ کیا جاسکے۔

زکوٰۃ و عشر کے نظام کے ساتھ یہ سوال بھی شدت سے ابھرا ہے کہ کیا قانون زکوٰۃ اور انکم ٹیکس اس اسلامی معاشرے میں پنپ سکتا ہے؟ اور یہ کہ انکم ٹیکس نظام کی بدعنوانیاں کیا اس نظام کو تو متاثر نہیں کریں گی؟

ہمارے سیاسی راہنماؤں اور تاجر طبقہ کی رائے یہ ہے کہ انکم ٹیکس کا موجودہ

فرسودہ نظام اس نظام کو بھی لے ڈوبے گا، اس لئے ان حلقوں کی طرف سے بار بار اس مطالبہ کا اعادہ کیا جاچکا ہے کہ انکم ٹیکس کے موجودہ نظام کو ختم کیا جائے۔

دو باتیں ایسی واضح ہیں کہ ان کا انکار کسی کے لئے ممکن نہیں، ایک یہ کہ حکومت کے ذمہ مالیاتی مطالبوں کو پورا کرنے کے لئے اسے ٹیکس کی ضرورت ہے، جو اسے ہر صورت ملنا چاہئے۔ دوسرے یہ کہ انکم ٹیکس کا موجودہ نظام ایسا فرسودہ، اس قدر ظالمانہ ہے کہ اسے جوں کا توں برقرار رکھنا کسی طرح بھی قرین انصاف نہیں، ''قیصر کا حصہ قیصر کو دو اور خدا کا حصہ خدا کو'' کے غیر اسلامی اصول کی بنیاد پر یہ ظالمانہ نظام انگریز نے رائج کیا تھا۔ اور حکومت بھی اس بات سے اچھی طرح آگاہ ہے کہ یہ نظام ایسا غلط ہے کہ کوئی شخص ایمانداری کے ساتھ اس نظام کے ماتحت ٹیکس ادا نہیں کرسکتا ہے اور نہ انصاف و دیانت کے ساتھ اس کے کارندے اسے وصول کرتے ہیں، یہ جو کچھ ہے، اس عام بدعنوانی کا نتیجہ ہے۔ اگر کوئی شخص بہت ہی امانتدار ہو اور سب کچھ ٹھیک ٹھیک بلاکم و کاست بتا ہی دے تب بھی انکم ٹیکس کے افسران یہ سمجھتے ہیں کہ اس نے اپنی نصف آمدنی ظاہر کی ہوگی۔ اس لئے وہ اس کی بتائی ہوئی مالیت سے زیادہ کا ٹیکس تجویز کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں کس کا حوصلہ ہے کہ وہ انکم ٹیکس کے ظالمانہ سیلاب سے اپنی دیانت و امانت کی دیواریں محفوظ رکھ سکے؟

سرکاری اہل کاروں کو ''بالائی آمدنی'' کا ایسا چسکا ہے کہ وہ اپنے واجبات بھی ٹیکس دہندگان کے ذمہ لگا دیتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کے ذمہ دس ہزار روپیہ انکم ٹیکس نکلتا ہے، تو سرکاری اہل کاروں کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص سرکاری واجبات ادا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے واجبات بھی ادا کرے، اور اگر کوئی شخص اس سے سرتابی کرے تو اس کے ذمہ دس ہزار کے بجائے پچاس ہزار کا ٹیکس جڑ دیا جاتا ہے،

جسے وہ شاید گھر بار بیچ کر بھی ادا نہیں کرسکتا، اس لئے اسے سرکاری اہل کاروں کو بھی ''نذرانہ'' پیش کرنا پڑتا ہے۔ یہ ادا کرنے کے بعد اس کے اصل واجبات میں بھی تخفیف ہوجاتی ہے، یہ اور اس جیسی بہت سی بدعنوانیاں ہیں جو انکم ٹیکس کے رگ و ریشے میں سرایت کرگئی ہیں۔ اس کی حیثیت صرف ایک مالیاتی قانون کی نہیں رہی، بلکہ یہ قوم کو بددیانتی سکھانے، انکم ٹیکس افسروں اور اہل کاروں کو بدعنوانی کی تربیت دینے کا ایک خودکار نظام ہے۔ زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ بددیانتی و بدعنوانی کی یہ تربیت گاہ بھی جاری رہی تو پورا یقین رکھنا چاہئے کہ زکوٰۃ وعشر کا نظام بھی اس کی لپیٹ میں آجائے گا اور اللہ تعالیٰ کا یہ مقدس فریضہ ان قباحتوں کی آماجگاہ بن کر رہ جائے گا، صدر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب ہم سے بہتر سمجھتے ہیں کہ کیا اس صورت میں ان کا اسلامی مالیاتی نظام کے نفاذ کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکے گا؟

ہم پہلے بھی اس رائے کا اظہار کرچکے ہیں اور اب پھر گزارش کرتے ہیں کہ اگر زکوٰۃ وعشر کے نظام کو کامیاب بنانا مطلوب ہے تو انکم ٹیکس کا موجودہ نظام یکسر تبدیل کیا جائے، یوں تو حکومت اس میں بارہا جزوی اصلاحات و ترمیمات کرچکی ہے مگر یہ نظام اس قدر خراب و فرسودہ ہوچکا ہے کہ اس کی اصلاح ممکن نہیں رہی، اس کا علاج یہی ہے کہ اس کو ختم کرکے اس کے متبادل ٹیکس کا کوئی ایسا نظام لایا جائے جو ان قباحتوں اور بدعنوانیوں سے پاک ہو۔ اس سلسلہ میں متعلقہ حلقوں سے آراء وتجاویز طلب کی جاسکتی ہیں۔

(افتتاحیہ صفحہ اقرأ روزنامہ جنگ کراچی ۲۲/جون ۱۹۷۹ء)

نفاذِ اسلام کے التوا کا اعلامیہ

انا للہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۲ ربیع الاول کے خطاب میں پہلی مرتبہ یہ ایمان پرور اور فرحت انگیز نوید ملی تھی کہ ملک خداداد پاکستان میں عنقریب اسلام کا آفتاب طلوع ہو رہا ہے اور اس کی تابانی سے معاشرے کی تاریکیاں دور ہو جائیں گی اور یہ کہ اسلامی نظام کی بنیاد، ملک میں زکوٰۃ و عشر، تعزیرات و حدود کے نفاذ سے رکھی جا رہی ہے، لیکن اب ایک سرکاری اعلامیہ میں بتایا گیا ہے کہ فی الحال یہ پروگرام غیر متعین عرصہ کے لئے ملتوی کر دیا گیا ہے:

حسرت ان غنچوں پہ ہے، جو بن کھلے مرجھا گئے

۱۲ ربیع الاول کے اعلان سے ملت اسلامیہ کو جتنی خوشی ہوئی تھی، مؤخر الذکر اعلامیہ سے اسی قدر افسوس ہونا ایک فطری بات ہے، کیونکہ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ جب ۳۲ سال کے عرصہ میں اسلامی نظام کی پہلی اینٹ رکھنا بھی ممکن نہ ہو سکا، تو یہ توقع مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے کہ اس "خوش قسمت" ملک کو اسلامی نظام کی سعادت بھی کبھی میسر آسکتی ہے، یہ ملک ڈیڑھ سو سال تک اغیار کا غلام رہا ہے، اب نہ جانے ان کے قانون، ان کی تہذیب و معاشرت اور ان کی زبان و تعلیم کی غلامی ہماری قسمت میں کب تک لکھی ہے؟

اسلام، اغیار کی آنکھ کا کانٹا ہے وہ کسی قیمت پر برداشت نہیں کرتے کہ کسی

ملک میں اسلامی نظام کے صحیح اور مکمل نفاذ کا تجربہ کامیاب ہو اور اس کے زیر سایہ اسلامی معاشرہ ایک نئی قوت بن کر دنیا کے نقشے پر ابھرے، اس لئے انہیں اس اعلان سے جتنی مسرت ہوئی ہوگی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

سرکاری اعلامیہ میں یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ بالکل آخری مرحلہ پر زکوٰۃ و عشر کا نفاذ کیوں ملتوی کردینا پڑا؟ جب کہ اس کی تیاری پر ارکان مملکت کے قیمتی وقت کے علاوہ گراں قدر مصارف بھی اٹھ چکے تھے، اگر اس کا سبب فقہی اختلافات کا چکر ہے تو شبہ ہوتا ہے کہ اسلامی نظام کا سنتے ہی فقہی اختلافات کا ہوا کھڑا کردینا بھی کہیں اغیار کی سازش ہی کا ایک حصہ تو نہیں؟ اور یہ فقہی اختلافات آج تو نہیں پیدا ہوگئے، یہ پہلے ہی سے چلے آتے ہیں، کم از کم ایک ہزار سال تک اسلامی قانون ان فقہی اختلافات کے باوجود بھی نافذ رہا، اگر یہ چیز کل رکاوٹ نہیں تھی تو آج کیوں رکاوٹ بن گئی؟ خیر! اسلامی نظام کا نفاذ تو ہماری قسمت پر منحصر ہے، نصیب ہوگا تو خدا تعالیٰ اس کار خیر کے لئے رجال کار بھی کھڑے کردے گا اور ان کے راستے میں انشاءاللہ کوئی دیوار حائل نہیں ہوگی، اور اگر خدانخواستہ ہماری شامت اعمال کی بدولت اس "پاک ملک" کی قسمت میں ہمیشہ کے لئے قانونِ غیر کی غلامی اور اسلام سے محرومی لکھی ہے تو اس ازلی بدنصیبی کو کون مٹا سکتا ہے؟ اس کے لئے فقہی اختلاف جیسی بے حقیقت چیز بھی بہانہ بن سکتی ہے، اور کوئی دوسرا شاخسانہ بھی کھڑا کیا جاسکتا ہے، بہر حال صدر جنرل محمد ضیاء الحق اپنی پرخلوص مساعی جمیلہ پر عنداللہ اجر کے مستحق ہیں مگر ان کی کوششوں کا بارآور نہ ہوسکنا، لائق صد عبرت بھی ہے، اور موجب ہزار افسوس بھی ــــ انا للہ وانا الیہ راجعون، اب جبکہ اسلامی نظام کے نفاذ کا مسئلہ فی الحال ملتوی کردیا گیا ہے تو "اسلامی نظریاتی کونسل" کو باقی رکھنے، اس میں مختلف فقہی عقائد کے

بزرگوں کو بھرتی کرکے ان پر لاکھوں روپے خرچ کرنے کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے؟ یہ ایک سوال ہے جس پر جناب صدر کو غور کرنا چاہئے، خاص طور سے اس مسئلہ کو اس زاویہ سے دیکھنا ضروری ہے کہ مختلف ذوق اور مکتب فکر کے ان چیدہ و برگزیدہ بزرگوں کو ایک جگہ بٹھانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ یہ حضرات ناخن علم و تدبر سے فقہی اختلاف کی گتھی سلجھائیں تاکہ یہ پہاڑ، جو اسلام کے پاکستان میں نافذ کرنے کی راہ میں دیوار بن کر کھڑا ہے، اس کو کاٹ کر اسلام کا راستہ کھولا جائے، اب جب یہ اصل مدعا ہی عنقا ہے اور یہ محترم بزرگ اس گتھی کو سلجھانے سے قاصر رہے ہیں تو آخر ان کو یکجائی کی زحمت ہی کیوں دی جائے؟ اور دنیا کو ان کی صلاحیتوں کے بارے میں معلومات کیوں فراہم کی جائیں؟

(افتتاحیہ صفحہ اقرأ روزنامہ جنگ کراچی ۳/اگست ۱۹۷۹ء)

ہماری معیشت اور اس کا بگاڑ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جناب صدر کے اعلان کے مطابق مارشل لا ٔ حکومت نے جن اہم ترجیحات کو پیش نظر رکھا ہے ان میں ایک اہم نکتہ قومی معیشت میں استحکام پیدا کرنے اور اشیا ٔ ضرورت کی قیمتوں کو مناسب سطح پر لانے کا ہے، جس کے لئے حکومت بعض ضروری اور فوری اقدامات کر رہی ہے، اور ان کے مفید اور خوشگوار اثرات بھی ظاہر ہو رہے ہیں، تاہم قومی معیشت کے استحکام کا مسئلہ اپنی اہمیت و نزاکت اور گہرائی و گیرائی کی بنا ٔ پر اس امر کا مقتضی ہے کہ بڑی سنجیدگی اور باریک بینی سے ان اسباب و ذرائع کا مطالعہ کیا جائے جو قومی معیشت کو کھوکھلا کر رہے ہیں، یہ فرض ماہرین معاشیات پر عائد ہوتا ہے کہ وہ قومی معیشت کی بنیادوں کو صحیح خطوط پر استوار کرنے میں قوم کی راہنمائی کریں۔

ہمارے یہاں ایک اصول پر بڑی سختی سے عمل ہو رہا ہے، (شاید ہمارے ماہرین معاشیات اسی کو معاشی مسئلے کا حل سمجھتے ہیں) وہ یہ کہ جوں جوں گرانی میں اضافہ ہوتا جائے سرکاری و غیر سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں اضافہ کر دیا جائے، تنخواہوں میں اضافہ ہوگا تو ٹیکسوں کی شرح بڑھانی پڑے گی، ٹیکس بڑھیں گے تو گرانی

میں اضافہ ہوگا، اور اس کے لئے پھر تنخواہوں میں اضافہ کی ضرورت ہوگی، الغرض یہ پالیسی جس پر تیس سال سے پاکستان میں عمل ہورہا ہے ایک ایسا چکر ہے جو گرانی میں اضافہ سے شروع ہوکر گرانی میں اضافہ پر ہی ختم ہوتا ہے، حکومت ٹیکس بڑھاتی ہے، اس کی کمی پوری کرنے کے لئے تاجر اور صنعت کار قیمتوں میں اضافہ کرتا ہے، اور قیمتوں میں اضافہ، تنخواہوں میں نئے اضافے کا مطالبہ کرتا ہے، تنخواہوں کا اضافہ نئے ٹیکسوں کو جنم دیتا ہے، اور نئے ٹیکس نئی گرانی کا طوفان لاتے ہیں، الغرض یہ ایک ایسا چکر ہے کہ اگر کوئی قوم بدقسمتی سے اس میں پھنس جائے تو اس کا نکلنا بے حد مشکل ہوجاتا ہے، عمرانیات کے مجدد علامہ ابن خلدون کے نزدیک یہ صورتحال کسی مملکت کے بڑھاپے اور پیرانہ سالی کی علامت ہے، اور یہی وہ بیماری ہے جس نے بڑی توانا و طاقت ور سلطنتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

حقیقت پسندی اور خود تنقیدی کے اصول پر جب ہم اپنا جائزہ لیتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ اہل وطن نے اپنی معیشت کو خود اپنے ہاتھوں تہ و بالا کر رکھا ہے، اس لئے قومی معیشت میں استحکام پیدا نہیں ہوسکتا جب تک کہ اپنی روش نہ بدلیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح نہ کریں، اس سلسلے میں چند نکات ہم سب کو ملحوظ رکھنے ہوں گے:

سادگی کفایت شعاری:

آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی سنہرے حروف سے لکھنے کے لائق ہے کہ ''میانہ روی آدھی معیشت ہے۔'' خود قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ: ''نہ ہاتھ کو پورا پھیلاؤ، اور نہ بالکل ہی بند کرلو بلکہ دونوں کے درمیان کا راستہ اختیار کرو۔'' لیکن

بدقسمتی سے ہم نے سادگی، کفایت شعاری کو اپنی شان کے خلاف سمجھ لیا اور ہر شخص نمود ونمائش کے شوق میں فضول خرچی کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے، اسی ہفتے کے اخبارات میں جناب صدر کا یہ بیان شائع ہوا ہے کہ اس سال ۲۸ ارب کا مال درآمد کیا گیا اور ۱۷ ارب کا برآمد کیا گیا، ذرا غور فرمایئے جو قوم اپنی درآمد و برآمد کے میزانیہ میں گیارہ ارب سالانہ خسارہ اٹھاتی ہو کیا وہ پنپ سکتی ہے؟ اور اس پر اس نکتہ کا مزید اضافہ کرلیجئے کہ ۱۷ ارب کی برآمدات میں ہمارا اناج اور خام مال بھی شامل ہے، اور ۲۸ ارب کی درآمدات میں ٹی وی سیٹ، ریفریجریٹر اور بناؤ سنگھار کا سامان شامل ہے، جو قوم اپنا پیٹ کاٹ کر عیاشی کی مرتکب ہو اس کی حماقت پر دنیا ہنسی اڑائے تو بجا ہے، ہماری مثال اس خاندان کی ہے جس کی ماہوار آمدنی ۱۰۰ روپے ہو اور خاتون خانہ گھر کا غلہ بیچ کر تقریباً ۷۰، ۸۰ روپے مزید بنالیا کرے، یوں تقریباً ایک سو ستر روپے ہوجائے مگر اس کے اخراجات تین سو کے قریب ہوں (یہ اٹھائیس اور سترہ کی قریبی نسبت ہے) تو اس خاندان کے ''معاشی استحکام'' کی پیشگوئی معمولی عقل وفہم کا آدمی بھی کرسکتا ہے۔

ہماری رائے یہ ہے کہ اس ملک کو معاشی استحکام اُسی وقت نصیب ہوسکتا ہے جب کہ غیر ملکی مصنوعات کی درآمد بالکل بند کردی جائے، باہر سے صرف وہ چیز درآمد کی جائے جو نہ تو ہم خود تیار کرسکتے ہوں، اور نہ اس کے بغیر زندہ رہ سکتے ہوں، ہمارا پڑوسی ملک ہندوستان ہم سے دس گنا بڑا ہے، مگر وہ سوئی سے لے کر ہوائی جہاز تک ہر چیز خود بناتا ہے، نہ وہاں کاریں درآمد کی جاتی ہیں، نہ ٹیلیویژن، کیا ہم اس عزت نفس، خودداری اور غیرت کا مظاہرہ نہیں کرسکتے؟

سادگی اور کفایت شعاری کے الفاظ جناب صدر نے قوم کے خوب ذہن

نشین کرائے ہیں مگر بدقسمتی سے "صاحب لوگوں" کو ثقل سماعت کا عارضہ ہے، انہیں بہت اونچا سنائی دیتا ہے اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے معیار زندگی کی سطح بالکل نیچی نہیں ہو پائی۔ مکانوں کی آرائش و زیبائش، بیش قیمت لباس، پر تکلف اور رنگا رنگ کھانوں سے لے کر ان کی معمولی سی معمولی چیزیں "ولایت" سے آتی ہیں۔ چھوٹے افسران جب دیکھتے ہیں کہ "بڑے صاحب" اپنی وضع قطع، رہن سہن اور چال ڈھال سے انگریزوں کو شرماتے ہیں تو ان کے دل میں "معیار زندگی" بلند کرنے کی ہوک اٹھتی ہے۔ اور چونکہ حلال کی کمائی اس کے لئے کفایت نہیں کرتی اس لئے "دست غیب" اور "بالائی آمدنی" کی فکر ہوتی ہے۔ اور قوم کے سربرآوردہ لوگ جب دیکھتے ہیں کہ سرکاری افسران ایک نئی اور جداگانہ مخلوق نظر آتے ہیں تو ان کے دل میں بھی ان سے ہمرنگی کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اور قوم کے عام افراد "چیئرمین" صاحب کی نقالی کی کوشش کرتے ہیں، شادی بیاہ کے موقعوں پر فضول خرچی کے جو عبرتناک نظارے دیکھنے میں آتے ہیں وہ بھی اسی جذبۂ نقالی کا ایک مظہر ہے، الغرض سادگی اور کفایت شعاری کا عملی ثبوت جب تک "بڑے صاحبوں" کی طرف سے پیش نہیں کیا جاتا اسکی زبانی تبلیغ بے فائدہ ہے۔

فضول خرچی کی ایک اور قسم جس کی طرف شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں توجہ دلائی ہے اس کا تو شاید سمجھنا سمجھانا بھی اس زمانے میں مشکل ہوگا، مگر چونکہ معاشی مسئلہ کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے اس لئے اس کا تذکرہ ناگزیر ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ تمدن میں بگاڑ یہاں سے ابھرتا ہے کہ ملک کے دولتمند اور سربرآوردہ لوگ قسم قسم کے زیورات، لباس، تعمیرات، کھانوں اور

دیگر اسباب تعیش میں دلچسپی لینے لگتے ہیں اور ضروریات سے بڑھ کر عیش پرستی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں، پیشہ ور لوگ ضروریات زندگی پر محنت کرنے کے بجائے اس قسم کے سامان تعیش کی صنعت میں مشغول ہو جاتے ہیں، کچھ لوگ رقص و سرود کے سیکھنے سکھانے میں لگ جاتے ہیں، کچھ لوگ لباس کی تراش خراش اور فیشن کے نئے نئے نمونے ایجاد کرنے لگتے ہیں، کچھ لوگ سونے چاندی اور قیمتی پتھروں کے زیورات کے نئے نئے ڈیزائن تیار کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں، ایک طبقہ فن تعمیرات اور عمارتوں کے گل بوٹے بنانے میں نئی نئی جدتیں تراشنے لگتا ہے۔

اور جب ان غیر پیداواری اور مسرفانہ ذرائع معاش کی مانگ بڑھ جاتی ہے اور ملک کی بہت بڑی افرادی قوت انہیں حماقتوں میں خرچ ہونے لگتی ہے، تو اس کا فطری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زراعت و تجارت اور ضروری صنعتیں جن پر زندگی کی بنیادی ضروریات کا مدار ہے، چوپٹ ہو کر رہ جاتی ہیں، اور جب ملک کے متمول طبقہ کے اموال ان عیش پرستیوں میں لگ جاتے ہیں تو ملک کی ضروریات و مصالح پس منظر میں چلے جاتے ہیں، اس صورتحال کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو لوگ معیشت کے بنیادی ذرائع پر کام کر رہے ہوتے ہیں، مثلاً کاشت کار، تاجر، صنعت کار، ان پر ٹیکسوں کا بوجھ بڑھ جاتا ہے اور ان کی زندگی اجیرن ہو کر رہ جاتی ہے، اور پھر یہ تنگی پوری معاشرت کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک متاثر کرتی ہے، اور یہ ایک لاعلاج مرض کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج:۲ ص:۱۰۵)

شاہ صاحبؒ کے اس ارشاد کی روشنی میں جائزہ لیجئے کہ آج پورے ملک کی افرادی قوت اور مالی وسائل کا کتنا حصہ ضروری اسباب معیشت پر لگ رہا ہے؟ اور کتنا حصہ سامان تعیش کی تیاری اور اس کے حصول و استعمال پر؟ ملک کی کتنی دولت (خواہ

سرکاری شعبہ میں ہو، یا نجی شعبہ میں) پیداواری ذرائع پر خرچ ہورہی ہے؟ اور کتنی غیر پیداواری فضولیات پر؟ اور پھر سوچئے کہ ملک کی اتنی بڑی افرادی قوت اور اتنے وسیع مالی ذرائع کا ان لغویات پر ضائع ہونا، کیا یہ قومی سطح پر اسراف اور فضول خرچی کی مد میں نہیں آتا؟

ہمارا ملک زرعی، صنعتی، معدنی، اور تجارتی ذرائع سے مالا مال ہونے کے باوجود ہماری بے تدبیری اور تعیش پسندی کی بناء پر روز بروز بانجھ ہوتا جارہا ہے، نہ کاشت پر محنت ہوسکتی ہے، نہ ضروری صنعتوں پر، اس لئے کہ تعیش پسندانہ صنعتوں میں تھوڑی محنت پر بڑا منافع ہاتھ لگ جاتا ہے، اس لئے لوگوں کی ساری دلچسپیاں اسی قسم کے ذرائع معیشت سے وابستہ ہوگئی ہیں، اور بنیادی معیشت کے ذرائع کو بالکل مہمل چھوڑ دیا گیا ہے۔

اس صورت حال کو سامنے رکھ کر ہماری بیمار معیشت کا علاج سوچا جائے تو توقع ہے کہ ہم اسے سنبھالا دیئے اور ملک کو خودکفیل بنانے میں کامیاب ہوسکیں گے، ہمارے خیال میں اس کے لئے مندرجہ ذیل اقدامات ناگزیر ہیں:

۱:...... بیرون ملک سے درآمد کا سلسلہ حتیٰ الامکان بند کرنے کی کوشش کی جائے، اور حکومت اور عوام دونوں صرف ملکی وسائل پر انحصار کرنے کی ٹھان لیں، ناگزیر حالات میں صرف بنیادی ضروریات کی چیزیں درآمد کی جائیں۔

۲:...... اندرون ملک بھی سامان تعیش کی تیاری قطعاً ممنوع قرار دی جائے، اور سب سے پہلے بنیادی ضروریات کی تیاری اور پیداوار کو ترجیح دی جائے، اور ملک کا سارا سرمایہ اور ساری افرادی قوت اسی پر خرچ ہونی چاہئے۔

۳:...... ''معیار زندگی بلند کرو'' کے غلط اور گمراہ کن نعرہ کو چھوڑ کر اس کی جگہ

''زیادہ سے زیادہ سادہ زندگی گزارو'' کا نعرہ قوم کا نصب العین ہونا چاہئے، جو لوگ اندھی دولت کے اندھے مظاہرے کرنے اور سامان تعیش کی نمود ونمائش کرنے کے عادی ہوں معاشرے میں ان کو ذلیل ورذیل اور تنگ فطرت تصور کیا جانا چاہئے۔

۴:...... زراعت کی ترقی کے لئے ہر ممکن تدابیر اختیار کی جائیں، اور نئے نئے تجربات کئے جائیں، اسی طرح حیوانات کی پرورش، مچھلی کی صنعت اور غلوں اور پھلوں کی افزائش کی طرف پوری قوم کا رخ موڑ دیا جائے۔

جدید دور میں معدنیات اور تیل کی صنعت نے ''کلید معیشت'' کی حیثیت اختیار کرلی ہے، ضرورت ہے کہ ان صنعتوں کی ترقی کے لئے بھی اپنی بساط کے مطابق تمام وسائل اختیار کئے جائیں، بلکہ آج تک جتنا سرمایہ سامان تعیش کی تیاری پر کھپ رہا ہے، وہ سب ان نئی، مگر ضروری، صنعتوں میں لگنا چاہئے۔

۵:...... دو چیزیں معیشت کو تباہ کردیتی ہیں اور اس سے نظام مملکت درہم برہم ہوجاتا ہے، ایک یہ کہ ٹیکسوں کا دباؤ اس قدر بڑھ جائے کہ عام آدمی کے لئے اس کا بوجھ ناقابل برداشت ہوجائے، (ٹیکس خواہ کسی شکل میں لگایا جائے اس کا بوجھ بالآخر عام آدمی ہی پر آکر پڑتا ہے) اور دوسرے یہ کہ قومی خزانہ پر مختلف طبقوں کا بوجھ حد سے بڑھ جائے، ہمارے ملک کو آج انہیں دو آفتوں کا سامنا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ قومی خزانہ کے مصارف میں بخل کی حد تک کفایت شعاری سے کام لیا جائے ضروری مصارف، اور ان میں بہت سے مصارف وہ بھی ہیں جنہیں آج کے فیشن کی بناء پر ضروری ہی سمجھا جاتا ہے) یکسر بند کردیئے جائیں، اسی طرح ٹیکسوں کی مقدار میں بھی زیادہ سے زیادہ کمی کرنے کی کوشش کی جائے۔

۶:...... ملکی معیشت کی ابتری میں سب سے بڑا نہیں تو بہت بڑا دخل معاشرتی

بگاڑ کا بھی ہے، چور بازاری، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی وغیرہ تو وہ عیوب ہیں جن کا آئے دن مشاہدہ ہوتا رہتا ہے اور جو گویا ہماری زندگی کا ایک لازم جزو بن کر رہ گئے ہیں، ان کے علاوہ سود، سٹہ، قمار، انشورنس وغیرہ بیسیوں اسباب ایسے ہیں جنہیں آج کی جدید دنیا" بگاڑ ہی نہیں سمجھتی، حالانکہ جس معیشت میں سود کا چلن ہو اس کی اصلاح ناممکن ہے اور اس کا نتیجہ فساد اور بگاڑ کے سوا اور کچھ نہیں نکل سکتا، ہمارے ماہرین معیشت کی عقل کل میں یہ نکتہ نہ آیا ہے اور نہ جب تک مغرب کا یہودی ساہوکارانہ ہم پر مسلط ہے یہ نکتہ ان کی سمجھ میں آسکتا ہے۔

(افتتاحیہ صفحۂ اقرأ روزنامہ جنگ کراچی ۲۳ر نومبر ۱۹۷۹ء)

ملکی قوانین کا شریعت کے مقابلہ میں تقدس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

لاہور ہائی کورٹ کی شریعت بنچ میں کافی دنوں سے سپریم کورٹ کے ایک سابق جج جناب بدیع الزمان کیکاؤس کی ایک درخواست زیر سماعت تھی، اس کی کاروائی کے بارے میں ۱۰ر دسمبر کے اخبارات میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے:

"لاہور۔ ۹ر دسمبر (پ، پ، ا) مسٹر جسٹس ایم ایس قریشی، مسٹر جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال اور مسٹر جسٹس عبداللہ پر مشتمل لاہور ہائی کورٹ کی شریعت بنچ نے آج سپریم کورٹ کے ایک سابق جج مسٹر بدیع الزمان کیکاؤس کے دلائل کی سماعت جاری رکھی، جو انہوں نے شریعت بنچ کے روبرو اپنی درخواست کے سلسلے میں دیئے۔ مسٹر کیکاؤس کی درخواست میں تین قوانین: پارلیمنٹ کے ایوانوں اور صوبائی اسمبلیوں کے آرڈی نینس، عوامی نمائندگی کے قانون اور پولیٹیکل پارٹیز کو چیلنج کیا گیا، جو ملک میں جمہوری ڈھانچہ کے لئے نافذ کئے گئے ہیں، درخواست

گزار نے اس معاملہ میں بنچ کے دائرۂ اختیار کے نکتہ پر بنچ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ عدلیہ کو جو اختیارات حاصل ہیں وہ اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کئے ہیں، اور اس سلسلہ میں سپریم کورٹ کا ایک فیصلہ موجود ہے، سپریم کورٹ فیصلہ دے چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی واحد مقتدرِ اعلیٰ ہے، انہوں نے کہا کہ ۱۹۷۳ء میں لاہور ہائی کورٹ نے میری رٹ درخواست پر غور کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قبول کی ہے، اور ایک بار اللہ تعالیٰ کی حاکمیت تسلیم کرلی جائے تو تمام قوانین قرآن وسنت کے مطابق ہونا چاہئیں، یہ ہمارا فرض ہے کہ اس سلسلہ میں عدم مطابقت کو دور کریں۔

درخواست گزار نے کہا کہ ہم خدا کی اطاعت و فرمانبرداری کی بات کرتے ہیں لیکن عملی طور پر ہمارے تمام اعمال اور قوانین اسلام کی روح کے منافی ہیں۔

ایک فاضل جج نے کہا کہ شریعت بنچ کا دائرۂ اختیار اس حد تک محدود ہے کہ وہ صرف آئین کے مطابق اپنا فیصلہ دے سکتی ہے، جہاں تک درخواست گزار کی اس دلیل کا تعلق ہے کہ قرآن وسنت ہی شریعت بنچ کے اختیارات کا واحد ذریعہ ہیں، درخواست گزار نے از خود کہا ہے کہ پاکستان میں ابھی تک اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی ہے، چنانچہ شریعت بنچ قرآن و سنت کی اسی قدر پابند ہے جتنا کہ آئین کی، شریعت بنچ صرف آئین پر انحصار کرتی ہے جسے عدالتوں کے لئے مقدس دستاویز قرار دیا گیا ہے۔

اس پر درخواست گزار نے کہا کہ اگر بنچ کی یہ رائے ہے تو میرے تمام دلائل بے سود ثابت ہوئے، اور میں اپنے دلائل ختم کرتا ہوں۔"

اسلام اور سرمایہ داری

صد حیف کہ جو ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، آج تک نہ صرف اس میں اسلام اور اسلامی قانون نہیں آسکا بلکہ اگر کوئی اللہ کا بندہ اسلامی قوانین اور شریعت کی بالادستی کی بات کرتا ہے، یا ملکی قوانین کو اسلامی ڈھانچہ میں تبدیلی کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو اسے "ملکی قانون مقدس دستاویز ہے" کا انجکشن دے کر خاموش کرادیا جاتا ہے۔

ستم بالائے ستم یہ کہ ملک کے سپریم لاء، قرآن وسنت کی نمائندگی کرنے والی عدالت، شریعت بنچ کے دائرہ کار کو محدود کرتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے کہ: شریعت بنچ کا دائرۂ اختیار اس حد تک محدود ہے کہ وہ صرف آئین کے مطابق فیصلہ دے سکتی ہے، حد تو یہ ہے کہ مجوزہ شریعت بنچ کے فاضل ججوں کے ہاں بھی نعوذباللہ! ملک میں رائج انگریزی قوانین کو قرآن وسنت سے زیادہ اہمیت اور تقدس ہے، چنانچہ یہ کہا جاتا ہے کہ شریعت بنچ صرف آئین پر انحصار کرتی ہے، جسے عدالتوں کے لئے مقدس دستاویز کا مقام حاصل ہے۔

جب شریعت بنچ کے فاضل ججوں کا قرآن وسنت اور اسلامی قوانین کی بالادستی کے بارے میں یہ نظریہ ہو، ان سے کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ شریعت بنچ میں دائر مقدمات کا فیصلہ قرآن وسنت کے مطابق سنائیں گے، یا وہ قرآن وسنت کی نمائندگی کریں گے؟

جب نام نہاد نمائندگانِ شریعت، کی انگریزی اور ملکی قوانین سے مرعوبیت کا یہ

حال ہو تو بلاشبہ ان سے ملکی قوانین کو اسلامی ڈھانچہ میں تبدیلی کی توقع بے سود ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ ملک کے سرمایہ کار حضرات آج کل اس مہم میں مصروف ہیں کہ اندرون وبیرون ملک کے مفتیان کرام سے اس مضمون کے فتوے حاصل کئے جارہے ہیں کہ اسلام میں "قومی ملکیت" جائز نہیں۔

فتویٰ تو لائق اعتماد مفتی حضرات نے جو دیا ہوگا وہی صحیح ہوگا، اس لئے نفس مسئلہ سے قطع نظر ہم چند معروضات پیش کرنا چاہتے ہیں:

اول:...... جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ اسلام اگر سوشلسٹوں کے بے ہنگم قومیانے کا قائل نہیں، تو مغرب کی وہ سرمایہ داری جو ہمارے یہاں رائج ہے اس کو بھی صحیح تصور نہیں کرتا، اس لئے جب تک سرمایہ داری کا موجودہ نظام تبدیل نہ ہو، اور اس کی جگہ اسلامی نظام معیشت رائج نہ کیا جائے محض ایک مسئلہ پر اسلام کا حوالہ دے ڈالنا، اسلام سے بدخواہی ہے۔

دوم:...... یہ کہ اسلام آج کل کی لادینی "مساوات" کا قائل نہیں، مگر اسلامی "مواخات" کا قائل ہے، اور اس کے حدود یہاں تک پھیلے ہوئے ہیں کہ اگر کسی کا ہمسایہ بھوکا سوئے اور وہ خود پیٹ بھر کر سورہے تو اسلام ایسے شخص کو اچھا مسلمان تصور نہیں کرتا، ہم ملک کے متمول اور خوش حال طبقہ سے یہ گزارش کریں گے کہ ان کی، ملک کی اور مسلمانوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ "قومی ملکیت جائز ہے یا نہیں" پر فتوے حاصل کرنے کے بجائے اسلام کے اصول "مواسات" پر عمل کریں۔

سوم:...... یہ کہ معاشی اونچ نیچ کا جو طوفان ہمارے چاروں طرف برپا ہے اس کا سبب اسلام نہیں، بلکہ وہ نظام معیشت ہے جو مغرب نے ہم پر مسلط کیا ہے، اور یہ نظام الف سے یا تک اسلام کے اصول اخلاق، اصول معاشرت، اصول معیشت اور اصول تمدن کے یکسر خلاف ہے، اس لئے سرمایہ داروں کو بھی اور ان کے مخالفین کو بھی یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہئے کہ آج کی پیچیدہ معیشت کو نہ "قومی ملکیت" سلجھا سکتی

ہے، اور نہ آزاد سرمایہ کاری۔ اس قفل کی کلید صرف اور صرف اسلام کی جیب میں ہے، اگر آپ چاہتے ہیں کہ ایک طرف محنت کار سکھ کی نیند سوئے اور دوسری طرف سرمایہ دار اطمینان کا سانس لے تو دونوں کو اسلام کے مذکورہ بالا اصول اپنانا ہوں گے، اور اگر وہ اپنی خود غرضی کی بنا پر ایسا کرنے سے قاصر ہیں تو انہیں دو باتیں نوٹ کرلینی چاہئیں:

ایک یہ کہ سرمایہ دار اور مزدور میں سے کسی بھی فریق کو اسلام سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ وہ ان کی "جاہلی جنگ" میں کسی فریق کی حمایت کرے گا۔ دوسری بات یہ نوٹ کرر کھیں کہ یہ دونوں فریق جب تک اسلام کی طرف رجوع نہیں ہوں گے، کسی فریق کو راحت واطمینان اور امن وسکون نصیب نہیں ہوگا۔

(ماہنامہ بینات کراچی صفر ۱۴۰۰ھ)

''اسلامی سود''

پڑھے لکھے مجتہدین کا فتویٰ

''لندن میں ایک عیسائی دوست نے مشورہ دیا کہ میں ایک مسلم علاقے میں شراب کی دکان کھول لوں اور اس کا نام ''مسلم وائن شاپ'' رکھوں، میں کچھ وقفہ کے لئے حیرت زدہ رہ گیا، مگر جلدی اس سے مخاطب ہوا کہ بھائی! میرے لئے شراب کا کاروبار کرنا حرام ہے، مزید برآں آپ اس دکان کا نام بھی ''مسلم وائن شاپ'' (شراب کی اسلامی دکان) رکھوا رہے ہیں۔

عیسائی دوست ایک طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوا کہ اگر سود کا کاروبار کیا جاسکتا ہے، اور وہ بھی ''مسلم کمرشل بینک'' کے نام سے، تو یہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس دوست نے مجھے لاجواب کر دیا۔''

یہ ایک مسلمان کے خط کا اقتباس ہے، جو ''اخبار جہاں'' کے مورخہ ۱۲ر مئی ۱۹۷۶ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا، اس عیسائی دوست نے طنز کا جو نشتر ایک مسلمان کے جگر میں پیوست کیا ہے اس کی چبھن ہر ذی حس مسلمان اپنے دل میں محسوس کرے گا۔ لیکن کیا کیجئے ہماری بدعملی نے عقل وفہم ہی کو نہیں، ملی غیرت وحمیت اور احساس کو بھی کچل کر رکھ دیا ہے۔ ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ ایک عیسائی مسلمانوں پر فقرہ چست کرتا ہے کہ ''اسلامی بینک'' کے نام سے سود کی دکان کھل سکتی ہے تو ''اسلامی شراب خانہ'' کے نام سے شراب خانہ خراب کی دکان کیوں نہیں کھل سکتی؟ لیکن ہمارے دور کے ''لکھے پڑھے مجتہدین'' اس پر شرمانے کے بجائے بڑی جسارت سے سود کے حلال ہونے کا فتویٰ صادر فرمادیتے ہیں۔

قریباً ایک صدی سے، جب سے غلام ہندوستان پر مغرب کی سرمایہ داری کا عفریت مسلط ہوا، ہمارے مجتہدین سود کو "اسلامی سود" میں تبدیل کرنے کے لئے بے چین نظر آتے ہیں اور بعض اوقات وہ ایسے مضحکہ خیز دلائل پیش کرتے ہیں جنہیں پڑھ کر اقبال مرحوم کا مصرعہ:

"تم تو وہ ہو جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود"

یاد آجاتا ہے، ہمارے قریبی دور میں ایوب خان کے زیر سایہ جناب ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب نے سود کو "اسلامیانے" کی مہم شروع فرمائی تھی، جس کی نحوست یہ ہوئی کہ ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب اپنے فلسفہ تجدد کے ساتھ ایوب خان کے اقتدار کو بھی لے ڈوبے ـــــ اب نئی حکومت نے اسلام کے نظام معاشیات کی طرف پیش رفت کا ارادہ کیا، ابھی اس سمت قدم اٹھنے نہیں پائے تھے کہ ہمارے لکھے پڑھے مجتہدوں کی جانب سے "الامان والحفیظ" کی پکار شروع ہوگئی۔ ان حضرات کے نزدیک اگر انگریز کا نظام کفر مسلط رہے تو مضائقہ نہیں۔ مغرب کا سرمایہ داری نظام قوم کا خون چوس چوس کر ان کی زندگی کو سراپا عذاب بنادے تو کوئی پروا نہیں، کمیونسٹوں کا ملحدانہ نظام انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی صف میں شامل کردے تو کوئی حرج نہیں لیکن اسلام کے عادلانہ نظام کا اگر کوئی نام بھی بھولے سے لے لے تو خطرات کا مہیب جنگل ان کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ گویا ان کے ذہن کا معدہ دور فساد کی ہر گلی سڑی غذا کو قبول کرسکتا ہے، نہیں قبول کرسکتا تو بس اسلام کو ـــــ انا للہ و انا الیہ راجعون

اس موضوع پر چند دن پہلے عالی جناب جسٹس (ریٹائرڈ) قدیر الدین صاحب کا ایک مضمون دو قسطوں میں "ربا قطعی حرام ہے" کے زیر عنوان روزنامہ "جنگ" میں شائع ہوا ("جنگ" کراچی ۲۸/۲۹ نومبر ۱۹۷۸ء)۔

معلوم نہیں جناب جسٹس صاحب کا اسلامی مطالعہ کس حد تک وسیع ہے؟ وہ دور جدید کے کس اجتہادی مکتب فکر سے وابستہ ہیں؟ اور خود آں موصوف کو منصب اجتہاد پر سرفرازی کا شرف کب سے حاصل ہوا ہے؟ لیکن ہمارے مجتہدین اپنے دعوے کو جس قسم کے دلائل سے آراستہ کرنے کے خوگر ہیں افسوس ہے کہ موصوف کا معیار استدلال ان سے کچھ زیادہ بلند نہیں ہے، بلکہ اس مضمون میں علم وفہم کی وہ ساری بوالعجبیاں موجود ہیں جو ہمارے نومشق مجتہدین کا طرۂ امتیاز ہے۔

ان کی تحریر پڑھ کر قاری کو جو سب سے بڑی مشکل پیش آتی ہے وہ یہ کہ جسٹس صاحب "ربا قطعی حرام ہے" کا عنوان دے کر آخر کہنا کیا چاہتے ہیں؟ وہ کبھی یہ فرماتے ہیں کہ ہماری زبان میں جس چیز کو "سود" کہا جاتا ہے۔ وہ "ربا" نہیں کبھی یہ بتاتے ہیں کہ بینکوں کے "سود" کو دور جدید کے بعض علماء نے حلال ومطہر قرار دیا ہے۔ کبھی یہ سمجھاتے ہیں کہ متقدمین بھی "سود" کی بعض صورتوں کو جائز قرار دیتے تھے، کبھی سود کی حرمت کو تسلیم فرماکر "نظریہ ضرورت" ایجاد فرماتے ہیں، کبھی یہ وعظ فرماتے ہیں کہ اگر مسلمانوں نے "سود" چھوڑنے کی غلطی کی تو خدانخواستہ ہماری معیشت تلپٹ ہوجائے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایک جسٹس جو برسہا برس تک عدالت عالیہ کی کرسی پر رونق افروز رہا ہو، جس کی ساری عمر ماشاء اللہ انگریزی قانون کی موشگافیوں میں گزری ہو اور سچ جھوٹ کے درمیان امتیاز جس کی خوبو بن گئی ہو کیا اس سے ایسی ژولیدہ فکری کی توقع کی جاسکتی ہے؟

جسٹس صاحب کو پہلے دوٹوک بتانا چاہئے تھا کہ وہ بینک کے سود کو حرام سمجھتے ہیں یا حلال اور مطہر؟ اگر حرام سمجھتے ہیں تو ان کی یہ ساری کہانی غیر متعلق ہوجاتی

ہے کہ سود کی فلاں فلاں قسمیں معاذ اللہ حلال بھی سمجھی گئی ہیں۔ اس صورت میں ان کا فرض یہ تھا کہ وہ ہمیں بتاتے کہ وہ کون سے اضطراری حالات ہیں جن کی بناء پر وہ بینکوں کو اس حرام خوری کی ''رخصت'' عطا فرما رہے ہیں اور اگر بینک کے سود کو ''حلال ومطہر'' سمجھتے ہیں تو ان کی نظر یہ ضرورت و رخصت کی بحث قطعاً لغو اور غیر متعلق بن جاتی ہے، اس صورت میں انہیں یہ بتانا چاہئے تھا کہ قرآن وسنت کے وہ کون سے دلائل ہیں جن سے بینک کے ''سود'' کا تقدس ثابت ہوتا ہے۔ آخر دنیا کا کون عاقل ہے جو ایک پاک اور حلال چیز کا جواز ثابت کرنے کے لئے ''اضطرار'' کی بحث شروع کر دے؟

خلاصہ یہ کہ موصوف کے مضمون سے قاری کو یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کا دعویٰ کیا ہے اور وہ کس چیز کو ثابت کرنے کے درپے ہیں، اس طرح ان کا سارا مضمون ایک مبہم دعویٰ کے اثبات میں فکری انتشار کا شاہکار بن کر رہ جاتا ہے۔

دعوے کے بعد دلائل پر نظر ڈالئے تو اس میں بھی افسوسناک غلط فہمیاں نظر آتی ہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے ''مقصد کلام'' کے عنوان سے ''رخصت'' کی بحث چھیڑی ہے، اور چلتے چلتے وہ یہ تک لکھ گئے ہیں:

''بڑے بڑے علمائے دین نے بھی اس حقیقت کو پہچانا ہے اور ربا (یا سود) کے معاملے میں مجبوری بلکہ خاص حالات میں بھی رخصت یا اجازت کو تسلیم کیا ہے۔''

جسٹس صاحب کا یہ فقرہ میرے لئے ''جدید انکشاف'' کی حیثیت رکھتا ہے، مجھے معلوم نہیں وہ کون کون ''بڑے بڑے علمائ'' ہیں جنہوں نے خاص حالت'' میں سود لینے کا فتویٰ صادر فرمایا ہے۔ اگر جناب جج صاحب اس موقعہ پر ان ''بڑے بڑے

علمائ'' کے ایک دو فتوے بھی نقل کر دیتے تو نہ صرف ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا بلکہ انکا یہ ہولناک دعویٰ ''خالی دعویٰ'' نہ رہتا۔

رخصت کی بحث:

رخصت اور اضطرار کی بحث میں فاضل جج صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اسے ایک نظر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نہ تو ''اضطرار'' اور ''رخصت'' کی حقیقت سے واقف ہیں، نہ رخصت کے مدارج اور ان کے الگ الگ احکام ہی انہیں معلوم ہیں، نہ انہوں نے اس کے لئے فقہ واصول کے ابتدائی رسالوں ہی کو دیکھنے کی زحمت فرمائی ہے انہوں نے کہیں سے سن لیا کہ مجبوری کی حالت میں حرام کھانے کی بھی اجازت ہے اس کے بعد سود کھانے کی مجبوری کا سارا افسانہ ان کے اجتہاد نے خود ہی تراش لیا۔

اسلام کی نظر میں سود خوری کس قدر گھناؤنا اخلاقی، معاشی اور معاشرتی جرم ہے؟ اس کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ زنا اور قتل ایسے افعال شنیعہ پر بھی لرزہ خیز سزا نہیں سنائی گئی جو سود خوری پر سنائی گئی ہے۔ قرآن کریم میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے:

''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَوٰٓا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ. فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ.'' (البقرہ:۲۷۸،۲۷۹)

ترجمہ:...... ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سود کا جو بقایا رہتا ہے اسے یک لخت چھوڑ دو، اگر تم مسلمان ہو۔ اور اگر تم

ایسا نہیں کرتے تو خدا اور رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو!"

تمام بد سے بدتر کبیرہ گناہوں کی فہرست سامنے رکھو اور دیکھو کہ کسی گناہگار کے خلاف خدا اور رسول کی طرف سے اعلان جنگ کیا گیا ہے؟ اور پھر یہ سوچو کہ جس بد بخت کے خلاف خدا اور رسول میدان جنگ میں اتر آئیں اس کی شورہ بختی کا کیا حشر ہوگا؟ اس کو خدائی عذاب کے کوڑے سے کون بچا سکتا ہے؟ اور اس بدترین مجرم کو جو خدا ورسول کے ساتھ جنگ لڑ رہا ہے کون عقل مند "اصول رخصت" کا پروانہ لا کر دے سکتا ہے؟

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رہنا چاہئے کہ جو شخص انفرادی طور پر سود خوری کے جرم کا مرتکب ہے وہ انفرادی حیثیت سے خدا اور رسول کے خلاف میدان جنگ میں ہے۔ اور اگر یہ جرم انفرادی دائرے سے نکل کر اجتماعی جرم بن جائے اور مجموعی طور پر پورا معاشرہ اس سنگین جرم کا ارتکاب کرنے لگے تو خدائی عذاب کا کوڑا پورے معاشرے پر برسنے لگے گا اور دنیا میں کوئی بہادر ایسا نہ ہوگا جو اس جرم کے ارتکاب کے باوجود اس معاشرے کو خدا کے عذاب سے نکال لائے۔

یہ بدنصیب ملک اکتیس برس سے خدا اور رسول کے خلاف بڑی ڈھٹائی سے مسلح جنگ لڑ رہا ہے اس پر چاروں طرف سے خدائی قہر وغضب کے کوڑے برس رہے ہیں۔ "فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ." کا منظر آج ہر شخص کو کھلی آنکھوں نظر آ رہا ہے، ملک ستر ارب روپے کا مقروض ہے، نوے ہزار جوان ذلیل بنیوں کے ہاتھ میں قیدی بنا چکا ہے، دلوں کا سکون چھن چکا ہے، راتوں کی نیند حرام ہو چکی ہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی "روٹی روٹی" کی پکار چاروں طرف سے سنائی دے رہی

ہے، لیکن وائے حسرت و بدبختی کہ اب بھی عبرت نہیں ہوتی، بلکہ ہمارے نو مجتہد صاحب پروانہ "رخصت" لئے پہنچ جاتے ہیں۔ اور حالات کی دہائی دے کر سود کو حلال کرنے کیلئے ذہانت طباعی کے جوہر دکھاتے ہیں۔ قرآن کریم، خدا اور رسول کے ساتھ "صلح" کو سود چھوڑ دینے کے ساتھ مشروط کرتا ہے، اور جو لوگ سود چھوڑ دینے کا اعلان نہ کریں، انہیں مسلمان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن محترم جج صاحب فرماتے ہیں کہ سود بھی کھاؤ اور مسلمان بھی رہو، سود کا لین دین خوب کرو اور میدان جنگ میں خدائی عذاب کے ایٹم بم سے حفاظت کے لئے اصول رخصت کی خانہ ساز ململ جج صاحب سے لیتے جاؤ۔

جج صاحب بتائیں کہ "سود خور" کے خلاف تو قرآن کریم اعلان جنگ کر چکا ہے۔ قرآن کریم کی وہ کون سی آیت ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ان کی خود ساختہ مجبوری میں "سود خور" کی صلح خدا اور رسولؐ سے ہو سکتی ہے۔ اور حالات کا بہانہ بنا کر خدا اور رسولؐ کو میدان جنگ سے واپس کیا جا سکتا ہے؟ انہیں زید، عمر، بکر کے برخود غلط حوالہ دینے کے بجائے قرآن کریم کے حوالے سے بتانا چاہئے تھا کہ اس اعلان جنگ سے فلاں فلاں صورتیں مستثنیٰ ہیں۔ جج صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ سود خور، بنص قرآن، خدا اور رسولؐ سے جنگ لڑ رہا ہے۔ خواہ امریکہ کا بادشاہ ہو یا پاکستان کا، اس کی صلح خدا اور رسولؐ سے نہیں ہو سکتی، جب تک وہ اپنے اس بدترین جرم سے باز آنے کا عہد نہیں کرتا، نہ آپ کی نام نہاد "رخصت" کا تار عنکبوت اسے خدائی گرفت سے بچا سکتا ہے۔

قرآن کریم کے بعد حدیث نبوی کو لیجئے، آنحضرت ﷺ نے نہ صرف سود کھانے کھلانے والوں پر بلکہ اس کے کاتب و شاہد پر بھی لعنت کی بدعا کی ہے اور

انھیں راندۂ بارگاہ خداوندی ٹھہرایا ہے، ایک حدیث میں ارشاد ہے:

"درھم ربوا یأکلہ الرجل وھو یعلم اشد من ستة وثلثین زنیة." (مشکوٰۃ ص:۲۴۶)

ترجمہ:......"سود کا ایک درہم کھانا چھتیس بار زنا کرنے سے بدتر ہے۔"

ایک حدیث میں ہے:

"الربوا سبعون جزءًا ایسرھا ان ینکح الرجل امہ." (مشکوٰۃ ص:۲۴۶)

ترجمہ:......"سود کے ستر درجے ہیں اور سب سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں سے منہ کالا کرے۔" (مشکوٰۃ ص:۲۴۶)

جج صاحب فرمائیں کہ کیا دنیا کا کوئی عاقل مجبوری کے بہانے سے لعنت خریدنے، چھتیس بار زنا کرنے اور اپنی ماں سے منہ کالا کرنے کی "رخصت" دے سکتا ہے؟

جج صاحب کو معلوم ہی نہیں کہ مجبوری کسے کہتے ہیں اور آیا جس مجبوری کی حالت میں مردار کھانے کی رخصت دی گئی ہے۔ وہ مجبوری پاکستان کے کسی ایک فرد کو بھی لاحق ہے۔؟

دینیات کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ جس مجبوری میں مردار کھانے کی اجازت دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی شخص کئی دن کے متواتر فاقے کی وجہ سے جاں بلب ہو، اور اسے خدا کی زمین پر کوئی پاک چیز ایسی نہ مل سکے جس سے وہ تن بدن کا

رشتہ قائم رکھ سکے تو اس کے لئے سد رمق کی مقدار حرام چیز کھا کر اپنی جان بچانے کی اجازت ہے۔ اور اس میں قرآن کریم نے "غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ." کی کڑی شرط لگا رکھی ہے۔

یہ ہے وہ اصول ضرورت" جس کو جج صاحب کا آزاد اجتہاد" کروڑ پتی سیٹھ صاحبان پر چسپاں کررہا ہے، جج صاحب بتائیں کہ پاکستانی سود خوروں میں کون ایسا ہے جس پر تین دن سے فاقہ گزر رہا ہو اور اسے جان بچانے کے لئے گھاس ترکاری بھی میسر نہ ہو؟

اجتماعی مجبوری:

جج صاحب کے اجتہاد کا دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ وہ اصول ضرورت کو سمجھنے کی زحمت کئے بغیر پہلے سود کی رخصت کے لئے مصنوعی مجبوری کا افسانہ تراشتے ہیں، اور پھر اسے انفرادی دائرے سے نکال کہ اجتماعی دائرے میں گھسیٹ لاتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

"جس طرح افراد کو رخصت میسر آسکتی ہے، اسی طرح پوری قوم کو بھی رخصت مل سکتی ہے۔"

اول تو جیسا کہ عرض کرچکا ہوں یہ بناءُ الفاسد علی الفاسد ہے، وہ جس مجبوری کا ہوا کھڑا کرکے سود جیسی ملعون چیز کی رخصت دلارہے ہیں وہ جج صاحب کا محض ایک ذہنی مفروضہ ہے، خارج میں اس کا سرے سے وجود ہی نہیں، نہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کی اس خانہ ساز مجبوری کو تسلیم کرتے ہیں۔

دوسرے، اجتماعی مجبوری تو جب ہوتی کہ قوم بھیڑ بکریوں کی طرح صحیح اختیار

و ارادے سے محروم ہوتی یا غلامی کے شکنجے میں جکڑی ہونے کی وجہ سے اپنے ارادہ و اختیار کے استعمال سے محروم ہوتی، ایک آزاد قوم کے لئے جو اپنے ارادہ و اختیار سے اپنی معاشی پالیسی مرتب کر سکتی ہے ''مجبوری'' کا لفظ استعمال کرنا اور اسے اس اضطراری حالت میں صریح حرام کھانے کی تلقین کرنا میں نہیں سمجھتا کہ اجتہاد کی کونسی قسم ہے؟ اور جج صاحب نے یہ نکتہ قرآن و سنت کی کس نص یا کس امام و مجتہد کے کس قول سے اخذ فرمایا ہے؟ کیا جج صاحب کسی آزاد اسلامی ریاست کے لئے کسی قطعی حرام اور ملعون چیز کی ''رخصت'' کی کوئی دلیل یا نظیر پیش کر سکیں گے؟ جج صاحب سے زیادہ کون اس حقیقت سے واقف ہوگا کہ ''اجتماع'' کی ''نمائندگی''، ''ریاست'' کرتی ہے جب ہم کہیں کہ یہ اجتماعی فرض ہے تو اس کے معنی اس کے سوا کیا ہیں کہ پوری قوم کو یہ فرض ادا کرنا چاہئے۔ اور ریاست اس فرض کی بجا آوری میں قوم کی نمائندگی کرے گی، اور وہ اس فرض کی پابندی کرنے اور کرانے کی ذمہ دار ہوگی۔

اب اگر جج صاحب کے مفروضہ کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اسلام نے ''اسلامی ریاست'' کو خاص حالات میں سود ایسی ملعون چیز کی اجازت بھی دے رکھی ہے اور جب سود کی اجازت ہے تو دیگر محرمات کی اجازت بدرجہ اولیٰ ہوگی۔ گویا جج صاحب کے مطابق اسلامی ریاست میں مسلمانوں کو تمام خوش فعلیوں کی اجازت ہے بس ذرا ''خاص حالات'' کا ہونا شرط ہے اور اس کے لئے بھی قرآن و سنت کو دیکھنے کی ضرورت نہیں، محترم جسٹس قدیر الدین کا ارشاد اس سلسلہ میں ''حرف آخر'' ہے اور ان کا یہ کہہ دینا کافی ہے کہ مسلمان چونکہ آجکل ''خاص حالات'' سے گزر رہے ہیں لہٰذا ان کو فلاں فلاں محرمات کی کھلی چھٹی ہے۔ یہ ہے وہ خالص اباحیت، جسے جج صاحب ''اجتماعی رخصت'' کے نظریئے سے اسلامی معاشرے میں

رائج کرنا چاہتے ہیں۔

جج صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ اسلام مسلمانوں کو اس طرح اجتماعی رخصتیں نہیں دیتا کہ ۳۱ سال تک بھی ان کا ضمیر صریح حرام چیز کے خلاف انگڑائی نہ لے۔

مسلمانوں کو حالات کے دھارے میں بہہ جانے کے لئے نہیں کہا گیا۔ بلکہ انہیں حالات کے دھارے بدلنے کی تلقین کی گئی ہے۔ انہیں زنا سے بدتر چیز کی اجتماعی رخصتیں نہیں دی گئیں، بلکہ ان پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اجتماعی فریضہ عائد کیا گیا ہے۔ جو شخص اسلام کی طرف ایسی اجتماعی رخصتوں کو منسوب کرتا ہے وہ نہ صرف اسلام سے، بلکہ خود عقل و دانش سے بے انصافی کرتا ہے۔

محترم جج صاحبان نے رخصت و اجازت کی بحث کے دوران ربا اور سود کے باہمی فرق کی بحث چھیڑی اور لطف یہ کہ اس میں بھی بجائے کوئی صاف اور منقح نتیجہ پیش کرنے کے مبہم اور غیر منضبط خیالات کا مغلوبہ پیش کر دینا ہی کافی سمجھا۔

اول تو یہ بحث ہی ان کے موضوع سے اَنمل اور بے جوڑ ہے۔ ربا اور سود دونوں ہم معنی ہوں، یا ان کے مفہوم میں کوئی فرق ہو، جب بینک کے سود کو وہ خود بھی حرام اور قطعی حرام سمجھتے ہیں اس صورت میں آخر اس غیر ضروری اور غیر متعلق بحث کا کیا جواز ہے؟ انہیں تو یہ بتانا چاہئے تھا کہ اس قطعی حرام کو وہ کس دلیل سے جائز ثابت کر رہے ہیں اور انہیں وہ کونسی مجبوری لاحق ہے جو یہودیوں کے ایجاد کردہ نظام سرمایہ داری کو برقرار رکھنے پر آمادہ کر رہی ہے۔ دوسرے، جب موصوف نے یہ بحث چھیڑ ہی لی تھی تو کم از کم اپنے قارئین کو یہ تو بتاتے کہ ربا یہ ہے اور سود اس کو کہتے ہیں اور یہ کہ ان دونوں کے درمیان یہ فرق ہے۔ مگر فاضل جج صاحب کا پورا مضمون پڑھنے کے بعد

بھی آدمی کو نہ سود اور نہ ربا کی اہمیت کا علم ہوتا ہے اور نہ ان دونوں کے درمیان وجہ فرق کا کوئی سراغ ملتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ بحث کو صاف نہیں کر سکتے تھے یا قصداً انہیں کرنا چاہئے تھا تو بحث کو چھیڑا ہی کیوں گیا؟ تیسرے موصوف نے یہ سوچنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی کہ وہ اس بحث میں جن عبارتوں کو نقل فرما رہے ہیں ان کا مفہوم ومدعا خود انہی کے خلاف تو نہیں جاتا ہے؟ مثلاً مولانا مفتی شفیعؒ کی عبارت کا جو اقتباس انہوں نے نقل کیا ہے اس میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ:

"ربا ایک عام اور وسیع مفہوم رکھتا ہے مروجہ سود بھی اسی کی ایک قسم ہے۔"

معمولی لکھا پڑھا آدمی بھی اس عبارت کا مطلب یہی کہے گا کہ ہمارے یہاں جو سود ہے اس کے ربا ہونے میں کوئی شک نہیں البتہ ربا صرف اس سود کو نہیں کہتے بلکہ اس کے علاوہ بھی بعض صورتیں ایسی ہیں جو شرعاً ربا کہلاتی ہیں اس عبارت سے یہ ثابت کرنا کہ ان دونوں لفظوں کے معنی الگ الگ ہے کیا صحیح طرز فکر ہے؟ ٹھیک ہے کہ ربا کا مفہوم عام ہے مگر اس کو واضح کرنا چاہئے تھا کہ ربا اور سود میں کیا فرق ہے؟ اس میں انہوں نے حضرت مفتی صاحب کی عبارت نقل کر کے اپنے موضوع سے متعلق یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

"قرض دیکر زیادہ لینا اصل ربا ہے اور کسی مال کو ویسے ہی زیادہ مال سے بدلنا متعلقات ربا میں سے ہے۔ متعلقات سود کی خلاف ورزی تو سود خوری نہیں ہے، مگر اعلیٰ مصلحت کے تحت رسول اللہ ﷺ کے حکم سے حرام قرار دی گئی ہے۔"

میں حیران ہوں کہ اس عبارت کو رقم کرتے ہوئے ایک فاضل جج کا دماغ

کام کر رہا تھا یا ایک ایسے ناواقف مبتدی کی طرح جو کسی بحث کی پیچیدگی میں الجھ کر رہ گیا ہو موصوف بھی اس میں الجھ کر رہ گئے تھے؟

اول تو آپ بحث بینک کے سود میں کر رہے ہیں اور اس کے بارے میں خود فرماتے ہیں کہ "قرض دے کر زیادہ مال لینا اصل سود ہے" ظاہر ہے کہ یہ تعریف بینک کے سود پر صادق آتی ہے۔ گویا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ بینک کا سود اصل ربا ہے جو نص قرآن سے قطعی حرام ہے تو آگے آپ متعلقات ربا کی بحث سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے آپ بحث تو یہ کر رہے ہیں کہ ربا اور سود ایک چیز نہیں مگر یہاں آ کر اصل بحث ہی کو بھول گئے اور ربا اور متعلقات ربا کے بجائے سود اور متعلقات سود کا لفظ استعمال کرنے لگے۔ کیا آپ کی اس عبارت کا یہ مفہوم نہیں کہ آپ ربا اور سود کو ایک ہی چیز فرما رہے ہیں؟ ہاں! سود اور متعلقات سود آپ کے بقول دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

تیسرے جب آپ کو خود بھی اعتراف ہے کہ آنحضرت ﷺ نے "ربا الفضل" کو ربا ہی قرار دیا ہے تو آپ کا اس کو سود خوری کی صف سے خارج کرنا کیا آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی کی گستاخانہ نفی نہیں! یعنی آنحضرت ﷺ صراحت سے فرماتے ہیں کہ ربا الفضل بھی سود ہے لیکن آپ فرماتے ہیں یہ سود نہیں۔ کیا دور جدید کے اجتہاد کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ امتی اپنے نبی کی تردید کرے تو مجتہد بن جاتا ہے؟ اور جب ربا الفضل کو بقول آپ کے اعلیٰ مصلحت کے تحت رسول اللہ ﷺ کے حکم سے حرام قرار دیا گیا تو نور نبوت نے جس اعلیٰ مصلحت کو ملحوظ رکھ کر اسے حرام قرار دیا تھا کیا اب آپ نے کوئی اس سے بھی اعلیٰ مصلحت اس کے حلال ہونے کی دریافت کر لی ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی کی عبارت میں ربا الفضل کو جو متعلقات ربا میں شمار کیا گیا ہے جس کا آخری ثمرہ سود خوری ہے یہ صریح لغزش اور ظلم ہے، ربا الفضل متعلقات ربا میں سے نہیں بلکہ خود ربا ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اور خود آنحضرت ﷺ نے بھی ربا الفضل کہہ کر اس کو ربا فرمایا ہے محترم جج صاحب اگر مولانا مودودی کی لغزش قلم کی کوئی صحیح تعبیر نہیں کر سکتے تھے تو انہیں کم از کم لوگوں کی غلطیوں پر اپنے نظریات کی کج عمارت تو کھڑی نہیں کرنی چاہئے تھی اس ضمن میں جج صاحب نے ایک عجیب لطیفہ رقم فرمایا ہے، لکھتے ہیں:

> ”یہاں یہ بھی ظاہر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ربا الفضل کا تقریباً وہ سارا قانون جس سے قدیم فتووں کے مجموعے مثلاً فتاویٰ عالمگیری بھرے پڑے ہیں آج کل کے حالات سے غیر متعلق ہوگیا ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں مال کو مال سے بدلا نہیں جاتا، اب مال کی خریداری مال سے بدل کر نہیں کی جاتی بلکہ روپے سے مال خریدا جاتا ہے یا کم از کم اس کی قیمت پہلے سے مقرر کر لی جاتی ہے۔“

اس بلند پروازی سے جس کے ذریعہ فتووں کے قدیم مجموعوں کو بیکار ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا اس کرۂ ارض پر نہیں بلکہ مریخ کی بلندیوں پر بیٹھا لکھ رہا ہے اگر جسٹس صاحب اسی زمین کا افسانہ رقم کر رہے ہیں تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ آج بھی مال کے بدلے مال کا لین دین روزانہ سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں مرتبہ ہوتا ہے اور دیہات میں نہیں شہروں میں ہوتا ہے جج صاحب کا یہ ارشاد پڑھ کر مرزا غلام احمد قادیانی صاحب کا استدلال یاد آتا ہے کہ چونکہ دنیا میں

اونٹ سے کار بن گئی لہٰذا میں مسیح ہوں۔

چلئے بطور فرض تسلیم کر لیا کہ ربا الفضل کا کاروبار گردش زمانہ نے متروک کر دیا اور اب دنیا کے کسی خطے پر مال کا تبادلہ مال سے نہیں ہوتا، اگر ہوتا ہے تو بقول جج صاحب اس کی عمر بہت کم ہے، لیکن جج صاحب نہیں جانتے کہ ان کے اس مفروضے کے نتائج کیا ہیں۔ سنئے ربا کی دو قسمیں ہیں۔ ربا الدین یعنی سود پر قرض دینا، اور ربا الفضل۔ یعنی مال کا مال کے ساتھ تبادلہ اضافہ کے ساتھ کرنا۔ ان میں پہلی قسم جج صاحب کے نزدیک سود ہے جو قطعی حرام ہے اور دوسری قسم متعلقات سود میں سے ہے جسے بقول ان کے اعلیٰ مصلحت کے تحت رسول اللہ ﷺ کے حکم سے حرام قرار دیا گیا۔ لیکن جسے وہ سود خوری کی فہرست سے خارج سمجھتے ہیں۔

اور ان کی تحقیقات کے مطابق اب دنیا سے متعلقات سود کا وجود ختم ہو چکا ہے۔ گویا دنیا میں اب جس سود کا رواج باقی ہے وہ صرف پہلی قسم کا ربا ہے جسے قرآن نے قطعی حرام قرار دیا ہے اس کا لین دین کرنے والوں کے خلاف قرآن کریم نے خدا اور رسول کی طرف سے اعلان جنگ کر رکھا ہے۔ اب جج صاحب خود ہی فرمائیں کہ کیا ان کی نئی تحقیق کا نتیجہ اس کے خلاف نہیں جاتا؟ اور کیا وہ اسی قطعی ربا کے حلال کرنے کے درپے نہیں جسے قرآن نے قطعی حرام کہا ہے؟

ربا ”سود“ چاروں ائمہ کے نزدیک متفقہ طور پر حرام ہے

ربا الفضل کی علت:

ایک طرف جج صاحب یہ بلند آہنگ دعویٰ بھی فرماتے ہیں کہ ربا الفضل کا

وجود دنیا سے اٹھ چکا ہے اور اس سے متعلق فتاویٰ کے قدیم مجموعہ غیر مؤثر ہو گئے ہیں مگر دوسرے ہی سانس میں وہ یہ بحث بھی شروع کر دیتے ہیں کہ:

''اس کے علاوہ ان احادیث کے متعلق جن میں ۶ چیزوں کو زیادتی کے ساتھ بدلنے کے عمل کو حرام کیا گیا ہے ہمارے علما کرام کا اس پر اتفاق نہیں کہ انہیں ۶ چیزوں کا بدلنا حرام ہو گیا ہے جن کا نام لے دیا گیا ہے یا وہ ۶ چیزیں مخصوص اشاروں کے طور پر ذکر کی گئی ہیں ایک گروہ کا کہنا ہے کہ......''

اور انہیں یہ خیال تک نہیں آیا کہ جس چیز کا وجود ہی بقول ان کے دنیا سے مٹ چکا ہو اس کے بارے میں اختلاف کی الف لیلہ دہرانے سے کیا مقصد؟ جس سود کا آج دنیا میں رواج ہے آپ اس کے بارے میں اپنے قیمتی افادات سے لوگوں کو مستفید فرمائیے، جو چیز آپ کے نزدیک متروکات سخن میں شامل ہو چکی ہے اس کی داستان سرائی شغل بے کاراں نہیں تو اور کیا ہے؟

لیکن نہیں! جج صاحب کا ان اختلافات کو جو دنیا سے مٹ چکے ہیں دہرانا خالی از علت نہیں۔ ان کا مقصد اسلام کے قطعیات میں تشکیک پیدا کرنا ہے وہ بھولے بھالے نادانوں کو جتانا چاہتے کہ سود کی حرمت کا مسئلہ کبھی بھی متفق علیہ نہیں رہا۔ انہیں اس سے غرض نہیں کہ جو کچھ وہ لکھوا رہے ہیں لائق قبول ہے یا نہیں؟ وہ واقعات کے مطابق ہے یا سراسر خلاف واقعہ؟ ان کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کا بھولا بھالا طبقہ جسے اسلامی علوم سے براہ راست واقفیت نہیں جب ایک ریٹائرڈ جج کے قلم سے نکلا ہوا یہ فقرہ سنے گا کہ ''سود کے مسئلہ میں علما میں اختلاف ہے'' تو فوراً چیخ اٹھے گا کہ سود کی حرمت پر اتفاق نہیں۔ بعض علماً اس کو جائز بھی کہتے ہیں لہٰذا اس کو بند نہ کیا جائے۔ یہ

ہے قطعیات دین سے برگشتہ کرنے کا وہ گر جس کو تمام ملاحدہ استعمال کرتے ہیں اور جس کی توقع ایک سنجیدہ فکر جج سے نہیں کی جانی چاہیے تھی۔

محترم جج صاحب ماشاء اللہ قانون کے ایک اچھے طالب علم اور عدالت عالیہ کے معزز رکن رہے ہیں، وہ قانون، قانون کی تشریح اور اس کی اہلیت و صلاحیت کے مسائل سے بے خبر نہیں، انہیں معلوم ہے کہ قانون کی تشریح میں ہر کس و ناکس کو بولنے کا حق نہیں ہے، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اگرچہ ماتحت عدالتیں بھی قانون کے مطابق ہی فیصلے کرتی ہیں، لیکن ہائی کورٹ کا فیصلہ ہی قانونی نظیر کی حیثیت سے لائق حوالہ سمجھا جاتا ہے، ان کی پوری زندگی کے تجربہ میں ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں آیا ہو گا کہ عدالت عالیہ میں کسی فاضل وکیل نے تمام ہائی کورٹوں کے متفقہ فیصلے کے خلاف اپنے دعوے کے اثبات کے لئے کسی تحصیل کے سب مجسٹریٹ کا حوالہ دیا ہو۔ اور اگر کسی نے بالفرض یہ جرأت کی بھی ہو تو فاضل جج نے اسے لائق اعتبار قرار نہیں دیا ہو گا۔

جج صاحب کو شاید معلوم نہیں کہ بقول شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، اسلامی قانون کی تشریح کے لئے مسلمانوں نے چار ہائی کورٹوں کو تسلیم کیا ہے جن کی دیانت امانت، صلاحیت، اہلیت اور فہم و فراست مسلم ہے، جنہیں دنیائے اسلام ائمہ اربعہ کے نام سے یاد کرتی ہے، جس مسئلہ پر ان کا اتفاق ہو گیا وہ اسلام کی عدالت عالیہ کا اجماعی مسئلہ ہے ان کی متفق علیہ تشریح کے مقابلے میں زید و بکر کا قول پیش کرنا، اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ پاکستان کے چار ہائی کورٹوں کے متفقہ فیصلہ کا توڑ کسی سب مجسٹریٹ کے فیصلے سے کیا جائے۔

ربا الفضل امت کے تمام مجتہدین کے نزدیک قطعی حرام ہے اور ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ یہ حرمت صرف انہی ۶ چیزوں تک محدود نہیں، ان کے مقابلے میں کسی

گرے پڑے کا قول نقل کر کے یہ کہنا کہ اس میں علماً کا اختلاف ہے، ایک ایسی بے اصولی ہے جس کی توقع ایک فاضل جج سے بہت بعید ہے۔ ایسی چیزوں میں اختلاف کا ہوا کھڑا کرنا نہ صرف مخلوق خدا کو گمراہ کرنے کے مترادف ہے بلکہ خود اپنے آپ کو بھی خوش فہمی میں مبتلا کرنا ہے۔

جج صاحب کے سارے مقالے کی جان بس یہی ہے کہ "علماً میں اختلاف ہے، وہ بغیر سوچے سمجھے اس کو بار بار دہراتے ہیں مگر یہ بات بھول جاتے ہیں کہ یہ "اختلاف" سود کی حرمت سے متعلق خدا اور رسول کے احکام کو باطل کرنے کے لئے نہیں، بلکہ ان کا دائرہ مزید بڑھانے اور پھیلانے کے لئے ہے، یعنی خدا اور رسول نے جن چیزوں میں سود کی حرمت کو صاف صاف بیان کر دیا ہے، وہ تو قطعی طور پر حرف آخر ہیں اس کے حرام ہونے میں کسی مسلمان کو شک نہیں، اور جو شک کرتا ہے وہ مسلمان نہیں، اس میں نہ کسی فقیہ اور کسی مجتہد کا اختلاف ہے، نہ اختلاف کی کوئی گنجائش ہے، اختلاف ہے تو صرف اس نکتہ پر کہ سود کی حرمت صرف انہی چیزوں تک محدود ہے جو اللہ تعالیٰ نے اور رسول اللہ ﷺ نے صراحتاً ذکر فرما دی ہیں یا ان سے آگے بڑھ کر دوسری چیزوں کو بھی یہ حرمت محیط ہے۔ لیکن ہمارے جج صاحب اس اختلاف کی آڑ میں خدا اور رسولؐ کے حرام کردہ قطعی سود کی حرمت (خالص حالات کے بہانے) حلال کرنا چاہتے ہیں میں نہیں سمجھتا کہ اس نتیجہ معکوس کو آخر کس چیز کا نام دیا جائے۔

پیداواری قرضوں کا سود:

ہمارے جج صاحب یا تو ربا قطعی حرام ہے کی گردان کر رہے ہیں یا اختلاف کی سیڑھی سے بینکوں کے سود کی حلت تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگے، ارشاد ہوتا ہے:

> "جس طرح قدیم علماً میں اختلافات ہوئے اسی طرح نئے تعلیم یافتہ حضرات نے بھی جدید طرز تحقیق کی بنا پر مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔"

قدیم علماً کے اختلافات کے بارے میں عرض کر چکا ہوں کہ اس افسانہ کو جج صاحب کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں اور پھر یہ بھی کہ ان اختلافات کی قیمت کتنی ہے؟ اور یہ بھی کہ یہ اختلاف حرمت سود کو باطل کرنے کے لئے نہیں بلکہ جج صاحب کے مدعا کے بالکل برعکس اس کا دامن مزید پھیلانے کے لئے تھے، رہی غیر تعلیم یافتہ حضرات کی جدید طرز تحقیق اس سلسلے میں فاضل جج نے دو نمائندہ نظریے پیش کئے ہیں ایک یہ کہ:

> "سید یعقوب شاہ کی تاریخی تحقیق یہ بھی ہے کہ اس زمانہ میں قرض، تجارت کرنے یا صنعت و حرفت قائم کرنے یا ان ذرائع سے نفع کمانے کے لئے نہیں لئے جاتے تھے، وہ قرض صرف استعمال کرنے کے لئے ہوتے تھے، پیداواری نہ تھے۔ اس لئے جو قرض پیداواری فرائض کے لئے لیا جائے اور دیا جائے اور اس میں قرض دینے والے کو اس رقم سے زیادہ رقم واپس ملے جتنی اسنے قرض دی تھی تو وہ ان کی تحقیق کے مطابق ناجائز نہیں ہے۔"

لیجئے! جج صاحب نے یعقوب شاہ کی شہادت سے بینک کے سود ہی کو نہیں بلکہ سود کی ان تمام صورتوں کو جو آج مروج ہیں بیک جنبش قلم حلال کرلیا، بس قرض لینے، دینے والے کو ذرا سی زحمت اٹھانا پڑے گی کہ وہ یہ کہہ دیا کرے کہ میں قرض

پیداواری مقاصد کے لئے لیتا دیتا ہوں۔ یہ ہے جدید طرز تحقیق جس کے ذریعہ قرآن کے قطعی حکم کو منسوخ کردیا جاتا ہے۔

سید یعقوب شاہ صاحب بقول جج صاحب کے مرحوم ہو چکے ہیں ورنہ ہمارے جج صاحب ان سے یہ دریافت فرماتے کہ سید صاحب! آپ کی یہ تاریخی تحقیق جس کے ذریعہ آپ قرآن کریم کے ایک قطعی حکم کو باطل کرنے کی جسارت کر رہے ہیں، قرآن کریم کی کس آیت میں مذکور ہے؟ احادیث کی کس کتاب میں اس کا ذکر ہے؟ دنیا کے کس فقیہ اور ماہر قانون اسلامی نے اس کی تصریح کی ہے؟ خدا تعالیٰ کے قطعی حکم کو ان من گھڑت مفروضوں سے باطل کرنا اسلام کی تعلیم ہے یا یہودیت کا خاصہ ہے؟

جج صاحب کو معلوم تھا کہ یعقوب شاہ کا یہ خانہ ساز مفروضہ قطعاً لچر اور غلط ہے لیکن چونکہ جج صاحب کا مقصود ہی ایک قطعی حکم کے بارے میں تشکیک پیدا کرنا ہے اس لئے انہوں نے فہم وفکر کے سارے دریچے بند کر کے اسے اخبار میں نقل کردیا، تاکہ بے علم لوگ پڑھیں اور پڑھ کر گمراہ ہوں۔ اور اس گمراہی کا اجر وثواب یعقوب شاہ کے ساتھ جج صاحب کی روح پرفتوح کو بھی پس از مرگ ملتا رہے۔ ضلوا فاضلوا۔

یعقوب شاہ کے اس گمراہ کن فتوے اور ان کی نام نہاد تاریخی تحقیق کو حقائق کی روشنی میں متعدد اہل علم باطل کر چکے ہیں، لیکن ایک موٹی سی بات یہ ہے کہ اگر اس تاریخی تحقیق میں ایک شمہ بھی صداقت ہوتو قرآن کریم سود خوروں کے خلاف اعلان جنگ کرنے کے بجائے مسلمانوں کو یہ تلقین کرتا کہ وہ استعمار مقاصد کے لئے نہیں بلکہ تجارت وصنعت اور حرفت وزراعت کی ترقی کے لئے سود کا لین دین کیا کریں۔ کیا جج صاحب کے نزدیک خدا تعالیٰ کو سید یعقوب شاہ جتنی معلومات بھی نہیں تھیں؟ آخر اس

نے یہ مفید تاریخی فتویٰ کیوں نہ دیا جو یعقوب شاہ مرحمت فرمارہے ہیں۔

جج صاحب نے سود کو حلال کرنے کے لئے دوسرا جدید نظریہ یہ پیش کیا ہے کہ:

"نئے تعلیم یافتہ حضرات کا ایک اور گروہ ہے جو کہتا ہے کہ کلام پاک میں جو آیات ربا کے متعلق ہیں ان میں فقط دوگنا اور چوگنا منافع کما کر ظلم کرنے کو حرام کیا گیا ہے۔"

لیجئے! سرے سے چھٹی مل گئی نہ کوئی دوگنا چوگنا سود لے اور نہ جج صاحب کے تعلیم یافتہ اصحاب کے مطابق اس پر حرمت سود کا فتویٰ صادر ہو، جو شخص ایک سو روپیہ قرض دیتا ہے وہ جج صاحب کے مطابق اس پر ایک سو ننانوے روپے ننانوے پیسے سود بغیر روک ٹوک کے وصول کرسکتا ہے لیکن اگر اس نے اس شرح سود پر ایک پیسہ زائد کا مطالبہ کردیا تو اسے خدا اور رسولؐ کے ساتھ لڑنے کے لئے میدان میں نکل آنا چاہیے، جج صاحب فرمائیں کہ کیا یہی فہم قرآن ہے جس کے زور پر اسلام کے قطعیات کو باطل کرنے کی جرأت کی جاتی ہے۔

معمولی عقل وفہم کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ کیا خدا کے گھر میں یہ اندھیر ہے کہ سو روپے پر ۱۹۹ روپے ۹۹ پیسے سود لینا تو اس کے نزدیک ظلم نہ ہو، لیکن ایک پیسہ مزید لینا ظلم بن جائے، اتنی بڑی رقم تو حلال ومطہر ہو، لیکن ایک پیسہ کے اضافہ پر وہ اعلان جنگ کرڈالے۔

اور پھر اگر قرآن کا یہی منشا ہوتا کہ دوگنا منافع تو ظلم ہے، اس سے کم ظلم نہیں تو اس پر چوگنا کی قید لگانا کیا مہمل بات نہیں۔ اور پھر قرآن تو یہ اعلان کرتا ہے کہ "اے مسلمانو! اپنے باقی ماندہ سود کی ایک ایک پائی چھوڑ دو، ورنہ خدا اور رسول کے

ساتھ لڑنے کے لئے میدان میں آجاؤ۔" اگر جج صاحب کے مطابق دوگنا چوگنا سود بھی حرام تھا اور اس سے کم حلال اور مطہر تھا تو خدا تعالی نے باقی ماندہ تمام سود کو چھوڑ دینے کا کیوں حکم فرمایا۔ اور یہ اعلان کیوں نہ کر دیا کہ جن لوگوں کا سود دوگنا چوگنا نہیں وہ بدستور وصول کرتے رہیں۔

جج صاحب کے نئے تعلیم یافتہ حضرات نے جس آیت سے اپنا غلط و گمراہ کن نظریہ اخذ کرنے کی کوشش کی ہے اس کا مطلب نہ جج صاحب نے سمجھا ہے نہ ان صاحبان نے، اس آیت میں جس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جب سود کی لعنت کسی معاشرے پر مسلط ہوجاتی ہے تو وہ کسی حد پر جاکر رکنے کا نام نہیں لیتی بلکہ ''مفرد سود'' رفتہ رفتہ سود در سود بن جاتا ہے اور اکاس بیل کی طرح غریب مقروض کے گھر بار اور اثاثے تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، جن غریب لوگوں کو سا ہوکارہ سود کا تجربہ ہے وہ شہادت دیں گے کہ بسا اوقات دادوں کے زمانہ کا سود پوتوں کے دور تک بھی بے باق نہیں ہوسکا، خود پاکستان اس سودی سرطان کی لپیٹ میں جس بری طرح آچکا ہے وہ بجائے خود لرزہ خیز ہے، اس وقت ملک ستر اسی ارب روپے کا مقروض ہے اور سود کی یہ مہیب رقم اتنی ہے کہ پاکستان کی آئندہ نسلیں بھی اس کو ادا نہیں کر پائیں گی، اندرون ملک حکومت نے جو سودی قرضے لے رکھے ہیں وہ بیش برآں ہیں، یہی وہ قرآنی حقیقت ہے جس کو یہ کہہ کر منع کیا گیا ہے: "یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً." (آل عمران: ۱۳۰)۔ (اے مسلمانو! مت کھاؤ سود دونے سے دونا) اس کا یہ مطلب سمجھنا کہ کہ دونے سے دونا سود تو حرام ہے اور اس سے کم لیا جائے تو حلال ہے قرآن فہمی کا عجوبہ ہے۔

دار الحرب میں سود:

فاضل جج صاحب نے شاید یہ عہد کر کے قلم اٹھایا کہ دلیل و منطق کی ساری بوالعجبیاں وہ اسی ایک مضمون میں جمع کر دیں گے جج صاحب نے کہیں پڑھ لیا ہے کہ "لا ربا فی دار الحرب بین المسلم و الحربی." اس کا مطلب سمجھنے کی ضرورت محسوس کئے بغیر انہوں نے اس پر اپنے کج نظریات کی بنیاد اٹھانا شروع کردی وہ فرماتے ہیں:

> "یہ حقیقت ہے کہ فقہا نے ربا کو حرام جانتے ہوئے بعض خاص حالات کی موجودگی میں اس کو جائز قرار دیا ہے، مثلاً امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ دار الحرب میں یعنی ایسے ملک میں جہاں اسلامی حکومت نہ ہو، چند شرائط کے ساتھ مسلمانوں کے لئے سود دینا اور لینا جائز ہے، اس کے علاوہ چند اور حالات میں بھی یہ عمل جزوی طور یا کلی طور پر روا رکھا گیا ہے۔"

جج صاحب کی یہ ساری عبارت خوش فہمی و بوالعجبی کا مرقع ہے اول تو جج صاحب کی تحقیق بڑی دل چسپ ہے کہ ایک چیز حرام بھی ہو اور جائز بھی ہو۔ سوال یہ ہے کہ جس حالت میں کوئی چیز حرام ہے عین اسی حالت میں وہ جائز کیسے ہوئی۔ اور اگر جائز ہے تو حرام ہونے کے کیا معنی؟ حرام ناجائز ہی کو تو کہتے ہیں۔ ایک ہی چیز بیک وقت جائز اور ناجائز ہو تو ضدین کا اجتماع ہے۔ اگر ان کا یہ مفروضہ ایک لمحہ کے لئے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ بعض حالات میں فقہا نے ربا کو جائز قرار دیا ہے تو کیا ان کے خیال میں فقہا اتنے بے سمجھ تھے کہ انہی حالات میں ربا کو حرام بھی سمجھتے۔ دوسرے، جج صاحب نے امام ابوحنیفہؒ کی جو مثال دی اسے افسوسناک غلط فہمی کہا جاسکتا ہے۔

امام صاحب کا مطلب یہ نہیں کہ ربا دارالحرب میں جاکر مسلمانوں کے لئے حلال ہوجاتا ہے بلکہ ان کا ارشاد یہ ہے کہ حربی کافر کا مال مسلمانوں کے لئے حلال ہے اور اگر کوئی مسلمان دارالحرب میں جائے تو بغیر نقض عہد کے اس کے مال کو لے سکتا ہے خواہ سود کے نام سے یا کسی اور عقد کے ذریعے، اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص کے لئے زکوٰۃ حلال ہے آپ اس کو کچھ رقم انعام یا تحفہ کہہ کر دے دیں اور نیت زکوٰۃ کی کریں، تو وہ اس کے لئے حلال ہوگی اس کی صورت اگرچہ انعام یا تحفہ کی ہے مگر حقیقتاً یہ انعام نہیں زکوٰۃ ہے، اسی طرح حربی کافر کا مال مسلمان کے لئے حلال ہے، جبکہ اسے شرعی طریقے سے حاصل کیا جائے اس کی ظاہری شکل خواہ سود کی ہو، یا عقد فاسد کی، گویا حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حربی کافر سے دارالحرب میں جو مال لیا جائے وہ صرف صورت کے اعتبار سے سود ہے درحقیقت سود نہیں۔ اس لئے فاضل جج صاحب کا یہ کہنا کہ امام ابوحنیفہؒ نے سود کو جائز قرار دیا ہے شدید غلط فہمی یا مغالطہ اندازی ہے۔

اور یہ حکم بھی صرف مسلم مستامن کے لئے ہے جو چند روز کے لئے دارالحرب میں جاتا ہے، وہاں کے مسلمانوں سے وہ یہ معاملہ نہیں کرسکتا اور نہ اس حربی کافر سے یہ معاملہ جائز ہے، جو دارالاسلام میں اجازت لے کر وارد ہوا ہو۔ اور میں اس فقہی بحث کو یہاں ذکر نہیں کرنا چاہتا کہ یہ قول راجح ہے یا مرجوح؟ اور اس پر فتویٰ دینا صحیح ہے یا نہیں، اس لئے کہ جو لوگ قرآن کریم کے صریح احکام کو اپنی خواہشات کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھا دینا صحیح سمجھتے ہیں اور انہیں دوگنے چوگنے سود کا مفہوم سمجھنے میں بھی دقت پیش آتی ہے، ان کے سامنے ان فقہی اور اصولی مباحث کا دوہرانا عبث ہے۔

تیسرے، فرض کیا کہ امام ابوحنیفہؒ نے دارالحرب میں سود کے جواز کا فتویٰ دے دیا تھا مگر ہمارے جج صاحب کو اس سے کیا حاصل ہوا، کیا وہ چشم بددور پاکستان کو بھی دارالحرب سمجھتے ہیں، اس سوال کا جواب جج صاحب نے یہ دیا ہے کہ پاکستان دستوری اور قانونی لحاظ سے دارالاسلام ہے مگر معاشی لحاظ سے دارالحرب ہے۔ اگر جج صاحب کی اس عجیب وغریب منطق کو درست تسلیم کرلیا جائے تو اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمیں جلد از جلد اس دارالحرب میں نظام معاشیات کو بدل کر پاکستان کو اس شعبہ میں بھی دارالاسلام بنانا چاہئے نہ یہ کہ بقول جج صاحب اسے بدستور دارالحرب ہی رہنے دینا چاہئے۔

برخود غلط استدلال:

جج صاحب کو شکایت ہے کہ لوگ خواہ مخواہ بینک کے سود کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں حالانکہ سود کا رواج بقول ان کے اس سے زیادہ بدنما شکل میں موجود ہے اور بینک کا سود تو وہ پاک اور مطہر چیز ہے کہ مصر کے ایک عالم محمد عبدہ نے اس کے حلال ہونے کا فتویٰ دیا اور جج صاحب کی معلومات یہ ہیں کہ کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ اگر کسی کا نام لے دینے ہی سے سود حلال ہوجاتا ہے تو ہمارے جج صاحب نے مصر جانے کی خواہ مخواہ زحمت فرمائی۔ میں ان کو ہندوستان ہی کے کئی سر پھروں کے نام بتاسکتا ہوں جنہوں نے اپنی ذہانت اور طباعی کے سارے جوہر اس حرام کو حلال کرنے کے لئے لگائے۔ اور دور کیوں جائیے جس طرح جج صاحب نے یعقوب شاہ کا حوالہ دیا تھا۔ اگلی صدی کے لوگ (جس میں صرف دوسال کا عرصہ باقی ہے) خود ہمارے جج صاحب کا حوالہ دینے لگیں گے کہ پاکستان کے ایک ممتاز قانون دان علامہ جسٹس قدیر الدین صاحب نے اخبار جنگ میں فتویٰ جاری فرمایا تھا کہ بوقت

ضرورت سود مطلقاً جائز ہے، لیکن کیا دور جدید کے مجتہدوں کی اس متواتر کوشش سے خدا کی حرام کی ہوئی چیزیں حلال ہو جائیں گی؟ جج صاحب بھولتے ہیں، ایک محمد عبدہ نہیں اگر دنیا کے سارے انسان سود کو حرام کے بجائے حلال و مطہر کے فتوی دینے لگیں تو خدا کا قانون جوں کا توں رہے گا، البتہ ایک قطعی حرام کو حلال سمجھ کر یہ سارے لوگ گمراہ کہلائیں گے۔

مسلمانوں کے پاس خدا تعالیٰ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کے مقدس ارشادات حق و باطل کا پیمانہ ہیں جو شخص اس پیمانے پر پورا اترے گا وہ حق پر ہے اور جو اس سے انحراف کر کے اپنی من مانی خواہشات کی پیروی کرتا ہے، وہ گمراہ ہے، خواہ وہ ایک فرد ہو یا دس لاکھ، یا ساری دنیا کے انسان۔

دور جدید کے مدعیان اجتہاد، جو اردو ترجمہ کے بغیر قرآن کریم کی ایک آیت کا ترجمہ نہیں کر سکتے، نہ عربی قواعد کے مطابق عربی کی ایک سطر صحیح پڑھ سکتے ہیں، انہیں یہ غلط فہمی ہے کہ دنیا ان کو بھی امام ابوحنیفہؒ و امام شافعیؒ سمجھ لے گی، یہ حضرات نہ اجتہاد کے قیود و شرائط کو جانتے ہیں نہ اس کے اوصاف و آداب سے باخبر ہیں ہر وہ شخص جو کسی اردو ترجمہ کی مدد سے اسلامی مسائل کو دیکھ لیتا ہے وہ سیدھا اجتہاد کی مسند پر جا بیٹھتا ہے اور دین کے قطعیات میں کتر بیونت کا نام اجتہاد رکھ لیتا ہے:

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

حدیث نبوی سے استدلال:

جناب جج صاحب نے ایک بہت ہی خوبصورت دلیل حدیث نبوی سے دی جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

"لیاتین علی الناس زمان لایبقی أحد الا آکل الربوا فان لم یاکله أصابه من بخاره، ویروی من غباره." (مشکوٰۃ ص:۲۴۵)

ترجمہ:...... "لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ کوئی انسان سود سے بچا نہیں رہے گا جو سود نہیں کھائے گا وہ بھی اس کی گرد سے بچ نہیں سکے گا۔"

جج صاحب اس مدح کو نقل کر کے تجاہل عارفانہ کے طور پر دریافت فرماتے ہیں "کیا یہ حدیث عارضی رخصت کے جواز کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں؟"

سبحان اللہ دلیل ہو تو ایسی ہو، جج صاحب قرآن فہمی کے نمونے تو پہلے پیش کر چکے تھے مگر حدیث فہمی کا نمونہ اب پیش فرمایا۔ میرے خیال میں جج صاحب نے مسلمانوں کے ساتھ انصاف نہیں فرمایا، ورنہ وہ اپنی اس دلیل کو ذرا آگے پھیلاتے تو صرف سود ہی سے نہیں بلکہ پورے دین ہی سے ہمیں چھٹی دلا سکتے تھے، یہ حدیث تو کہیں جج صاحب کی نظر میں ضرور گزری ہوگی کہ:

"یاتی علی الناس زمان الصابر فیهم علی دینه کالقابض علی الجمر." (ترمذی ج:۲ ص:۵۰)

ترجمہ:...... "لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ ان میں سے دین پر صبر کرنے والے کی مثال ایسی ہوگی کہ کوئی شخص دہکتے انگاروں سے مٹھی بھر لے۔"

ظاہر ہے کہ انگاروں سے مٹھی بھرنا کتنا مشکل ہے، اور جب دین پر چلنا

انگاروں پر ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہوا تو جج صاحب ایسے نازک مزاج لوگوں سے اس کا تحمل کب ہو سکے گا؟ لہٰذا یہ حدیث بقول جج صاحب پورے دین کو چھوڑ دینے کے جواز کی دلیل ٹھہری۔ اگر غبار کی حدیث سے سود کی رخصت مل سکتی ہے تو انگاروں کی حدیث سے پورے دین ہی سے چھٹی مل جاتی ہے۔ نعوذ باللہ۔ اور جج صاحب نے اس پر بھی غور نہیں فرمایا کہ جس حدیث کو وہ پیش کر رہے ہیں اسی میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ''جو سود نہیں کھائے گا وہ اس کی گرد سے نہیں بچ سکے گا۔'' گویا اسی حدیث میں یہ بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ سود کا لینا نہ لینا تو اختیاری امر ہے اس پر تو گرفت ہوگی لیکن جو شخص براہ راست سود کی نجاست میں ملوث نہیں اسے سود کا جو غبار غیر اختیاری طور پر پہنچے گا اس پر اسے گرفت نہیں ہوگی، بلکہ جو لوگ اس گرد و غبار کے اڑانے کے براہ راست ذمہ دار ہیں اس کا وبال بھی انہیں پر ہوگا۔

فرمایئے! اس حدیث میں مسلمانوں کو براہ راست سود میں ملوث نہ ہونے کی تلقین کی گئی ہے؟ یا جج صاحب کے بقول اس کے برعکس مسلمانوں کو سود خوری کی رخصت دی گئی ہے؟

ربا اور سود:

فاضل جج کی ایک زبردست تحقیق یہ ہے کہ سود کی حرمت اسلام کے نظام زکوٰۃ کے ساتھ مشروط ہے جب تک زکوٰۃ و عشر کا نظام ملک میں رائج نہ ہو جائے اور بقول ان کے غربت و ناداری، محتاج کا علاج اور حکومت کی ضروریات کا انتظام نہ ہو جائے سود کو بند کرنے کے لئے کوئی اقدام نہیں ہونا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام کا نظام زکوٰۃ غربت و ناداری کا صحیح اور مؤثر علاج ہے اور اس کو صحیح طور پر

کامیاب بنانا چاہئے، مگر بڑے غور و فکر کے بعد بھی جج صاحب کا یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکا کہ سود کی بندش نظام زکوٰۃ سے کیسے مشروط ہے، جج صاحب بے خبر نہیں ہوں گے کہ بینک سے قرض لینے والے غریب غرباء نہیں بلکہ امیر کبیر ہی اس شرف سے مشرف ہو سکتے ہیں۔ اب اگر ملک میں نظام زکوٰۃ رائج ہو جائے تو کیا ان سیٹھ صاحبان کی مدد آپ زکوٰۃ سے کیا کریں گے؟ اور بینک میں جن لوگوں کی رقوم جمع ہوتی ہیں اور بینک جنہیں سود دیتے ہیں وہ بھی محتاج و مسکین نہیں ہوتے، بلکہ کھاتے پیتے لوگ ہی ہوتے ہیں کیا آپ ان کو زکوٰۃ دلانے کی سفارش کرتے ہیں؟

بحث تو یہ ہے کہ موجود بینکاری نظام کو جو سود پر مبنی ہے، بدل کر ایک ایسا نظام وضع کرنا چاہئے جو سود کی لعنت سے پاک ہو، اس میں زکوٰۃ کا نظام کیا کردار ادا کرے گا غالباً جج صاحب کا مفروضہ یہ ہے کہ سود کا لین دین محض احتیاج اور مجبوری کی وجہ سے ہوتا ہے حالانکہ یہ بات انفرادی سود کے بارے میں صحیح ہو تو ہو ورنہ بینک کے سود کے بارے میں قطعاً غلط ہے، بینک کا سودی کاروبار غربت و احتیاج کی پیداوار نہیں بلکہ سیر شکمی کی بدہضمی کی ڈکار ہے۔ بینکاری نظام غریبوں، محتاجوں کی ایجاد نہیں بلکہ ساہوکار یہودیوں کی اختراع ہے اور بینک کے سود کا لین دین کرنے والے بھی غریب محتاج نہیں بلکہ کاروں، کارخانے والے پیٹ بھرے لوگ ہیں، اس لئے سود کی بندش کو نظام زکوٰۃ سے مربوط کرنا موصوف کی ذہنی اختراع ہے جو دلائل و واقعات کی میزان میں کوئی وزن نہیں رکھتی۔

سودی بینک کی برکات:

فاضل جج نے بینکوں کی مدح سرائی اور قصیدہ خوانی بھی فرمائی ہے ارشاد ہوتا

"سودی بینک جو ایک بہت بڑا کام کرتے ہیں وہ یہ
ہے کہ لوگوں کی بچت کو سمیٹ کر صنعت وحرفت کے قائم کرنے
اور بڑھانے کے لئے مہیا کرتے ہیں یہ روپیہ ان کے پاس اس
وجہ سے آتا ہے کہ لوگوں کو منافع کا یقین ہوتا ہے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ جج صاحب کے مزاج کو سود کے غبار نے بالکل سودی مزاج بنادیا ہے اس لئے انہیں یہ خطرہ ہے کہ خدانخواستہ سود بند ہوگیا تو بینک بند ہوجائیں گے اور بینک نہ رہے تو صنعت وحرفت کا سارا کاروبار ٹھپ ہوجائے گا۔ ان کا دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ لوگ بینک میں رقم صرف "سود" کے لالچ میں جمع کراتے ہیں، جب لوگوں کو پتہ چلا کہ اب یہ "اکل حرام" بند ہوا چاہتا ہے تو کوئی بینکوں کی طرف منہ بھی نہ کرے گا۔ حالانکہ اگر وہ سود کا غبار جھاڑ کر حالات کا جائزہ لیتے تو انہیں سب سے پہلے تو یہ نظر آتا کہ آج کے دور میں پس انداز کو بینکوں میں جمع کرانا محض سود کے لالچ کی وجہ سے نہیں بلکہ انسان کی مجبوری بن چکی ہے اور دوسری بات انہیں یہ نظر آتی کہ سود کے بند ہونے کے معنی یہ نہیں کہ آئندہ بینک میں رقم جمع کرانے والوں کو کوئی منافع نہیں ملے گا بلکہ اب جو سود کی شرح معین کرکے اسے حرام کرلیا جاتا ہے اگر بینک اسلامی نظام معیشت کے مطابق چلائے جائیں تو انہیں یہی منافع بلکہ اس سے بڑھ کر حلال شکل میں ملے گا، جس کی کوئی معین شرح نہیں ہوگی بلکہ بینک کے جملہ منافع کو سال چھ ماہ بعد (جیسی صورت قرار پائے) حصہ داروں کی رقوم پر حصہ رسدی تقسیم کردیا جائے گا اور جب لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ان کی جمع شدہ رقم پر منافع ایسا ملتا ہے مگر حرام شکل میں نہیں بلکہ حلال صورت میں تو یہ بات ان کے لئے مزید ترغیب کا موجب ہوگی اور بہت سے ایسے لوگ جو اس حرام سے بچنے کے لئے اپنی

رقمیں بینک میں جمع نہیں کراتے تھے، وہ اپنی رقمیں بنک کے حوالے کرنے لگیں گے۔

الغرض جج صاحب سود بند کرنے کے معنی بینکاری نظام کو ختم کرنے کے سمجھتے ہیں تو یہ ان کی غلط فہمی ہے اس نظام کو ختم کرنا مقصود نہیں بلکہ اس کی ایسی اصلاح اور تبدیلی مقصود ہے کہ وہ اسلامی معاشیات کے تقاضوں کو پورا کرسکے اور جو بینک آج یہودیوں کے ساہوکارانہ نظام کی مشین کے کل پرزے بنے ہوئے ہیں وہ اسلامی نظام معیشت کے کل پرزوں کی حیثیت سے کام کرنے لگیں۔ ہمیں تسلیم ہے کہ یہ بے حد پیچیدہ کام ہے اور اس کیلئے بڑی صلاحیت اور مہارت اور محنت وتوجہ کے ساتھ ساتھ کافی وقت درکار ہے مگر اس کے یہ معنی تو نہیں کہ ہم موجودہ نظام ہی کو "سب اچھا" کہہ کر بیٹھ جائیں۔ اور ہماری وہ حالت ہو جو حدیث نبویؐ میں فرمائی گئی ہے:

"ود یأتی على الناس زمان لایبالی المرء ماأخذ
منه أمن الحلال أم من الحرام." (صحیح بخاری ج:۱ ص:۲۷۶)

ترجمہ:..... "لوگوں پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ آدمی کو
کچھ پرواہ نہیں ہوگی کہ وہ حلال لیتا ہے یا حرام؟"

جج صاحب کے مقالے کی بنیادی منطق یہی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر ڈال دینا چاہئے، اور انہیں حلال وحرام کا احساس نہیں دلانا چاہئے نہ حرام سے بچنے کیلئے کوشش کرنی چاہئے۔

ایک معقول بات:

جج صاحب نے اپنے پورے مقالے میں ایک معقول بات یہ لکھی ہے کہ سود کو فوری طور پر بند کرنا ممکن نہیں ان کے اس ارشاد سے ہمیں سو فیصدی اتفاق ہے لیکن انہیں شاید کسی نے غلط بتادیا ہے کہ حکومت راتوں رات اس نظام کو ختم کرنے کا عزم

رکھتی ہے، اور کل جب آفتاب طلوع ہوگا تو ملک سود کی لعنت سے پاک ہو چکا ہوگا۔

جج صاحب کو مطمئن رہنا چاہئے ایسا کسی کا کوئی ارادہ نہیں، نہ دنیا کا کوئی عاقل اس کا مطالبہ کرسکتا ہے اور نہ اس پر عمل کیا جاسکتا ہے ایک مدت تو متبادل انتظام کا خاکہ تیار کرنے پر لگے گی۔ اور پھر ایک عرصہ اس خاکہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے درکار ہوگا اور جوں جوں اسلام کا معاشی نظام مستحکم ہوتا جائے گا اسی تناسب سے وہ موجودہ نظام کو اپنی جگہ خالی کرنے پر مجبور کرتا جائے گا، اور بالآخر یہ پورے کا پورا نظام بدل جائے گا۔ اس میں کتنا عرصہ لگے گا؟ اس کا انحصار متعلقہ اداروں کی محنت و خلوص، دیانت و امانت اور ذہانت و صلاحیت پر ہے اور اگر جج صاحب ایسے اکابر نے اس کی حوصلہ افزائی کے بجائے حوصلہ شکنی کی ٹھان لی تو ممکن ہے کہ ۳۱ برس اور گزر جائیں پھر بھی قیام پاکستان کے مقاصد کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو ـــــ ورنہ اگر کام کرنے والے لگن اور خلوص سے کام کریں اور پوری قوم سود کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا تہیہ کرے تو چند ہی سالوں میں اس نظام کو بدل کر زمانے کے دھاروں کو دوسری سمت بہنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔

(افتتاحیہ صفحہ اقرأ روزنامہ جنگ کراچی ۲۹ دسمبر ۱۹۷۸ء)

زکوٰۃ وعشر آرڈی نینس...
چند اشکالات، چند تحفظات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۶ر شعبان المعظم ۱۴۰۰ھ مطابق ۲۰ر جون ۱۹۸۰ء کو اسلام آباد کی مرکزی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے بعد صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے زکوٰۃ وعشر کے آرڈی ننس کا اعلان کیا۔ موجودہ حکومت اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے جن مساعی جمیلہ کا مظاہرہ کر رہی ہے، نظام زکوٰۃ کے نفاذ کا اعلان بھی اسی کی ایک اہم کڑی ہے، جس کا بجا طور پر پورے ملک میں بھرپور خیر مقدم کیا جائے گا، نظام زکوٰۃ اگر صحیح صورت میں معاشرہ میں رائج ہوجائے تو کوئی شبہ نہیں کہ نہ صرف ہمارا ملک ایک فلاحی معاشرہ کی حیثیت سے بڑی حد تک سکون و اطمینان کا گہوارہ بن سکتا ہے بلکہ یہ آج کے باطل نظاموں کو چیلنج بھی کرسکتا ہے، لیکن یہ نظام کس حد تک کامیاب ہوتا ہے اس کا مدار حکومت کے حسن اخلاص، متعلقہ عملہ کی عمدہ کارکردگی اور اسلامیان پاکستان کے حقیقی تعاون پر موقوف ہے۔

اس قانون کے تحت حکومت کی طرف سے گیارہ مالیاتی اداروں کی فہرست ایسی رکھی گئی جن سے زکوٰۃ جبراً وصول کرلی جائے گی، یعنی بینک اور دیگر متعلقہ اداروں میں ان کھاتے داروں کی جو رقم جمع ہوگی زکوٰۃ کا سال شروع ہونے پر اس کے اڑھائی فیصد کی کٹوتی خود بخود کرلی جائے گی، چنانچہ ۲۰ر جون کو نفاذ زکوٰۃ کا اعلان ہوا اور ۲۱ر جون کو یہ کٹوتی شروع ہوگئی (اور اخباری اطلاع کے مطابق ایک ارب روپیہ

زکوٰۃ فنڈ میں جمع کیا گیا) زکوٰۃ کی اس کٹوتی پر بعض حلقوں کی طرف سے اشکال پیش کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ جن مالیاتی اثاثوں پر حکومت نے زکوٰۃ تشخیص کی ہے ان میں سے اکثر وہ ہیں جن پر بینکوں اور دیگر اداروں کی طرف سے کھاتے داروں کو منافع کے نام سے سود دیا جاتا ہے، اسی کے کچھ حصے کو حکومت زکوٰۃ کے نام سے کاٹ رہی ہے، روپیہ پر زکوٰۃ کی کٹوتی کے معنی یہ ہیں کہ سود کا ایک حصہ کاٹ لیا گیا یا دوسرے لفظوں میں شرح سود کی تخفیف کردی گئی ہے، فرض کیجئے کہ ایک شخص کا بینک میں ایک ہزار روپیہ جمع ہو، بینک اسی رقم پر اسے دس بارہ فیصد کی شرح سے سود دیتا ہے لیکن قانون زکوٰۃ کے مطابق اس دس بارہ فیصد کا ایک حصہ (اڑھائی فیصد) کاٹ کر زکوٰۃ فنڈ میں جمع کردیا جائے گا تو کھاتے دار کے حق میں یہ شرح سود میں تخفیف کی ایک صورت ہوئی کہ پہلے اسے اگر دس فیصد سود ملتا تھا تو اب اس کی شرح گھٹ کر ساڑھے سات فیصد رہ گئی، سوال یہ ہے کہ کیا سود کا ایک حصہ چھوڑ دینے یا کم کردینے سے زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے؟

دوسرا خدشہ یہ ہے کہ زکوٰۃ میں نیت شرط ہے، جب تک زکوٰۃ ادا کرتے وقت نیت نہ کی جائے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، مثلاً اگر کسی سے روپیہ چھین لیا جائے تو اس سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوگی، جن لوگوں کی رقوم سے بینک یا دوسرے ادارے کٹوتی کریں گے ان کو یہی معلوم نہیں کہ ان کی رقم پر کتنی کٹوتی کی جارہی ہے، نہ انہوں نے اس کٹوتی کے وقت خود زکوٰۃ کی نیت کی ہے، نہ ادائے زکوٰۃ کے وقت کسی کو وکیل بنایا ہے اس صورت میں بغیر نیت کے ان کی زکوٰۃ کس طرح ادا ہوگی؟ امید ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے فاضل ارکان جنہوں نے قانون زکوٰۃ کا مسودہ وضع کیا ہے، ان خدشات کا قابل اطمینان حل تلاش کریں گے۔

زکوٰۃ کے مصارف میں رفاہی اداروں، مثلاً شفاخانے، سڑکوں وغیرہ کی تعمیر کو بھی شامل کیا گیا ہے، جہاں تک شریعت اسلامی کی روشنی میں ہمیں علم ہے زکوٰۃ کی رقم کا کسی فقیر، محتاج کو مالک بنانا ضروری ہے، ظاہر ہے کہ اس قسم کے ادارے کسی کی ملک نہیں ہوں گے، ان پر زکوٰۃ کا روپیہ کس طرح صرف کیا جائے گا؟ کیا ان اداروں کی تعمیرات پر زکوٰۃ لگانا اور ان کے عملے کی تنخواہیں زکوٰۃ سے ادا کرنا صحیح ہوگا؟ اور اگر زکوٰۃ کو اس کے صحیح مصرف پر خرچ کرنے کی ضمانت نہ ہو تو زکوٰۃ دینے والوں کو اس پر اعتماد کیسے ہوگا؟

زکوٰۃ کے لئے مرکزی، صوبائی اور مقامی سطح پر انتظامی کونسلیں اور کمیٹیاں مقرر کی گئی ہیں، جس کے کچھ ارکان عدلیہ سے، کچھ عوامی نمائندوں سے اور کچھ سرکاری ملازمین سے لئے جائیں گے، مثلاً مرکزی کونسل میں بعض وفاقی وزارتوں کے سیکرٹری، صوبائی کونسلوں میں صوبائی وزارتوں کے سیکرٹری اور ضلع کونسلوں میں ڈپٹی کمشنر صاحبان بھی کونسل کے رکن ہونگے لیکن کسی جگہ یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ ان کا مسلمان ہونا بھی شرط ہے، فرض کیجئے کہ کسی ضلع کا ڈپٹی کمشنر کسی غیر مسلم اقلیتی فرقہ سے تعلق رکھتا ہے تو یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ وہ بھی ضلعی کونسل کا رکن ہوگا یا نہیں؟ بلکہ قانون کے اطلاق کا مقتضی یہ ہے کہ وہ بھی زکوٰۃ کونسل کا رکن ہوگا، اسلامی نظریاتی کونسل کو اس نکتہ پر بھی روشنی ڈالنی چاہئے کہ کسی خالص دینی نظام کو چلانے والی انتظامیہ میں غیر مسلم بھی شریک ہوسکتے ہیں؟ اگر نہیں ہوسکتے تو اس الجھن کا حل کیا ہے؟

جناب صدر نے زکوٰۃ کے نفاذ کا اعلان مسجد سے کرکے ایک بہترین اسلامی روایت کو زندہ کیا ہے اور اس ملک میں پہلی بار اس امر کا عملی مظاہرہ ہوا ہے کہ اسلامی نظام حیات کا مرکز مسجد ہے، چنانچہ صدر مملکت کے اس عمل کو بنظر استحسان دیکھا گیا

اور اس پر مسرت اور خوشی کا اظہار کیا گیا ہے، بہتر ہوتا کہ اس دینی روایت کی از سر نو طرح ڈالتے ہوئے اسے دور جدید کی آلائشوں سے پاک اور مسجد کو کیمرہ مینوں کی یلغار سے محفوظ رکھا جاتا، یہاں اس سے بحث نہیں کہ تصویر شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟ اس سے قطع نظر مسجد کا تقدس اس امر کا متقضی تھا کہ اس دینی مرکز کو فلم سازی کے مرکز میں تبدیل نہ کیا جاتا، اس نیک عمل میں آمیزش سے جہاں اہم اعلانات مسجد سے کرنے کی روایت قائم ہوئی ہے وہاں عین مسجد میں تصویر اور فلم سازی کی بدعت کا آغاز بھی ہوا ہے ورنہ اس سے قبل لوگ عام طور سے مسجد میں اس سے احتراز ضروری سمجھتے تھے، مگر اس سے اب احتراز تو کیا، اس کو کسی درجے میں برائی بھی تصور نہیں کیا جائے گا، جناب صدر کا یہ عملی نمونہ لوگوں کے لئے سند جواز بن جائے گا، اور رفتہ رفتہ مسجدوں میں نماز کے بجائے تصویر بنانے کا رواج چل نکلے گا۔

(افتتاحیہ صفحۂ اقرأ روزنامہ جنگ کراچی ۲۷/ جون ۱۹۸۰ء)

بلاسود بینکاری کا آغاز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جنوری ۱۹۸۱ء سے ملک بھر کے تمام بینکوں میں بلاسودی بینکاری کا آغاز کیا گیا، اور تمام بینکوں میں ایک کاؤنٹر ایسا کھولا گیا جس میں سود سے پاک کھاتے کھولنے کی گنجائش نکالی گئی ہے، اس اعلان سے ملک بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے اور ہر طبقہ کے افراد نے اس کا خیر مقدم کیا ہے۔ قیام پاکستان سے لے کر آج تک ملک کے ہر طبقے کی طرف سے بارہا یہ آواز بلند ہوئی ہے، چونکہ پاکستان، اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اور اسلامی تعلیمات کے مطابق سودی کاروبار معاشرہ کی ایک بہت بڑی لعنت ہے، قرآن کریم اور احادیث میں اس نظام کو اپنانے والوں کے لئے انتہائی سخت الفاظ استعمال کئے گئے ہیں بلکہ قرآن مجید میں تو اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ:

"یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ. فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ." (البقرہ: ۲۷۸، ۲۷۹)

ترجمہ: "اے ایمان والو، اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور چھوڑ دو جو کچھ باقی رہ گیا ہے سود، اگر تم کو یقین ہے اللہ کے فرمانے کا پھر اگر نہیں چھوڑتے تو تیار ہو جاؤ لڑنے کو اللہ سے اور اس کے رسول سے۔" (ترجمہ: شیخ الہندؒ)

یہی وجہ تھی کہ ملک کا ہر مسلمان اس بات کا خواہش مند تھا کہ پاکستان سودی نظام سے پاک ہوجائے، صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے جب اقتدار سنبھالا تو اس ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کا اعلان فرمایا۔ قوم کی طرف سے دوبارہ اس بات کا اعادہ کیا گیا کہ اسلامی نظام کی طرف پیش رفت میں یہ بات بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ بینکوں کا سودی نظام جو اسلام کے سراسر خلاف ہے، اس کا بالکل خاتمہ کیا جائے، اس مطالبہ کے پیش نظر صدر پاکستان نے یہ وعدہ فرمایا کہ وہ اس نظام کو ختم کرکے اس کا متبادل غیر سودی نظام بہت جلد نافذ کریں گے اور اسی لئے انہوں نے اسلامی نظریاتی کونسل کو یہ کام سپرد کردیا کہ تمام امور میں سودی نظام کے خاتمہ کے مسئلہ کو اولیت دی جائے، اسلامی نظریاتی کونسل کے اراکین نے اس سلسلہ میں قابل قدر کوششیں کیں اور ایک الگ پینل ترتیب دیا جس میں اقتصادی امور کے ماہرین کو بھی شامل کیا گیا، اور بالآخر ان کی کوششوں سے ایک رپورٹ مرتب کی گئی جس میں ایک ایسے نظام کی تشکیل کی دعوت دی گئی جو سودی لعنت سے پاک تھا، اس رپورٹ کے پیش نظر، علماء کرام اور ملک کے ہر طبقہ کو اعتماد اور یقین تھا کہ اب جو اعلان اس سلسلہ میں ہوگا اس میں کوئی گڑبڑ یا خرابی نہیں ہوگی، یہی وجہ ہے کہ جب اس نظام کا اعلان کیا گیا اور ملک میں غیر سودی کاؤنٹر کھولے گئے تو تمام لوگوں نے اس کا خیر مقدم کیا اور علماء کرام نے بھی لوگوں کو اس کی ترغیب دی مگر اس نظام کے اجراء کے کچھ عرصے بعد ہی لوگوں کی طرف سے اس بارے میں شکوک وشبہات کا اظہار ہونے لگا اور یہ شکوک وشبہات اس وقت یقین کی منزل میں پہنچ گئے جب اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی طرف سے ایک اعلانیہ جاری ہوا جس میں وضاحت کی گئی کہ بلا سودی بینکاری کے کھاتے مارک اپ میں منتقل کردیئے گئے۔

اس اعلان کے بعد اہل علم طبقہ خصوصی طور پر اس اسکیم کا مخالف ہوگیا اور لوگ اس اسکیم کو بھی دوسری سابقہ اسکیموں کی طرح دھوکہ اور فراڈ محسوس کرتے ہیں، اور علماء کرام کے پاس اب بلا سودی بینکاری کے متعلق سوالات کی پھر کثرت ہوگئی ہے لیکن چونکہ علماء کرام اس اسکیم سے پوری طرح واقفیت نہیں رکھتے تھے، اور ظاہری طور پر وہ اس کو بلا سودی نظام سمجھتے تھے، مگر جب سوالات میں شکوک کی کثرت ہوگئی تو ان کی طرف سے جواب میں بھی محتاط رویہ اپنایا جانے لگا اور آخر کار وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہم اس اسکیم کے جواز کا فتویٰ نہیں دے سکتے، یہ صورت حال عام لوگوں کے لئے مزید پریشان کن تھی لیکن اس کش مکش کو اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک رکن، مولانا محمد تقی عثمانی نے ایک مضمون لکھ کر کافی حد تک ختم کردیا اور اس وضاحتی بیان میں صاف الفاظ میں یہ فرما دیا کہ جو رپورٹ اسلامی نظریاتی کونسل نے مرتب کی تھی اس میں اور موجودہ رائج الوقت نظام میں کوئی مماثلت نہیں، اور موجودہ رائج نظام، خالص سودی نظام ہے اور اس کو غیر سودی نظام کہنا کسی طرح بھی صحیح نہیں، اس مضمون نے علماء کرام کو موجودہ حکومت کے بارے میں کافی شکوک میں مبتلا کردیا ہے کہ آخر وہ کون سے عناصر ہیں جو اس پورے نظام کو خراب کرنے کے درپے ہیں، اور آخر وہ کون سا طبقہ ہے جو حکومت پر اس طرح حاوی ہے کہ جو تجویز بھی اسلامی نظام نافذ کرنے کے لئے، اسلامی نظریاتی کونسل پیش کرتی ہے، وہ اس میں اس طرح کی تحریف کرتا ہے کہ وہ تجویز ہی غیر اسلامی بن جاتی ہے، ہم صرف یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اس قسم کی تحریف کا سلسلہ آخر کب تک جاری رہے گا؟ اور اس کا آخر نتیجہ کیا نکلے گا؟ کیا اس تحریف سے ہم اپنے آپ پر خدا تعالیٰ کا عذاب تو مسلط نہیں کررہے ہیں؟ اب تک ملک میں جو غیر سودی نظام رائج تھا، اس میں کم ازکم ہر شخص اپنے ضمیر اور دل میں تو

گناہ کا ایک احساس محسوس کرتا تھا، اور اس نظام کو غیر اسلامی تصور کرتا تھا، مگر اس نظام کے بارے میں تو اب تک خالص اسلامی ہونے کا نعرہ لگایا جا رہا ہے اور لوگ بھی اس میں نیکی اور برکت ہی کے لئے شامل اور شریک ہو رہے ہیں۔

آخر قوم کے ساتھ اس طرح کا مذاق کب تک ہوتا رہے گا؟ اور کب تک قوم کو اسلام کے نام پر دھوکہ میں مبتلا رکھا جائے گا؟ زکوٰۃ کے مسئلہ پر بھی بعینہٖ یہی ہوا، اسلامی نظریاتی کونسل کی تیار کردہ رپورٹ میں تحریف کی گئی، نتیجہ یہ نکلا کہ علمائے کرام کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، اب غیر سودی نظام میں بھی اس تحریف کو اپنایا گیا، یہ انداز نہ ملک کے لئے بہتر ہے اور نہ ہی اسلام کے لئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ آئندہ لوگ اسلام کا نام لینا ہی چھوڑ دیں، اگر ایسا ہوا تو نہ ملک کے لئے مفید ہوگا اور نہ موجودہ حکومت ہی کے لئے، اس لئے ہماری حکومت سے مخلصانہ گزارش ہے کہ جو اسلامی قانون نافذ ہو سکتا ہو اور اس کی راہ میں بہت شدید رکاوٹیں محسوس ہوتی ہوں تو اس کو نافذ نہ کریں، لیکن کسی اسلامی قانون میں تحریف کرکے اسے غیر اسلامی انداز میں نافذ کر دینا خدا کے غضب کو دعوت دینا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو خدا کے غضب سے محفوظ رکھے۔

(افتتاحیہ صفحۂ اقرأ روزنامہ جنگ کراچی ۱۳؍مارچ ۱۹۸۱ء)

زکوٰۃ کا سرکاری مصرف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

ملک میں جو نظام زکوٰۃ نافذ ہے اس کے مالہ وما علیہ پر ''بینات'' میں پوری تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ زکوٰۃ کے مصارف کے سلسلے میں مزید بدعنوانیاں سامنے آئی ہیں، روزنامہ جنگ کراچی ۱۹؍اپریل کی خبر ہے کہ:

''مرکزی زکوٰۃ کونسل کے حالیہ اجلاس میں سانحہ اوجڑی کیمپ کے متاثرین کو فوری امداد کے لئے ایک کروڑ روپے کی خصوصی امداد کی منظوری دی گئی۔ اجلاس، کونسل کے چیئرمین اور سپریم کورٹ کے جج جناب جسٹس شفیع الرحمٰن کی صدارت میں ہوا۔ کونسل نے سال ۱۹۸۸ء کے لئے فاطمید فاؤنڈیشن کے لئے ساٹھ لاکھ روپے کی امداد کی بھی منظوری دی۔''

اور روزنامہ جسارت کراچی ۲۳؍اپریل کی اشاعت میں پروفیسر غفور احمد کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ:

"خود وفاقی یا صوبائی سطح پر زکوٰۃ کونسل نے دینی، قانونی اور اخلاقی حدود سے تجاوز کر کے زکوٰۃ کی رقم دوسرے اور سراسر غیر متعلقہ اداروں کو سونپنا شروع کر دی کہ جن پر زکوٰۃ خرچ ہی نہیں ہوسکتی اور جنہیں قطعی استحقاق نہیں، مثلاً آغا خان ہسپتال وغیرہ۔ حد یہ کہ چند ایسے ادارے جن کے بارے میں یہ بھی مشتبہ ہے کہ وہ قومی تعلیمی ادارے ہیں یا مشنری ادارے، ان کو بھی زکوٰۃ منتقل کی گئی۔"

علاوہ ازیں یہ شکایات بھی موصول ہوئی ہیں کہ تعلیمی اداروں میں طلبہ کو زکوٰۃ فنڈ سے وظائف جاری کئے جاتے ہیں اور مسلم و غیر مسلم کا امتیاز کئے بغیر طلبہ کو یہ وظائف دیئے جارہے ہیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ زکوٰۃ کا مصرف صرف مسلمان ہیں، غیر مسلم زکوٰۃ کا مصرف نہیں۔ اس لئے کروڑوں روپے کی زکوٰۃ جو غیر مسلموں کو دی جارہی ہے وہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی، اور ارباب مال کے ذمہ اس کا دوبارہ ادا کرنا ضروری ہے۔

(ماہنامہ بینات کراچی شوال ۱۴۰۸ھ)

سود سے متعلق
وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

گزشتہ دنوں وفاقی شرعی عدالت کا ایک اہم ترین فیصلہ سامنے آیا جس کے ذریعہ ملک کے ۲۲ قوانین کو کتاب و سنت کے منافی قرار دیتے ہوئے حکومت کو ہدایت کی گئی کہ ۳۰ر جون ۱۹۹۲ء تک ان قوانین میں اسلام کے مطابق اصلاح کی جائے، ورنہ بصورت دیگر یہ قوانین یکم جولائی ۱۹۹۲ء سے غیر مؤثر ہوں گے۔ وفاقی شرعی عدالت کا یہ فیصلہ واقعتاً ایک "تجدیدی کارنامہ" ہے، جس پر وفاقی عدالت کے چیف جسٹس جناب ڈاکٹر تنزیل الرحمن اور ان کے رفقا تحسین و تبریک کے مستحق ہیں۔ فیصلہ کا مکمل متن ابھی سامنے نہیں آیا، لیکن جو خلاصہ یا خاکہ اخبارات میں شائع ہوا ہے اپنی اہمیت کی بنا پر اس کا مستحق ہے کہ اسے "بینات" میں محفوظ کردیا جائے:

"اسلام آباد (نیوز ڈیسک) وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس جناب جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمن، جناب جسٹس ڈاکٹر علامہ فدا محمد خان اور جناب جسٹس عبید اللہ خان پر مشتمل فل بنچ نے جمعرات کے روز سود سے متعلق ۲۲ قانونی دفعات کو

قرآن و سنت کے خلاف اور کالعدم قرار دینے کا فیصلہ سنا دیا۔ وفاقی شرعی عدالت کے پریس ریلیز کے مطابق اس فیصلے کے ذریعہ ۱۱۹ شریعت درخواستوں اور تین، سوموٹو نوٹسوں کو نمٹایا گیا، عدالت نے ان دفعات کو ۳۰ر جون ۱۹۹۲ء تک اسلامی احکام کے مطابق بنانے کی ہدایت جاری کردی۔ بصورت دیگر یہ دفعات یکم جولائی ۱۹۹۲ء سے مؤثر نہیں رہیں گی، یہ دفعات حسب ذیل قوانین کی ہیں:

۱:......انٹرسٹ ایکٹ مجریہ ۱۸۳۹ء۔

۲:......گورنمنٹ سیونگ بینکس ۱۸۷۳ء۔

۳:......نیگوشی ایبل انسٹرومنٹس ایکٹ ۱۸۸۱ء (قانون دستاویزات قابل بیع وشرا مجریہ ۱۸۸۱ء)۔

۴:......لینڈ ایکوزیشن ایکٹ ۱۸۹۴ء۔

۵:......دی کوڈ آف سول پروسیجر ۱۹۰۸ء (مجموعہ ضابطہ دیوانی مجریہ ۱۹۰۸ء)،

۶:......کوآپریٹو سوسائٹی ایکٹ ۱۹۲۵ء۔

۷:......کوآپریٹو سوسائٹی رولز ۱۹۲۷ء۔

۸:......انشورنس ایکٹ ۱۹۳۸ء۔

۹:......اسٹیٹ بینک آف پاکستان ایکٹ ۱۹۵۶ء۔

۱۰:......ویسٹ پاکستان منی لینڈرز آرڈی نینس ۱۹۶۰ء۔

۱۱:......ویسٹ پاکستان منی لینڈرز رولز ۱۹۶۵ء۔

۱۲:......پنجاب منی لینڈرز آرڈی نینس ۱۹۶۰ء۔

۱۳:......سندھ منی لینڈرز آرڈی نینس ۱۹۶۰ء۔

۱۴:......صوبہ سرحد منی لینڈرز آرڈی نینس ۱۹۶۰ء۔

۱۵:......بلوچستان منی لینڈرز آرڈی نینس ۱۹۶۰ء۔

۱۶:......ایگریکلچرل ڈیولپمنٹ بینک آف پاکستان رولز ۱۹۶۱ء (زرعی ترقیاتی بینک پاکستان قواعد مجریہ ۱۹۶۱ء)۔

۱۷:......بینکنگ کمپنیز آرڈی نینس ۱۹۶۲ء۔

۱۸:......بینکنگ کمپنیز رولز ۱۹۶۳ء۔

۱۹:......بینکس (نیشنلائزیشن) پے منٹ آف کمپنسیشن رولز ۱۹۷۴ء۔

۲۰:......بینکنگ کمپنیز (ریکوری آف لونز) آرڈی نینس ۱۹۷۹ء۔

۲۱:......پاکستان انشورنس کارپوریشن ایمپلائز پراویڈنٹ فنڈ ریگولیشن ۱۹۵۴ء۔

۲۲:......جنرل فنانشل رولز آف دی سینٹرل گورنمنٹ مع ڈرائنگ اینڈ ڈیسرنگ آفیسر بک۔

شریعت درخواستوں کو نمٹانے کی غرض سے وفاقی شرعی عدالت نے ربا کی تعریف بینکوں کے نظام، افراطِ زر اور کرنسی کی قیمت میں کمی سے متعلق ایک سوالنامہ مرتب کیا اور اسے ملکی اور غیر ملکی ممتاز علمائے کرام، اہل علم، ماہرین معاشیات اور بینکاروں کو بھیجا گیا تاکہ ان سوالات کے بارے میں ان کی آرا معلوم کی جاسکیں۔ عدالت کی جانب سے کی جانے والی درخواستوں پر متعدد اہل علم ماہرین معاشیات بینکاروں اور علمائے نے عدالت کے

سامنے اپنے دلائل پیش کیے۔

عدالت نے تمام پہلوؤں اور فاضل وکیل کی جانب سے اٹھائے جانے والے نکات کا قرآن وسنت کی روشنی میں جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ بینک کا سود ربا کے دائرے میں آتا ہے اور ربا اپنی تمام صورتوں میں قطعاً حرام ہے۔ خواہ قرض پیداواری مقصد کے لئے لیا گیا ہو یا کسی اور مقصد کے لئے، قرآن کریم اور سنت کی تصریحات کے علاوہ مدت کے بالمقابل قرض میں منافع کے ربا ہونے پر تمام امت کا اجماع ہے، اسلامی فقہ اکیڈمی جو اسلامی ممالک کی تنظیم (او آئی سی) کے تحت ۱۹۸۳ء میں قائم ہوئی، اس نے ۱۹۸۵ء میں جدہ میں منعقد ہونے والے اپنے دوسرے اجلاس میں جس میں تمام ممبر ممالک کی نمائندگی موجود تھی، فیصلہ دیا کہ بینک کا سود ربا ہے جو قرآن کریم میں حرام قرار دیا گیا ہے، قرآن کریم کی آیات حرمت ربا کے بارے میں بالکل واضح اور قطعی ہیں اور ان میں سود مفرد اور سود مرکب کا کوئی فرق نہیں ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سود کے راستوں کو بند کرنے اور تبادلہ اشیا میں رونما ہونے والی ناہمواریوں کو ختم کرنے کے بارے میں بہت فکر مند تھے، اس موضوع پر بہت سی احادیث موجود ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں اسلامی احکام کو بعینہٖ نافذ فرمایا۔ عدالت نے مشابہات کے اصل مفہوم کا جائزہ لیا اور وفاق اور صوبوں کی جانب سے پیش کی جانے والی اس دلیل پر غور کیا کہ ربا مشابہات کے دائرے میں داخل ہے اور عدالت اس نتیجے پر

پہنچی کہ یہ دلیل غلط اور غیر صحیح ہے، مسئلہ کی تطبیق جس کے بارے میں کہا گیا کہ نہضۃ العلماء کانفرنس مشرقی جاوا، انڈونیشیا نے اسے اختیار کیا ہے، قرآن وسنت میں موجود اسلامی احکام کے مطابق نہیں ہے۔ عدالت نے شریعت ایکٹ کے تحت قائم ہونے والے کمیشن کی ربا سے متعلق سفارشات کے انتظار کو مناسب خیال نہیں کیا کیونکہ یہ مسئلہ کافی عرصے سے حل طلب چلا آرہا ہے۔ اس لئے عدالت نے ان درخواستوں کا فیصلہ کرنا اپنا فریضہ محسوس کیا۔ عدالت کا فیصلہ جناب چیف جسٹس نے تحریر کیا اور تین سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ فیصلے میں فاضل وکیل برائے وفاقی حکومت اور دیگر مدعا علیہان کے دلائل اور ان کی جانب سے پیش کی جانے والی تحریری آرا کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے، اور صرفی اور تجارتی مقاصد کے لئے دیئے جانے والے قرضوں، انڈیکسیشن، افراط زر، کرنسی کی قیمت میں کمی اور مسئلہ سے متعلق دیگر پہلوؤں پر مفصل گفتگو کی گئی۔ نفع ونقصان کی شراکت کے بارے میں اسلامی احکام بالکل واضح ہیں، اور مضاربہ اور مشارکہ کے ضمن میں جو اصول بیان کئے گئے ہیں ان پر عمل کیا جانا چاہئے۔ فیصلے میں غیر سودی بینکاری سے متعلق تجاویز پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ معاملے کی اہمیت اور سود کے مسئلے کے بہت دور رس اثرات کے مدنظر عدالت نے ماہرین معاشیات اور ماہرین بینکاری سے مدد حاصل کی، اور مسئلے کا بڑی تفصیل سے اسلامی احکام کی روشنی میں جائزہ لیا۔"

(روزنامہ جنگ کراچی ۱۵ نومبر ۱۹۹۱ء)

اس ناگہانی فیصلے سے حکومت ''اگر گویم مشکل، وگر نہ گویم مشکل'' کی کشمکش میں مبتلا نظر آتی ہے۔ چنانچہ پہلے تو خزانہ کے وفاقی وزیر جناب سرتاج عزیز کا یہ بیان اخبارات میں شائع ہوا کہ حکومت اس فیصلہ کو سپریم کورٹ میں چیلنج کرے گی، ان کے بیان کا متن یہ تھا:

> ''اسلام آباد (نمائندہ خصوصی .... اے پی پی) وفاقی حکومت نے وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کو سپریم کورٹ میں چیلنج کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وفاقی شرعی عدالت نے سود سے متعلق ۲۲ قوانین کو قرآن و سنت کے منافی قرار دیا۔ حکومت، وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کرے گی۔ وزیر خزانہ سرتاج عزیز نے جمعہ کو اس ضمن میں اعلیٰ قانونی ماہرین سے صلاح مشورے کئے۔ وزیر خزانہ ایک دو روز میں اس بارے میں اٹارنی جنرل آف پاکستان سے ضروری صلاح مشورہ کریں گے، جس کے بعد ہفتے عشرے تک وفاقی حکومت کی جانب سے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی جائے گی۔ اعلیٰ ذرائع نے بتایا ہے کہ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کا اطلاق فوری طور پر نہیں ہوتا کیونکہ شرعی عدالت نے متعلقہ قوانین کی دفعات کو اسلامی احکام کے مطابق بنانے کے لئے چھ مہینے کی مہلت دی ہے۔ ذرائع نے کہا کہ قانون شریعت کی روشنی میں قائم کئے گئے اسلامی معیشت کے کمیشن کو بھی ہدایت کی گئی ہے کہ وہ متبادل نظام کی تیاری کے سلسلے میں اپنی سفارشات کو جلد سے جلد مرتب کرے، تاکہ معیشت کو جتنا جلد ممکن ہو اسلامی تقاضوں کے مطابق بنایا جاسکے۔ وفاقی وزیر خزانہ سرتاج

> عزیز نے کہا ہم وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کا احترام کرتے ہیں۔ تاہم یہ فیصلہ ایک اہم موضوع سے متعلق ہے اور حکومت اس فیصلے کے عملی عملدرآمد سے متعلق سپریم کورٹ کی رولنگ چاہے گی تاکہ قرآن و سنت کی دفعات کو پورا کیا جاسکے، اور ساتھ ساتھ جدید معیشت کی ضروریات بھی پوری ہوسکیں۔ وفاقی وزیر نے وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے حوالے سے کہا ہے کہ حکومت نے پہلے ہی متعدد اقدامات کئے ہیں اور بینکاری کے نظام کو اسلامی دفعات کے عین مطابق بنانے کے لئے ''لیزنگ، مضاربہ، مشارکہ اور مارک اپ'' جیسے اسلامی نظام بینکاری کی اقسام رائج کی گئی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ حکومت کو ابھی تک وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کا مکمل متن موصول نہیں ہوا۔ تاہم مکمل فیصلہ موصول ہونے کے بعد اس کا جائزہ لینے کے بعد اس کی مزید تشریح کے لئے حکومت اس فیصلے کو سپریم کورٹ میں چیلنج کرنے کا اپنا حق استعمال کرسکے گی۔''

(روزنامہ جنگ کراچی ۱۶؍نومبر ۱۹۹۱ء)

بعد میں یہ اعلان کیا گیا کہ حکومت یکم جولائی سے ان قوانین میں ترمیم کرے گی۔

> ''اسلام آباد (اے پی پی۔ ریڈیو، ٹی وی رپورٹ) وفاقی وزارت قانون و انصاف ان سودی قوانین میں ترمیم تجویز کرے گی جنہیں وفاقی شریعت عدالت نے اسلام کے منافی قرار دیا ہے، اور یہ ترامیم یکم جولائی ۱۹۹۲ء سے پہلے منظوری کے لئے پارلیمنٹ میں پیش کر دی جائیں گی۔ یہ فیصلہ پیر کو اسلام آباد

میں ایک اعلیٰ سطح کے اجلاس میں کیا گیا جس کی صدارت خزانے کے وفاقی وزیر سرتاج عزیز نے کی۔ اجلاس میں خزانے کے سیکریٹری جنرل، اسٹیٹ بینک کے گورنر، قانون و انصاف کی وزارت کے سیکریٹری نے بھی شرکت کی۔ وفاقی شریعت عدالت نے اس مہینے کی چودہ تاریخ کو اپنے ایک فیصلے میں بیس سودی قوانین کی بعض دفعات کو اسلام کے منافی قرار دیا تھا، ان میں سے نو کا تعلق صوبائی حکومتوں سے اور گیارہ کا تعلق وفاقی حکومت سے ہے، صوبائی حکومتوں کو ہدایت کردی ہے کہ وہ ان قوانین کو شریعت عدالت کے فیصلے کے مطابق بنانے کے لئے ضروری اقدامات کریں۔ وفاقی وزیر خزانہ سرتاج عزیز نے وفاقی وزرات قانون سے کہا ہے کہ وہ ان گیارہ قوانین میں جن کا تعلق وفاقی حکومت سے ہے، جتنا جلدی ممکن ہوسکے مناسب ترامیم تیار کریں۔ اعلیٰ سطح کے اجلاس میں وفاقی شریعت عدالت کے حالیہ فیصلے پر تفصیل سے غور کیا گیا اور اس پر عملدرآمد کا جائزہ لیا گیا، اس موقع پر اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے وفاقی وزیر خزانہ نے کہا کہ موجودہ حکومت قرآن وسنت کی بالادستی کا مکمل عزم کیے ہوئے ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ "سود" اسلام میں مکمل طور پر حرام ہے۔ بعد ازاں ایک جاری ہونے والے پریس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ وفاقی شریعت عدالت نے جن سودی قوانین کو اسلام کے منافی قرار دیا ہے، ان میں سے نو کا تعلق صوبائی حکومت سے ہے، ان قوانین میں:

۱:......لینڈ ایکوزیشن ایکٹ مجریہ ۱۸۹۴ء۔

۲:......کوآپریٹو سوسائٹیز ایکٹ ۱۹۲۵ء۔

۳:......کوآپریٹو سوسائٹیز رولز ۱۹۲۷ء۔

۴:......ویسٹ پاکستان منی لینڈرز آرڈی ننس ۱۹۶۰ء۔

۵:......ویسٹ پاکستان منی لینڈرز رولز ۱۹۶۵ء۔

۶:......پنجاب منی لینڈرز آرڈی ننس ۱۹۶۰ء۔

۷:......سندھ منی لینڈرز آرڈی ننس ۱۹۶۰ء۔

۸:......سرحد منی لینڈرز آرڈی ننس ۱۹۶۰ء۔

۹:......بلوچستان منی لینڈرز آرڈی ننس ۱۹۶۰ء شامل ہیں، جبکہ باقی گیارہ قوانین کا تفصیل کے ساتھ بین الوزارتی کمیٹی نے قانونی ماہرین سے مشورہ کیا۔ کمیٹی کی سفارشات کی بنیاد پر حکومت نے نو قوانین پر وفاقی شریعت عدالت کے احکامات پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا ہے وہ نو قوانین یہ ہیں:

۱:......انٹرسٹ ایکٹ مجریہ ۱۸۳۹ء۔

۲:......گورنمنٹ سیونگز بینکس ایکٹ ۱۸۷۳ء۔

۳:......کوڈ آف سول پروسیجر ۱۹۰۸ء۔

۴:......انشورنس ایکٹ ۱۹۳۸ء۔

۵:......اسٹیٹ بینک آف پاکستان ایکٹ ۱۹۵۶ء۔

۶:......زرعی ترقیاتی بینک آف پاکستان رولز ۱۹۶۱ء۔

۷:......بینکنگ کمپنیز آرڈی ننس ۱۹۶۲ء۔

۸:......بینکنگ کمپنیز رولز ۱۹۶۳ء۔

۹:......بینکس (نیشنلائزیشن) پے منٹ آف کمپنسیشن

رولز ۱۹۷۴ء۔

پریس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ وفاقی شریعت عدالت کے فیصلے میں دو قوانین نگوشی ایبل انسٹرومنٹس ایکٹ ۱۸۸۱ء اور بینکنگ کمپنیز (ریکوری آف لون) آرڈی نینس ۱۹۷۹ء کا جہاں تک تعلق ہے، ان پر بین الاقوامی اور ملکی دونوں سطحوں پر وسیع البنیاد عملدرآمد کی ضرورت ہے، اور اس پر اسٹیٹ بینک آف پاکستان اور پاکستان بینکنگ کونسل کے ساتھ تفصیل سے صلاح مشورے اور جائزہ لینے کی ضرورت ہے، بین الوزارتی کمیٹی سے کہا گیا ہے کہ وہ ان دونوں قوانین سے متعلق آئندہ تین ہفتے میں اپنی ایک اور رپورٹ پیش کریں۔ اپنے ابتدائی کلمات میں وفاقی وزیر خزانہ نے ۲۴ نومبر ۱۹۹۱ء کے اپنے ایک بیان کی وضاحت کی اور کہا کہ انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ حکومت، شریعت عدالت کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کرے گی، انہوں نے کہا کہ میں نے ایک صحافی کے استفسار پر کہا تھا کہ اگر ضروری ہوا تو حکومت بعض قوانین پر مزید وضاحت طلب کرنے یا موجودہ سودی قوانین کو اسلام کے مطابق بنانے کے لئے دی گئی متعینہ مدت میں توسیع کے لئے سپریم کورٹ سے رجوع کرنے کا حق استعمال کرسکتی ہے، اس سلسلے میں بعض اخبارات نے میرے بیان کو غلط طور پر پیش کیا اور بعض نے اسے صحیح طور پر پیش کیا۔ سرتاج عزیز نے کہا کہ موجودہ حکومت کو اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ''سود'' غیر اسلامی ہے۔ حکومت قرآن وسنت کی بالادستی کا مکمل عزم کئے ہوئے

ہے، لیکن بدقسمتی سے اب تک ''سود'' کی مسلم دنیا میں بین الاقوامی طور پر قابل قبول کوئی تشریح نہیں آسکی ہے۔ اسلامی بینکاری کی موجودہ مالی ترقی ۸۵،۱۹۸۴ء میں ہوئی جب اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے مالیات کی بارہ اقسام کو تجویز کیا، اور مالی طریقہ کار کے ایک مناسب حصے کو گزشتہ چند سالوں سے ان اقسام میں تبدیل کیا گیا۔ لیکن ابھی مزید تحقیق اور قانونی کاروائی کی ضرورت ہے تاکہ اس عمل کو مزید آگے بڑھایا جاسکے۔ پریس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ آئی جے آئی کی حکومت نے مئی ۱۹۹۱ء میں شریعت ایکٹ کی منظوری کے بعد معیشت کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے کے لئے ایک کمیشن تشکیل دیا ہے، جو کہ معیشت سے سود کے مکمل خاتمے کو یقینی بنانے کے لئے سفارشات تیار کرے گا، کمیشن نے پہلے ہی اپنے کام کا آغاز کردیا ہے اور وہ دوسرے اسلامی ممالک کے تجربات کا جائزہ لے رہا ہے۔ وزیر خزانہ نے کہا کہ مسلم دنیا میں پاکستان کے پاس تمام شعبوں میں ماہرین کی تعداد موجود ہے، جن میں اسلامی اسکالرز، قانونی اور فنانشل مینجمنٹ کے ماہرین۔ انہوں نے کہا کہ کوئی وجہ نہیں کہ مسئلے کی پیچیدگی کے باوجود پاکستان ایک قابل قبول مدت میں ایک ایسا نظام جو کہ اسلام کی تعلیمات کے عین مطابق ہو اور جو جدید مالی اور اقتصادی نظام کی ضروریات کو بھی پورا کرتا ہو، کی تشکیل سے عہدہ برآ نہ ہوسکے۔''

(روزنامہ جنگ کراچی ۲۶ نومبر ۱۹۹۱ء)

ہمیں احساس ہے کہ وفاقی حکومت کے راستہ میں بہت سی مشکلات ہیں،

معیشت کو غیر سودی خطوط پر استوار کرنا خاصا مشکل کام ہے، لیکن وزیر خزانہ کا یہ کہنا کہ بد قسمتی سے اب تک ''سود'' کی مسلم دنیا میں بین الاقوامی طور پر کوئی قابل قبول تشریح نہیں آسکی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وفاقی وزیر خزانہ کا ذہن ''سود'' کے مسئلہ میں صاف نہیں وہ ان قوانین کی جگہ، جن میں وفاقی شرعی عدالت نے تنقید کی ہے، کتاب و سنت کے مطابق صحیح اسلامی قوانین کے نافذ کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ اس امر کا قوی اندیشہ ہے کہ وہ نئے قوانین جو پارلیمان میں لانا چاہتے ہیں ان میں شکل بدل کر ''سود'' کو حلال کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ حضراتِ اہل علم اور ماہرین معاشیات ''سود'' کے خاتمہ کے لئے جو جامع منصوبہ تشکیل دے چکے ہیں اسے نہایت ہمت و استقلال اور ایمانی قوت کے ساتھ نافذ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا محمد النبی الامی
وعلی آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین الی یوم الدین

(ماہنامہ بینات کراچی جمادی الاخریٰ ۱۴۱۲ھ)